بلیک واٹر
BLACKWATER
طارق اسمٰعیل ساگر

ترتیب

	پیش لفظ	7
1	بلیک واٹر سے زی XE تک	9
2	بلیک واٹر پشاور میں	12
3	بلیک واٹر تربیتی کیمپ اور کیپٹن زیدی	18
4	بلیک واٹر کہاں سے آئی؟	24
5	حکومت انکار کرتی ہے	27
6	بلیک واٹر عراق سے پاکستان تک	30
7	اندر کی کہانی	32
8	امریکہ پھنس چکا ہے	37
9	امریکہ افغانستان کی جنگ ہار رہا ہے	40
10	شیطانی جال	45
11	سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی (CIA)	54
12	آئی ایس آئی بمقابلہ سی آئی اے	67
13	کھوٹہ اور سی آئی اے	73
14	سفارت کاری کی آڑ میں	80

15	سی آئی اے کی پاکستان میں مداخلت	88
16	سی آئی اے کی بھارتی پشت پناہی	95
17	گھناؤنے کھیل کا آغاز	99
18	چارلی ولسن پُراصرار کردار	103
19	ٹکراؤ	109
20	سازش کے خاموش کردار	115
21	دہشت گرد کون؟	120
22	امریکن کیا چاہتے ہیں؟	124
23	بلیک واٹر کی آمد	128
24	بے نظیر کو کس نے شہید کیا؟	134
25	پراجیکٹ 2025ء	138
26	آستین کے سانپ	148
27	سوات اور وزیرستان اور ''را''	157
28	پاکستان کی صف بندی	179
29	آبی جارحیت اور ایٹمی بلیک میلنگ	189
30	بلوچستان خفیہ ایجنسیوں کا گھناؤنا کھیل	197
31	آئی ایف آئی	236
32	ٹارگٹ پاکستان ہے	245
33	غیر ملکی دہشت گرد	248
34	وزیرستان میں غیر ملکیوں کی آمد	256
35	امریکی مداخلت اور ایف بی آئی	271
36	دہشت گرد ایجنسیوں کی مداخلت	275
37	ڈرون حملے	280
38	کتابیات اور حوالہ جات	283

O

پیش لفظ

ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران ڈائجسٹ
0301-7283296
آئیڈیل پبلک لائبریری
گلی مٹھو ہوٹل نزد گھنٹہ گھر کمالیہ بیگم احمد طارق اینڈ برادرز

''بلیک واٹر'' نے عراق کے بعد پاکستان کا رخ کیا تو پاکستان کے آزاد اور بیدار معزز صحافیوں نے حکومت کی پراسرار خاموشی کو توڑتے ہوئے نعرہ حق بلند کیا اور بلیک واٹر کی گھناؤنی کارروائیوں سے پاکستانیوں کو آگاہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ جن صحافیوں نے یہ نعرہ مستانہ بلند کیا۔ ان میں نمایاں نام طارق اسماعیل ساگر کا ہے جو اپنی جرأت مندی کے لئے پاکستان اور بیرون ملک ایک خصوصی مقام رکھتے ہیں۔ ان کی خصوصاً ساؤتھ ایشیا کے حوالے سے لکھی تحریروں کو سند سمجھا جاتا ہے۔ ساؤتھ ایشیاء میں بھارتی بالادستی کے لئے سرگرم بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی RAW اور اُس کے پُشت پناہی کرنے والی ایجنسیوں کے حوالے سے اُن کی تحریروں کو خصوصی توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔

فاضل مصنف نے اس انتہائی اہم کتاب میں نہ صرف بلیک واٹر بلکہ سوات، فاٹا اور بلوچستان میں غیر ملکی مداخلت کیوں، کب، کیسے شروع ہوئی؟ اس خطے میں امریکہ، اسرائیل، بھارت کے مفادات اور عزائم کیا ہیں؟ ''را، موساد، سی آئی اے'' اور دیگر انٹیلی جنس ادارے یہاں کیا کر رہے ہیں؟ ان کے ٹارگٹس کیا ہیں؟ پاکستانی بیوروکریسی میں ان پاکستان دشمن طاقتوں کے لئے سافٹ

کارنر رکھنے والوں کے بھیانک عزائم کیا ہیں؟ ''سی آئی اے'' اور ''را'' نے قیام پاکستان کے بعد سے آج تک الگ الگ اور مشترکہ پاکستان کے خلاف کون کون سے آپریشن کئے اور اب تک کر رہے ہیں؟ پاکستان کو دولخت کرنے سے موجودہ صورتِ حال تک پہنچانے میں سی آئی اے، را، موساد اور دیگر پاکستان دشمن انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کیا کردار رہا ہے؟ مذہبی شدت پسندی کے جذبات کو کیسے، کب، کس نے اور کیوں ہوا دی؟ پاکستان کے انتہائی محبِ وطن اور اسلام کے شیدائی عوام کو غیر ملکی ایجنسیوں کی معاونت سے بہکانے، بھڑکانے اور حکومت سے ٹکرانے کے بعد اپنا لوسیدھا کرنے والے مذہبی راسپوٹین کون ہیں؟ پاکستان کو دہشت گردی کی آگ کا ایندھن بنانے والوں کی اصلیت کیا ہے؟ اور ملکی و غیر ملکی شخصیات، ادارے، ایجنسیاں، میڈیا آخر ''آئی ایس آئی'' پر ہی کیوں بار بار حملہ آور ہوتے ہیں۔ ممتاز مصنف صحافی بین الاقوامی اور ملکی امور پر اتھارٹی سمجھے جانے والے ''طارق اسماعیل ساگر'' نے اپنی مایہ ناز تصنیف میں ان سوالات کے جوابات دیئے ہیں جو ساری قوم کی آنکھیں کھول دیں گے۔

بلیک واٹر سے زی XE تک

پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن شاہ
آکسفورڈ یونیورسٹی (برطانیہ)

یہ اسلام آباد کی ایک مصروف شاہراہ ہے' جس پر معمول کے مطابق دفتری اوقات کار کے مصروف لمحات میں ٹریفک کی رفتار بہت سست پڑ گئی ہے' جس کی وجہ گاڑیوں کی وہ لمبی قطاریں ہیں جنہیں روزانہ سکیورٹی کے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں ویسے ہی ہر ڈرائیور ٹینشن کا شکار ہوتا ہے' ٹریفک کی لمبی لمبی قطاریں الگ مسائل پیدا کرتی ہیں۔ یہی منظر یہاں بھی دکھائی دے رہا ہے۔ ایک نوجوان اپنی کار میں ٹریفک اشارہ کھلنے کا منتظر ہے کہ سگنل گرین ہونے پر آگے بڑھے جبکہ اس کے پیچھے لمبی قطار حدِ نگاہ تک دکھائی دے رہی ہے۔

لیکن۔۔۔۔ اچانک ایک سیاہ شیشوں والی بڑی گاڑی اس کے پیچھے لگی قطار کو قریباً روندتے ہوئے ٹریفک اصولوں کی دھجیاں بکھیرتے اس کے پیچھے آ کر رکتی ہے اور گاڑی کا ڈرائیور مسلسل ہارن بجانے لگتا ہے' نوجوان کیلئے یہ بڑی پریشان کن صورتحال ہے کہ سگنل ابھی تک ریڈ RED ہے اور یہ شخص اسے چلنے کیلئے کہہ رہا ہے' اسے راستہ چاہئے' جس کیلئے نوجوان کو ٹریفک سگنل توڑنا پڑے گا جو اس کو گوارہ نہیں جب نوجوان مسلسل ہارن بجانے پر بھی پیچھے نہیں ہٹتا تو اس گاڑی میں سے ایک امریکی جس نے کالے شیشوں کی عینک چڑھا رکھی ہے' ہاتھ میں جدید ترین آٹومیٹک گن لئے نوجوان کے نزدیک آتا ہے' اپنی گن سے اس کے دروازے کا شیشہ کھٹکھٹا کر اسے پرے ہٹنے کا دھمکی آمیز اشارہ کرتا ہے۔ نوجوان کا خون گرم ہے' وہ بھی اس بے ہودگی پر غصے میں آ کر اپنے ڈیش بورڈ سے پستول نکال کر اسے دکھاتا اور اپنی گود میں رکھ لیتا ہے۔

امریکی سور مافوراً واپس پلٹتا ہے' اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوبارہ آتا ہے' وہ سب مل کر نوجوان کو زبردستی باہر نکالتے ہیں اور اسے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد ہیں لیکن وہاں موجود غیرت مند پولیس آفیسر اور کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ معاملہ بڑھتا ہے' امریکی اپنی مخصوص زبان میں اسے ڈانٹتے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

یہ خوش قسمت نوجوان چونکہ برسر اقتدار پارٹی کے ایک سینیٹر کا بھانجا تھا' اس لئے اس کی

بچت ہوگئی ورنہ آئے روز ان امریکیوں کے ہاتھوں کسی نہ کسی پاکستانی کے پٹنے کی خبر بھی آتی رہتی ہے اور اب یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی۔

یہ امریکی ''بلیک واٹر فورس'' کے مادر پدر آزاد کرائے کے سپاہی ہیں جو عراق کے بعد اب پاکستان میں گھس آئے ہیں۔ بلیک واٹر جواب ''زی'' (XE) کہلاتی ہے۔ امریکی فوج کے بدمعاش' بھگوڑے' سزایافتہ فوجیوں کا ایک مادر پدر آزاد گروہ ہے جسے امریکی حکومت دنیا کے کئی ممالک میں اپنے سفارتکاروں اور دیگر سرگرمیوں میں مصروف شہریوں کی حفاظت کیلئے بظاہر استعمال کرتی ہے' اس پرائیویٹ فورس کو سی آئی اے کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔

پرائیویٹ آرمی کے تصور سے قائم امریکی سکیورٹی ایجنسی بلیک واٹر جس کا نام اب تبدیل کر کے زی رکھ دیا گیا ہے' 2007ء میں قائم ہوئی اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی ملٹری تربیت گاہ ہے' ان کے پاس ایک لاکھ سے زیادہ سکیورٹی گارڈز ہیں جن کو یہ پرائیویٹ آرمی کا نام دیتے ہیں۔ اس کمپنی کے سربراہ ایرک پرنس اور ایل کلارک ہیں جو اس وقت کے امریکی صدر کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے' وہ مذہب کے لحاظ سے عیسائی ہیں اور دنیا میں کام کرنیوالے عیسائی مشنری اداروں کی مالی امداد کرتیر ہے ہیں۔ یہ کمپنی نائن الیون سے چند سال قبل قائم ہوئی' اس کے اہم عہدیداروں میں امریکی سی آئی اے کے ایک سابق سربراہ بھی شامل ہیں' اس پرائیویٹ کمپنی میں کام کرنے والے ایک گارڈ کی سالانہ تنخواہ چار لاکھ ڈالر سے زائد ہے جو اس امریکی جرنیل کی تنخواہ کے برابر ہے جس کی 26 سال سروس ہو یعنی اس کے ایک گارڈ کی تنخواہ امریکی ریگولر فوجی کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ ہے۔ بلیک واٹر کا ٹریننگ سنٹر امریکہ میں نارتھ کیرولائنا میں ساٹھ ہزار ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس ٹریننگ سنٹر میں دیگر سہولیات کے علاوہ ایک مصنوعی دریا بھی بنایا گیا ہے' اس کمپنی کے پاس بیس لڑاکا طیارے اور متعدد جنگی ہیلی کاپٹر بھی ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ کمپنی سالانہ ساٹھ ہزار فوجیوں کی تربیت کرتی ہے جن میں امریکہ کی مختلف ایجنسیوں اور فورسز سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ اسکے اپنے گارڈز بھی شامل ہیں۔ اس کمپنی کو زیادہ تر گورنمنٹ کنٹریکٹ ملتے ہیں۔ اس کے ریکارڈ کے مطابق اس کی نوے فیصد آمدن گورنمنٹ کنٹریکٹ سے حاصل ہوتی ہے۔ بلیک واٹر لامحدود اختیارات کی حامل کمپنی ہے۔ عراق میں تعینات اس کمپنی کے اہلکاروں پر عراقی قانون نافذ ہی نہیں' وہ جب اور جہاں چاہیں کسی کو ہلاک کر دیں یا کوئی اور غیر قانونی اقدامات کریں انہیں روکنے والا کوئی نہیں۔ 30 مئی 2007ء کو

اس کمپنی کے گارڈ نے ایک شخص کو صرف اس لئے گولی ماری کہ اس کی گاڑی امریکی حکام کے قافلے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ 16 دسمبر 2007ء میں اس کمپنی کے گارڈز نے بیس عراقیوں پر گولیاں چلائیں جن میں گیارہ افراد ہلاک ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد امریکی حکام نے ایک آرڈر پاس کیا تھا' جس کے تحت بلیک واٹر کے کسی بھی گارڈ پر عراقی قانون لاگو نہیں ہوتا اور وہ صرف امریکی حکام کو جوابدہ ہیں۔ یہ کمپنی عراق' افغانستان' جاپان' آذربائیجان اور دیگر ممالک میں کام کر رہی ہے۔ پاکستانی وزارت داخلہ ماضی میں چاروں صوبوں کو بلیک واٹر کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی ہدایت کر چکی ہے۔

O

بلیک واٹر پشاور میں

پشاور میں یونیورسٹی ٹاؤن کا علاقہ کسی زمانے میں انتہائی پرسکون اور پوش ایریا کہلاتا تھا۔ افغانستان کے جہاد کے دوران یہ علاقہ جہاں مسلم دنیا کے امدادی اداروں کا مرکز بنا وہیں یہاں یورپ' امریکہ' کینیڈا اور آسٹریلیا کی امدادی تنظیموں نے بھی اپنے پیر جمائے اور امداد کی آڑ میں یہاں ایک طرف عیسائیت کی تبلیغ کی جانے لگی تو دوسری جانب بڑی بڑی عالمی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکار بھی ان ہی تنظیموں کی آڑ میں پشاور سے افغانستان کے اندر تک جاتے تھے۔ افغان جہاد کے بعد یہ مغربی ''امدادی تنظیمیں'' یہاں سے چلی گئیں اور یہاں صرف مسلم ممالک خصوصاً عرب ممالک کی امدادی تنظیموں کے مراکز باقی رہ گئے جو افغانوں کی جنگ کے بعد بحالی کے کام میں مصروف تھیں۔ یہ زمانہ گزر گیا پھر اس کے بعد عالمی سطح پر ایک نئے فتنے نے سر اٹھایا۔ نائن الیون۔۔۔۔ یہ ایک ایسی فرد جرم تھی کہ جس کے خلاف امریکہ اور اس کے مغربی حواریوں کو کوئی کارروائی کرنا مقصود ہوتی' یہ فرد جرم اس پر لگا دی جاتی۔ افغانستان اور اسکے بعد عراق اس فرد جرم کی زد میں سب سے پہلے آئے۔

جن لوگوں نے نائن الیون کے بعد امریکہ کے ''طریقہ واردات'' کا تحمل اور گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے' وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عالمی استعماریت کیلئے نئی جنگ سے پہلے جنگ زدہ علاقے کے میڈیا کو ہر قیمت پر خریدنا اس جنگ کا اہم حصہ کہلاتا ہے تاکہ پراپیگنڈے کے زور پر دنیا کے سامنے حالات کی وہ تصویر لائی جائے جو امریکہ اور اس کے مغربی حواری دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی مقصد کے تحت افغانستان پر حملے سے پہلے امریکہ نے مسلمان ممالک کی ان امدادی تنظیموں کو صہیونی پراپیگنڈے کا نشانہ بنایا جو افغان مسلمانوں کی بحالی کے کاموں میں مصروف عمل تھیں' اس زہریلے پراپیگنڈے کے تحت مسلم ممالک کی ان رفاہی تنظیموں کو القاعدہ اور دیگر امریکہ مخالف تنظیموں کے ساتھ نتھی کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا جس کی بناء پر یہ تنظیمیں بدحواسی کے عالم میں پشاور سے اپنے اپنے ملکوں کو کوچ کر گئیں۔ اب میدان صاف تھا۔ افغانستان پر حملے سے پہلے

پرویز مشرف نے سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت امریکہ اور اسکے اتحادیوں کو وہ کھیل کھیلنے کا مقع فراہم کر دیا جس کی سزا قوم تا حال بھگت رہی ہے۔ ایک مغربی نیوز ایجنسی Deutsche Presse Agency (DPA) نے اپنی 27 جولائی کی اشاعت میں انکشاف کیا ہے کہ ''امریکہ کی بدنام زمانہ نجی سکیورٹی ایجنسی بلیک واٹر پاکستان کے اہم ترین شمال مغربی شہر پشاور میں موجود ہے اور پشاور کا علاقہ یونیورسٹی ٹاؤن اس کا مرکز ہے۔ سیاہ رنگ کی آرمڈ کاروں میں سوار سیاہ چشمے لگائے اور جدید رائفلیں پکڑے بلیک واٹر کے ارکان اس وقت عموماً دیکھنے میں آتے ہیں جب پشاور میں کہیں ٹریفک جام ہو جائے۔ آس پاس کے رہائشیوں کو بلیک واٹر کے کردار کے حوالے سے تحفظات ہیں کیونکہ یہ عراق میں اپنی بربریت' بچوں کیساتھ غیر فطری فعل اور اسلحے کی سمگلنگ میں ملوث ہونے کے حوالے سے خاصی مشہور ہے۔

رپورٹ میں ایک مقامی انجینئر امتیاز گل کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ بلیک والر کے ارکان کہیں بھی کسی گلی میں کھڑے ہو کر آس پاس سے گزرنے والے شہریوں کو ہراساں کرنیلگتے ہیں' بغیر کسی وجہ کے گن پوائنٹ پر لوگوں کے ہاتھ کھڑے کروا دیتے ہیں۔ امتیاز گل کا گھر چنار روڈ یونیورسٹی ٹاؤن میں امریکی کنٹریکٹرز کے اڈے سے چند سو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ امتیاز گل کا سوال تھا کہ ہماری شاہراہوں اور گلیوں پر کون حکومت کر رہا ہے۔۔۔۔ پاکستانی یا امریکی؟۔۔۔۔ انہوں نے (بلیک واٹر) حکومت کے اندر حکومت بنا رکھی ہے۔۔۔۔ یہاں کے مکینوں کو گلہ ہے کہ حکام بالا سے اس سلسلے میں بار بار شکایت کی گئی ہے لیکن اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔۔۔۔ بلیک واٹر کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ فاٹا میں کئی ملین ڈالر کی لاگت سے ''ترقیاتی کام'' کرنیوالی امریکی کمپنی Creative Associates International (CALL)Inc. کے ارکان کے تحفظ کیلئے لائی گئی تھی۔ سابقہ امریکی نیول آفیسر ایرک پرنس نے 1997ء میں اس تنظیم کی تاسیس کی تھی اور امریکی ری پبلکن پارٹی کے کئی ارکان اس تنظیم کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل بتائے جاتے ہیں۔ بلیک واٹر نے یورپی ممالک سے کئی ہزار ریٹائرڈ فوجیوں کو بھرتی کیا' اس کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں کرائے کے فوجی تیسری دنیا ے غریب ممالک سے بھی حاصل کئے گئے ہیں۔ امریکہ کی اسلام کے خلاف جنگ کے دوران بلیک واٹر نے امریکہ کی دیگر ایسی ہی کمپنیوں کی نسبت ملٹی ملین ڈالر کے ''ٹھیکے'' حاصل کئے ہیں۔ ستمبر 2007ء میں یہ بدنام زمانہ تنظیم اس وقت میڈیا کی نظروں میں آئی جب بغداد میں ایک امریکی سفارتی

قافلے کی حفاظت کے نام پر اس نے سترہ شہریوں کو بغیر کسی وجہ کے گولیوں سیاڑا دیا تھا۔ آج کل امریکی حکومت کی اس حمایت یافتہ کمپنی پر امریکی ریاست ورجینیا میں ان افراد کی جانب سے جو زخمی ہوئے یا جن کے رشتے دار مارے گئے' مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس ''کمپنی بہادر'' پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے الزامات کے علاوہ بچوں کیساتھ غیر فطری سلوک Child Prostitution اور اسلحے کی سمگلنگ کے الزامات بھی عائد کئے گئے ہیں۔ اس کی ان بدنام زمانہ کارروائیوں کی وجہ سے فروری 2009ء میں اسکا نام XE کے نام سے بدل دیا گیا اور چند ماہ بعد ایرک پرنس نے بطور چیف ایگزیکٹو اس کمپنی سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

Deutsche Presse Agentur (DPA) نے اپنی رپورٹ میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ بلیک واٹر نے پاکستان سے بھی بھرتیاں کی ہیں۔ اسکے علاوہ اس نے بعض پاکستانی آفیشل کے حوالے سے یہ خبر بھی دی ہے کہ بلیک واٹر مغربی امدادی کارکنان کو سکیورٹی مہیا کرنے کی آڑ میں کور آپریشن بھی کرتی ہے۔۔۔۔ جس میں قبائلی زعماء کی وفاداریاں خریدنا اور مبینہ القاعدہ اور طالبان کو مبینہ طور پر مہیا کی جانے والی رقوم کی ترسیل کو مقامی اور بین الاقوامی بینکوں میں چیک کرنا شامل ہے۔ ایسے تمام معاملات کسی بھی نجی سکیورٹی کمپنی کے مینڈیٹ سے باہر ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے Deutsche Presse Agentur (DPA) کا دعویٰ ہے کہ طالبان اور القاعدہ جو پاکستان کے اندر حکومتی تنصیبات کو نشانہ بناتے ہیں اور نیٹو کی ترسیل کے مقامات بھی ان کے ٹارگٹ پر ہیں' یقیناً بلیک واٹر پر بھی پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پشاور کے فائیو سٹار ہوٹل پرل کانٹی نینٹل پر 9 جون 2009ء کو ہونیوالے حملے کا بھی یہی مقصد تھا کیونکہ اطلاعات کے مطابق وہاں پر اس وقت بلیک واٹر کے کچھ ارکان قیام پذیر تھے۔ اس حملے میں مبینہ طور پر سولہ افراد ہلاک ہوئے تھے جن میں دو بلیک واٹر کے غیر ملکی ارکان کے ساتھ ساتھ اتنی ہی تعداد میں اس کمپنی کے مقامی افراد بھی شامل تھے۔ جبکہ دیگر گارڈ اس حملے میں زخمی ہوئے تھے۔ ہلاک شدگان اور زخمیوں کو تیزی کے ساتھ اس مقام سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ نہ تو حکومت پاکستان نے اور نہ ہی کسی غیر ملکی ادارے نے اس حملے میں نقصانات کی تفصیل بیان کی تھی۔

پشاور کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس قاضی جمیل نے بلیک واٹر ارکان کی ہلاکت کے حوالے سے ایک جرمن خبر رساں ادارے DPA کے سوال پر Absolutely No Comments کہہ دیا تھا جبکہ صوبائی حکومت کے ایک وزیر نے اس سوال کا جواب دیتے

ہوئے کہا تھا کہ انہیں امریکی گارڈز کی ہلاکت کی اطلاع ہے لیکن ان کی تعداد اور وہ کس کمپنی سے تعلق رکھتے تھے' کا علم نہیں۔ صوبائی حکومت اس قسم کے معاملات سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی' یہ امور وفاقی انٹیلی جنس ایجنسیوں س ے متعلق ہیں۔ اس صورتحال سے پشاور کے یونیورسٹی ٹاؤن کے علاقے کے مکین خاصے پریشان ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ طالبان کی جانب سے ان نجی غیر ملکی سکیورٹی اداروں کو مزید نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی ٹاؤن سوسائٹی کے کونسل ممبر اور تاجر احسان طورو نے خبر رساں ادارے کو جولائی کے پہلے ہفتے میں بتایا کہ ہم نے وفاقی وزیر داخلہ سے ایک خط کے ذریعے درخواست کی تھی کہ بلیک واٹر جیسی غیر ملکی سکیورٹی ایجنسی کو رہائشی علاقے سے دور رکھا جائے کیونکہ القاعدہ اور طالبان یقیناً ان کے پیچھے ہوں گے۔

سرحد میں آج کل اے این پی کی حکومت ہے جسے کہیں بھی حکومتی رٹ چیلنج ہونے کا سب سے زیادہ دکھ ہوتا ہے لیکن خود صوبائی دارالحکومت میں اس کی ناک تلے حکومت کی رٹ چیلنج ہوتی نظر آ رہی ہے مگر اے این پی کے میاں افتخار حسین کی دور کی نسبت قریب کی نظر شاہد زیادہ کمزور ہے۔۔۔۔

اسلام اور پاکستان دشمن قوتیں پشاور والا کھیل تمام پاکستان میں کھیلنا چاہتی ہیں' اسی لئے پاکستانی طالبان کے نام سے جال بچھایا گیا تاکہ پاک فوج کو ان سے الجھا دیا جائے۔ طالبان سے منسوب مسلک کو دیگر مسالک کے علماء کے ذریعے جان بوجھ کر نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ وطن عزیز میں فرقہ وارانہ لہر کو فروغ دیا جائے۔ مسالک اور فرقوں سے بالاتر حضرت مولانا سرفراز نعیمی شہیدؒ کو بھی اسی لئے نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد پشاور سے نظریں ہٹانے کیلئے جنوبی پنجاب میں طالبان کا شوشہ چھوڑا گیا۔ اس مغربی مہم میں بھی بڑے بڑے مقامی صاحبزادے سرگرداں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وطن عزیز پر چاروں طرف سے فتنوں نے یلغار کر دی ہے۔ منافع بخش ملکی ادارے تیزی کیساتھ تباہ کئے جا رہے ہیں۔ قوم کو بدترین مہنگائی اور توانائی کے بحران سے دوچار کرنا بھی عالمی صیہونیت کے ایجنڈے میں شامل ہے تاکہ عام پاکستانی بھی اس جانب توجہ نہ دے سکے کہ وطن عزیز میں ہو کیا رہا ہے۔ ایک ایشو پر پردہ ڈالنے کیلئے نیا ایشو کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس ایجنڈے کے مطابق کیا بدترین لوڈشیڈنگ امریکہ کی ''وار آن ٹیرر'' کا حصہ نہیں؟ ایجنڈے کے مطابق جس موسم میں جس چیز کی زیادہ ضرورت ہو اسے کم یاب کر دیا جائے' گرمی میں بجلی اور سردی میں گیس۔۔۔۔ ان حالات میں بھلا کسے خبر ہو گی کہ وطن عزیز میں۔۔۔

ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔۔۔۔اس سے پہلے کہ وطن عزیز پشاور کا ''یونیورسٹی ٹاؤن'' بن جائے' ارباب اختیار حالات کی سنگینی کا بغور جائزہ لیکر اس کا تدارک کریں۔

ہمارے محترم استاد مرزا عزیز مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان من وسلویٰ کی طرح اس خطے کے مسلمانوں پر اتارا گیا تھا اور ہم نے نصف صدی تک یہ من وسلویٰ کھایا مگر بنی اسرائیل کی طرح اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی کی ہے۔اس سے کیا گیا نفاذ اسلام کا وعدہ پس پشت ڈالا۔نظام اسلام کے نفاذ کو بھول کر جمہوریت اور ترقی کی وجوہات اور اس کی نئی نئی تاویلوں میں الجھ گئے تو پھر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔۔۔۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ نوے کی دہائی کے بعد دنیا جس قسم کے بحرانوں کا شکار کر دی گئی' اس میں پاکستان میں انتہائی ہوش مند اور محب وطن حکومتی مشینری کا قیام از حد ضروری تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت سے لیکر آج تک وطن عزیز ''کھلنڈروں'' کے ہتھے چڑھ گیا۔مشرف کا وجود اس بدقسمتی کی شکل کمال تھا جبکہ جمہوریت کے نام پر موجودہ سول آمریت کا ٹولہ صرف نواز نے یا نوازے جانے کے علاوہ کچھ کمال نہیں رکھتا تو ایسے وقت میں اس درویش کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دینے لگتی ہے جو فوجی اور سول آمریتوں سے بالاتر ہو کر قوم کی بداعمالیوں کو خون سے دھوڈالتا ہے۔۔۔۔

سرحد اسمبلی میں امریکی ادارے بلیک واٹر کی سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور اس حوالے سے پیش کی جانے والی متحدہ مجلس عمل کے ڈاکٹر اقبال دین فنا کی تحریک التواء متفقہ طور پر بحث کیلئے منظور کر لی گئی۔صوبائی حکومت کی جانب سے تحریک التواء کی پہلے تو مخالفت کی گئی' تاہم بعد میں ایوان نے اسے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔

صوبائی اسمبلی میں اراکین نے ملک بھر خصوصاً وفاقی دارالحکومت اسلام آباد' پشاور اور صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع میں بدنام زمانہ امریکی سکیورٹی ایجنسی بلیک واٹر (زی) کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے صوبے میں اس کی سرگرمیوں کی تحقیقات کیلئے کمیٹی تشکیل دینے کا مطالبہ کیا ہے۔بلیک واٹر کا ایشو ایم ایم اے کے رکن اسمبلی ڈاکٹر اقبال دین فنا نے تحریک التواء کے ذریعے اٹھایا' جس میں انہوں نے کہا کہ غیر ملکی سکیورٹی ایجنسی بلیک واٹر (زی) صوبائی دارالحکومت اور دیگر اضلاع میں زی کے نام سے سرگرم ہے' جس سے عوام میں شدید بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے جبکہ اس حوالے سے حکومت کی خاموشی سے عوام کے خدشات بڑھ

رہے ہیں۔انہوں نے کہا کہ بلیک واٹر نے اسلام آباد اور پشاور میں دفاتر قائم کرنے کے علاوہ چارسدہ کی تحصیل شبقدر میں بھی اراضی خرید لی ہے جبکہ پاکستان کیلئے مذکورہ سکیورٹی ایجنسی کے جس انچارج کو ملک بدر کیا گیا تھا' وہ غیر قانونی طور پر دوبارہ پاکستان میں موجود ہے۔ان کا کہنا تھا کہ اس ایجنسی کی سرگرمیاں کیا ہیں؟ کیا یہ حکومت کی اجازت سے آئی ہے؟ اس بارے میں ایوان کو وضاحت کی جائے اگر یہ واقعی صرف سکیورٹی ایجنسی ہے تو شہروں تک حد تک تو بات مانی جاسکتی ہے لیکن دور دراز اضلاع اور تحصیلوں میں اس کی کیا ضرورت ہے؟ لہٰذا حکومت بلیک واٹر کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے۔ڈاکٹر اقبال دین کی تقریر کے بعد تو جیسے ایوان میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا' ہر ممبر اس موضوع پر تقریر کرنا چاہتا تھا اور ان ممبران کا مطالبہ تھا کہ چونکہ یہ پورے صوبے کے عوام کی آواز ہے' اس لئے حکومت بھی اس پر بحث کیلئے اپوزیشن کیساتھ متفق ہو جائے۔تاہم صوبائی وزیر قانون ارشد عبداللہ نے ایوان کو بتایا کہ وزیراعظم نے وضاحت کی ہوئی ہے کہ بلیک واٹر نامی تنظیم پاکستان میں سرگرم عمل نہیں ہاں البتہ جہاں تک شبقدر میں اراضی کی بات ہے' اس کی نشاندہی کی جائے تو ضرور تحقیقات کرائی جائے گی۔خیال رہے بلیک واٹر تربیلا، اسلام آباد اور پشاور کے علاوہ ملک کے کئی اور علاقوں میں جگہ خرید رہے ہیں۔

قائد حزب اختلاف اکرم درانی نے نکتہ اٹھایا کہ اگرچہ حکومت بلیک واٹر کی سرگرمیوں کی تردید کر رہی ہے' تاہم قومی اسمبلی میں اس کیلئے تحقیقاتی کمیٹی بھی بنائی گئی ہے چونکہ یہ صوبے اور ملک کے مستقبل کا مسئلہ ہے' اس لئے صوبائی سطح پر بھی نا صرف ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی جائے بلکہ حکومت بھی اس پر بحث کی مخالفت ترک کر دے۔تاہم حکومت اسکے باوجود بھی اس وقت تک بحث سے گریزاں معلوم ہو رہی تھی' جب تک کہ اچانک صوبہ سرحد کے سینئر وزیر بشیر احمد بلور نے کھڑے ہو کر یہ نہیں کہا کہ حکومت کو بلیک واٹر کے معاملے پر بحث پر کوئی اعتراض نہیں' جس کے بعد سپیکر نے ایوان کی اجازت سے تحریک التواء کو بحث کیلئے منظور کر لیا۔

O

بلیک واٹر تربیتی کیمپ اور کیپٹن زیدی

کیا آزادی اور ملکی خودمختاری کو مستحکم رکھنے کے یہی اطوار ہیں جنہیں ہم نے اختیار کر رکھا ہے؟ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ روزمرہ زندگی کے معمولات جن پر ہم عمل پیرا ہیں' ہمیں آہستہ آہستہ تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ بے حسی' منافقت' دروغ گوئی' رشوت ستانی' بدعنوانی' لاقانونیت جیسی بیماریاں ہمیں گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ گزشتہ ماہ رمضان کو ہی دیکھ لیجئے لوگ سارا سارا دن گرمی اور کڑکتی دھوپ میں آٹے اور چینی کیلئے خوار ہوتے رہے۔ رسوا ہوئے دھکے کھاتے رہے۔ چینی تیار کرنے والے صنعتکاروں اور تاجر طبقہ نے ناجائز منافع خوری کے ریکارڈ توڑ دیئے۔ ویسے تو ہر سال عبادات کیلئے مختص فضیلت بھرے مہینے کو ہمارے ملک میں کمائی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ تاہم اس بار حد ہوگئی۔ مذہبی رواداری تو رہی ایک طرف' تجارت کے مروجہ اصولوں اور اخلاقیات کا بھی جنازہ نکال دیا گیا اور اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے ملکی حمیت و خودمختاری کو بھی گروی رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ لیکن جناب ملی غیرت کاروباری صنف یا قابل فروخت جنس کی مانند بازار میں نہیں پائی جاتی جسے جب اور جہاں سے چاہا خرید لیا یا حسب ضرورت فروخت کر دیا۔ اس کا تعلق ضمیر سے ہے' یہ جاگتا رہے تو طاقتور دشمن بھی قریب پھٹکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ (کیوبا کی مثال سامنے ہے) اور اگر یہ اونگھنے لگے تو مغلوں کی سلطنت کی طرح شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے صرف تین سو فوجی پانچ لاکھ کے لشکر جرار کو آگے لگا لیتے ہیں' یہاں 174 برس قبل دو فروری 1835ء کو Lord Macaulay کے برطانوی پارلیمنٹ سے خطاب کا ذکر کروں گا' جس میں اس نے انڈیا کے مسلمان حکمرانوں اور اسلامی اقدار و روایات سے جڑے عوام کو غلامی سے دوچار کرنے کا طریقہ کار وضع کیا۔

اس نے کہا کہ میں نے انڈیا (آج کا پاک و ہند) کے طول و عرض میں سفر کے دوران کسی ایک فرد کو بھی بھیک مانگتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی چور نظر آیا۔ یہ ملک انتہائی دولت مند اعلیٰ اخلاقی قدروں کا امین اور یہاں بسنے والے بہت ہی باصلاحیت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس ملک کو

ہم (برطانوی) اس وقت تک فتح نہیں کر سکتے جب تک یہاں کی روحانی و معاشرتی اقدار کو نہ توڑا جائے جو اس ملک اور یہاں بسنے والوں کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ ہمیں اس کیلئے یہاں کا معاشرتی ڈھانچہ اور تعلیمی نظام تبدیل کرنا ہوگا جیسے ہی یہاں کے باسیوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ انگریزی تہذیب و زبان ان کے نظام حیات سے بہتر ہے تو وہ از خود اپنی مقامی روایات و انا پرستی سے دستبردار ہوتے چلے جائیں گیا ور غلام قوم کی طرح وہی کریں گے جیسا ہم چاہیں گے۔

پھر یہی ہوا' غلامی برصغیر کا مقدر بن گئی۔ بعدازاں آزادی کیلئے کتنی جدوجہد کرنی پڑی' کتنی جانیں گئیں' کتنی عصمتیں برباد ہوئیں' یہ سب ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ (جنہیں ہم نے فراموش کر دیا ہے) جبکہ بہت سی قومیں ان سے کہیں زیادہ قربانیوں کے باوجود آزادی کی نعمت سے محروم رہیں۔ شاید ہمارے آباؤ اجداد و بزرگوں میں سماجی انصاف اور اخلاقیات کی رمق باقی تھی۔ دوسرا ان کی رہنمائی حضرت قائداعظم جیسے بااصول اور بلند کردار کے حامل لیڈر کر رہے تھے جنہوں نے اپنی قوم کو منزل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اللہ نہ کرے ارض پاک پر جس طرح نئے انگریز سامراج (امریکی XE) کے سائے منڈلا رہے ہیں اگر کوئی مشکل وقت آیا تو کیا اپنے موجودہ قومی کردار کے ساتھ ہم آزادی کا تحفظ کر پائیں گے؟ یہی وہ سوال ہے جو بلیک واٹر (XE) کی سرگرمیوں کا ذکر آتے ہی بہت سے پاکستانیوں کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ آثار کرائے کی قاتل تنظیم کی پاکستان میں موجودگی کی گواہی دیتے ہیں' حکومت کہتی ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔

روس کے ٹیلی ویژن چینل RTT نے حال ہی میں امریکہ کی نجی کمپنی بلیک واٹر کی پاکستان میں موجودگی کے حوالے سے (تصاویر بطور ثبوت موجود ہیں) Increase Of U.S Security Firms In Pakistan کے عنوان سے طویل دورانئے کا ایک پروگرام نشر کیا ہے۔ جس میں انکشاف کیا گیا ہے کہ بلیک واٹر (XE) کی پانچ سو بکتر بند (ٹائر) APC (WHEELS) گاڑیاں کراچی کی بندرگاہ پر اتاری گئی ہیں جنکی وہاں سے بتدریج منتقلی کا عمل خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔ اگر تکنیکی اعتبار سے دیکھا جائے تو انفنٹری کی ایک یونٹ کے پاس ساٹھ سے ستر بکتر بند گاڑیاں ہوتی ہیں۔ پانچ سو کی تعداد تو ایک ڈویژن کی استعداد سے بھی زیادہ ہے۔ ممکن ہے یہ گاڑیاں افغانستان کیلئے منگوائی گئی ہوں۔ (یاد رہے ان بکتر بند گاڑیوں کے نیچے ٹائر لگے ہوئے ہیں جنہیں شہر یا آبادی والے علاقے میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔)

اس صورت میں بھی یہ خطے میں بڑھتے ہوئے امریکی عزائم کی نشاندہی کرتی ہیں' جس

کے بعد انسان سوچنے پر مجبور ہو جتا ہے کہ امریکہ افغانستان کو اپنی کثیر المقاصد فوج کے اڈے میں تبدیل کر کے خطے کو کسی بڑے تصادم یا حادثے کی طرف تو نہیں دھکیل رہا؟ تاہم چین کے بعد روس دوسرا ملک ہے جس نے پاکستان میں بلیک واٹر جیسی تنظیم کی سرگرمیوں کو قابل اعتراض سمجھتے ہوئے اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ (روس کی طرف سے سرکاری طور پر ابھی تک بلیک واٹر XE) کی پاکستان میں موجودگی پر کوئی بات نہیں کی گئی پھر بھی RTT چینل کے پروگرام کو روس کا سرکاری موقف ہی سمجھا جائے کیونکہ وہاں کا میڈیا سرکاری کنٹرول میں ہے۔ روسی ٹی وی نے پچیس اگست کی رات کو اسلام آباد کے سیکٹر F-7 سے پولیس کے ہاتھوں چار مسلح امریکیوں کی گرفتاری کا ذکر بھی کیا ہے جنہیں رات گئے جدید و خطرناک اسلحہ کے ساتھ مشکوک گاڑیوں میں گھومتے ہوئے پایا گیا تھا۔ انہیں امریکی سفارت خانے کی سکیورٹی کے انچارج کیپٹن ریٹائرڈ اعجاز نے فوری طور پر تھانے پہنچ کر پولیس سے رہائی دلائی۔ روسی چینل کا مؤقف ہے کہ گرفتار ہونے والے امریکیوں کا تعلق بلیک واٹر سے تھا جنہیں ڈاکٹر قدیر خان کو جان سے مارنے یا اغوا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی کیونکہ عدالتی حکم پر ڈاکٹر قدیر خان کے ساتھ پروٹوکول کے نام پر موجود سکیورٹی کو ہٹایا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ کراچی ڈیفنس کے علاقے خیابان راحت میں بلیک واٹر کے ٹھکانے اور پشاور میں چالیس کمروں پر مشتمل پشاور کی دو عمارتوں کا ذکر بھی روسی پروگرام میں موجود ہے۔ پشاور میں فائیو سٹار ہوٹل کی خریداری کے سلسلے میں امریکی سفارت خانے کے اقرار آپ پڑھ اور سن چکے ہوں گے۔

اسی طرح بیس ستمبر کو اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کو سکیورٹی فراہم کرنے والی پاکستانی فرم Inter Risk Security کے مالک پاک فوج کے سابق کمانڈو کیپٹن سید علی حیدر زیدی کے سیکٹر F-6/1 کی گلی نمبر 35 میں واقع گھر پر پولیس کا چھاپہ پوری دنیا کے میڈیا کیلئے انتہائی اہم خبر تھی جسے عالمی پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا نے بھرپور کوریج دی۔ برآمد ہونے والا تمام اسلحہ غیر لائسنس یافتہ تھا۔ خبر بریک ہونے پر امریکی سفارت خانے کی طرف سے بیان جاری کیا گیا کہ انہوں نے سفارت خانے کی حفاظت کی ذمہ داری کیپٹن زیدی کی سکیورٹی کمپنی کو سونپی تھی۔ اس کے گھر سے ملنے والے ناجائز اسلحہ سے امریکہ کا کوئی تعلق نہیں ہے' گو کہ اس طرح امریکیوں نے وقوعہ کو ناجائز اسلحہ کی برآمدگی کے معمولی سے مسئلے کے طور پر پیش کر کے اس کیس اتھ منسلک کہانیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش ضرور کی ہے' تاہم وہ کیپٹن زیدی کے ساتھ اپنے مراسم اور ان سے وابستہ مفادات کے بارے میں تا حال کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکے۔

سکیورٹی کمپنی کے علاوہ کیپٹن زیدی نے Care and Carrying کے نام سے روات میں تربیتی کیمپ بھی قائم کر رکھا ہے جہاں بلیک واٹر (XE) کے ٹیرینز (کرائے کے قاتل) کیپٹن زیدی کی اول الذکر کمپنی کے سکیورٹی گارڈز کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی تربیت فراہم کرتے ہیں۔ امریکی سفارت خانے کی خواہش پر اسلام آباد میں یورپی ممالک کے مختلف سفارت خانوں نے اپنی حفاظت کی ذمہ داری Inter Risk Security کو سونپ رکھی ہے۔ یہ سفارت خانے دو ہزار ڈالر (ایک لاکھ چھیاسیٹھ ہزار) ماہوار فی سکیورٹی گارڈز کیپٹن زیدی کو دیتے ہیں۔ ان میں سے ساٹھ ہزار روپے ہر ماہ فی گارڈ کے حساب سے کیپٹن زیدی اپنے گارڈز کو ادا کرتا ہے۔ یہ سلسلہ کب سے جاری ہے' اسکا علم نہیں۔ تاہم بعض اطلاعات کے مطابق دو سو گارڈز اپنی تربیت مکمل کر کے پشاور روانہ کئے جا چکے ہیں جنہیں بلیک واٹر (XE) سے تربیت حاصل کرنے والے تمام گارڈز سابقہ پاکستانی فوجی اور کمانڈوز ہیں جن کیا کثریت ایسے فوجیوں پر مشتمل ہے جنہیں فوج کا نظم وضبط توڑنے یا دیگر کسی جرم کی بدولت کورٹ مارشل کر کے فوج سے نکال دیا گیا تھا۔ South Asian News Agency (SANA) کے مطابق چند روز قبل پولیس اور سکیورٹی سے منسلک دیگر اداروں نے مشترکہ آپریشن کے دوران کیپٹن زیدی کو روات میں اسکے تربیتی کیمپ سے گرفتار کر لیا تھا جسے بعد ازاں امریکیوں اور بعض پاکستانی سیاستدانوں کے دباؤ پر رہا کر دیا گیا۔ (SANA) کے مطابق حکومت نے کیپٹن زیدی سے ان تمام افراد کے کوائف طلب کئے تھے جنہیں روات میں تربیت دی جا رہی تھی یا جو اپنی تربیت مکمل کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں حکومت ان افراد کے بارے میں بھی جاننا چاہتی تھی جنہوں نے کیپٹن زیدی کے ذریعے امریکیوں یا پاکستان میں بلیک واٹر (XE) کے منتظمین کے ساتھ رابطے استوار کئے تھے۔

یہاں کیپٹن زیدی کے ماضی کا مختصر ذکر کرتا چلوں۔ موصوف کا تعلق پاک فوج کے سپیشل سروسز گروپ (کمانڈوز) سے ہے۔ 1987ء میں کیپٹن زیدی سیاچن میں 26 ہزار فٹ بلند برفیلی چوٹی پر پاک فوج کی قائم کردہ OP Post قائد پوسٹ پر تعینات تھا۔ دنیا کے بلند ترین مقام پر پوسٹ قائم کرنے کیلئے پاک فوج کے درجنوں آفیسر و جوانوں نے خون کے نذرانے پیش کئے تھے جہاں سے نا صرف بھارتی فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا آسان تھا بلکہ ان کیلئے مزید پیش قدمی ناممکن بنا دی گئی تھی جیسے ہی دشمن کا کوئی سپاہی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا قائد پوسٹ پر موجود نشانہ باز اسے وہیں ڈھیر کر دیتے۔ ایک روز کیپٹن زیدی نے پیٹ میں مروڑ کا بہانہ

کیا اور پوسٹ چھوڑ کر نیچے بیس کیمپ میں چلا گیا۔ اسی دوران بھارتی فوج نے حملہ کر کے وہاں موجود پاک فوج کے جوانوں کو شہید کیا اور پوسٹ پر قبضہ کرلیا۔ (کیا یہ سب اتفاق تھا یا مربوط منصوبہ بندی کا نتیجہ اس گتھی کو کیپٹن زیدی یا بھارتی سلجھا سکتے ہیں) یہ پاکستان کیلئے بہت بڑا دھچکا تھا۔ کیپٹن زیدی کے میڈیکل چیک اپ میں وہ صحت مند ثابت ہوا۔ جس پر کورٹ مارشل کر کے اسے تو فوج سے فارغ کر دیا گیا' لیکن قائد پوسٹ ابھی تک بھارتی فوج کے قبضے میں ہے۔

معروف امریکی صحافی Jeremy Scahill نے انکشاف کیا ہے کہ القاعدہ کے لیڈروں پر حملوں کیلئے پاکستان وافغانستان کے خفیہ مقامات سے اڑنے والے ڈرون طیارے بلیک واٹر (XE) کی نگرانی میں پرواز کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں Hellfire Missiles اور پانچ سو پاؤنڈ وزنی Laser Guided بم بھی بلیک واٹر کے ماہرین ہی اسمبل کر کے ڈرون طیاروں پر فٹ کرتے ہیں۔ یہ بات امریکی صحافی نے اپنی کتاب Black Water World Wide میں بلیک واٹر پر لگائے گئے الزامات کے سلسلے میں امریکی کانگریس کی ڈیفنس کمیٹی کے روبرو وضاحت کرتے ہئے کہی۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہدف کا تعین بھی بلیک واٹر کے ذمہ ہے۔ تاہم امریکی حکومت کا کہنا ہے کہ ہدف کی تلاش اور تعین کا کام سی آئی اے کرتی ہے جبکہ بلیک واٹر کا کام ڈرون طیاروں کے مقام اڑان (ایئرپورٹ) اور وہاں موجود اسلحہ کی حفاظت کرنا ہے۔ Jeremy Scahill نے کمیٹی کے سامنے امریکی صدر اوباما پر الزام عائد کیا ہے کہ اس نے سات سو ملین ڈالر کی خطیر رقم اپنے صوابدیدی فنڈ سے بلیک واٹر کو فراہم کی ہے۔ معروف امریکی روزنامہ نیویارک ٹائمز کے 19 اگست 2009ء کے شمارے میں مارک مازنٹی نے بلیک واٹر کے ذریعے پاکستان اور افغانستان میں قتل وغارت گری کے ایک خفیہ معاہدے کی خبر جاری کی ہے۔ اس معاہدے کو The Top Cecret Programme To Locate And Assassinate Operatives Of Al Qaeda کا نام دیا گیا ہے۔ اس خبر پر حال ہی میں تعینات ہونے والے سی آئی اے کے ڈائریکٹر Leon Panetta نے اقرار کیا کہ سی آئی اے نے بلیک واٹر کی خدمات ضرور حاصل کی ہیں لیکن ایسا 2001ء میں امریکی صدر کی طرف سے جاری آرڈیننس کے تحت کیا گیا ہے جسے Finding کا نام دیا گیا تھا۔ بعدازاں کانگریس نے اسے قانون کی شکل دے دی۔ اس قانون کے مطابق سی آئی اے یا دیگر امریکی سکیورٹی کے ادارے دشمن کو تلاش کر کے مارنے کیلئے دنیا کے کسی ملک میں جاسکتے ہیں اور مقاصد کے حصول کیلئے کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتے

ہیں۔ اس منصوبے پر عملدرآمد کے تربیتی پروگرام کیلئے سی آئی اے اب تک کروڑوں ڈالر خرچ کر چکی ہے۔ امریکی اخبار کی مذکورہ خبر سی آئی اے کے ڈائریکٹر کا اقرار اور امریکہ میں عیدالفطر کے دوسرے روز ہلیری کلنٹن کے اس بیان پر غور کیجئے کہ القاعدہ کی قیادت پاکستان وافغانستان کے سرحدی علاقوں میں روپوش ہے تو اسکا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ امریکہ پاکستان میں عراق کی طرز پر اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کیلئے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ بلیک واٹر (XE) کی پاکستان میں موجودگی کو بعض مبصرین پاکستان کے ایٹمی دفاعی نظام کیلئے خطرہ قرار دے رہے ہیں۔ حکومت کہتی ہے کہ پاکستان میں بلیک واٹر کا کوئی وجود نہیں۔ امریکی سفیر فرماتی ہیں چند شرپسند پاکستانی صحافی بلیک واٹر کو ایشو بنا رہے ہیں پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ القاعدہ کے لیڈران صرف صوبہ سرحد یا قبائلی علاقوں میں ہی روپوش رہیں۔ کیا سی آئی اے انہیں ملک کے دیگر علاقوں میں دیکھے جانے کا جواز نہیں گھڑ سکتی؟ وہاں اپنے مخالفین کو عراق میں کارروائیوں کی طرح قتل نہیں کرا سکتی؟

امریکی سفیر بھلے شرپسند کہے یا ان کے ناپاک منصوبوں کی نشاندہی کرنے والے صحافیوں کو کسی بھی القاب سے نوازے' حقیقت یہی ہے کہ پاکستان میں XE یا بلیک واٹر کی موجودگی القاعدہ کے لیڈران کی تلاش کیلئے ہرگز نہیں ہے۔ ان کے درپردہ مقاصد کچھ اور ہیں۔ نیویارک کے نائن الیونڈرامے کے بعد امریکی صدر بش نے صلیبی جنگ کا ذکر بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ گزشتہ آٹھ برسوں کا مطالعہ کریں تو احساس ہوتا ہے کہ سچ مچ کی صلیبی جنگ سے جو امریکہ نے مسلم امہ کے خلاف برپا کر رکھی ہے۔ عراق وافغانستان تباہ کر دیئے گئے' اب ان کا نشانہ دیگر اسلامی ممالک ہیں۔ چند ہفتے قبل نیویارک میں مین ہٹن کے مڈوے پر استغفراللہ خانہ کعبہ سے مشابہ شراب خانے کی تعمیر سے کیا' اس بات کی نشاندہی نہیں ہوتی کہ القاعدہ و طالبان اور دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کی فلم پٹ جانے کے بعد امریکہ میں موجود بین المذاہب جنگ کے حامیوں نے نیا فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ کیا مسلم امہ اس ناپاک جسارت پر مشتعل نہیں ہوگی۔ کیا اسلامی ممالک میں احتجاج نہیں ہوگا؟ جسے ہنود و یہود اپنے زیرکنٹرول میڈیا کے ذریعے انتہاپسندی کا نام دے کر آگ کو مزید بھڑکائیں گے۔ اس کے ردعمل میں سرپھرے مسلمانوں نے کوئی کارروائی کر دی تو اسے دہشت گردی قرار دے کر اس کا تعلق پاکستان سے جوڑ دیا جائیگا جہاں بلیک واٹر کارروائی ڈالنے کیلئے پہلے ہی تیار بیٹھی ہے اور اگر اس پر احتجاج نہیں ہوتا تو پھر Lord Macaulay کو خراج تحسین پیش کرنا چاہئے جس نے مسلمانوں کو غلام بنانے یا بنائے رکھنے کا گر انگریزوں کو سکھا دیا ہے۔

بلیک واٹر کہاں سے آئی؟

1991-92ء میں سوویت یونین کی تحلیل کے بعد دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کے ناطے امریکہ کے عالمی کردار میں نمایاں فرق آ گیا ہے۔ امریکہ نے اب عالمی استعمار کا روپ دھار لیا ہے جو صرف اپنی بین الاقوامی سرحدوں کے اندر محدود رہنے کی بجائے پوری دنیا کو اپنے زیر تسلط لانے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ افغانستان اور عراق پر قبضہ اس کی اسی ہوس کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کردار کی وجہ سے دنیا بھر میں امریکہ کی موجودگی کے تناظر میں اس کی اپنی سلامتی کی ضروریات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک امریکی حکومت دوسرے ملکوں میں اپنے فوجی اور غیر فوجی اہلکاروں کی حفاظت کیلئے خود ہی ذمہ داریاں سرانجام دیتی تھی جس کی وجہ سے امریکی بہت بڑے پیمانے پر مقامی سرکشوں کے حملوں کا نشانہ بنتے تھے' عراق میں فلوجہ کے واقعات کے بعد جہاں حفاظتی فرائض پر مامور امریکیوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام ہوا تھا اور لاشیں کھمبوں سے لٹکائی گئی تھیں۔ امریکہ نے حفاظتی ذمہ داریوں کو فوج سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض کیلئے پرائیویٹ ٹھیکیداروں کی خدمات حاصل کی گئیں' چنانچہ اس سلسلے میں منظم طور پر فرائض کی بجا آوری کیلئے کنٹریکٹ حاصل کرنیکی غرض سے امریکہ میں نجی کمپنیوں کا وجود عمل میں آیا جنہیں محکمہ خارجہ نیر جسٹریشن کے بعد امریکی افواج کی ذیلی کمپنیوں کے طور پر دنیا بھر میں حفاظتی فرائض انجام دینے کیلئے لائسنس جاری کئے۔ بلیک واٹر بھی ایسی ہی ایک کمپنی ہے' ابتداء میں اس کمپنی کو عراق میں امریکی فوجیوں کی حفاظت کے فرائض سونپے گئے لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ پاکستان سمیت دنیا کے دوسرے ملکوں تک بھی پھیلتا گیا۔ پاکستان میں اس کمپنی کے اہلکار مبینہ طور پر کثیر تعداد میں تعینات ہیں اور ان کی تعداد اور سرگرمیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میریٹ ہوٹل اسلام آباد اور پی سی ہوٹل پشاور میں بم دھماکے بلیک واٹر کے اہلکاروں کو نشانہ بنانے کیلئے کئے گئے تھے۔ پی سی ہوٹل پشاور میں دھماکہ کے فوراً بعد وہاں سے غیر ملکیوں کی لاشوں اور زخمیوں کو نکال کر نامعلوم مقام پر منتقل کیا گیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں بیشتر مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے بلیک

واٹر کے اہلکار تھے۔

بدنام زمانہ امریکی تنظیم بلیک واٹر کا نام اگرچہ پاکستانی عوام کیلئے نیا نہیں لیکن گزشتہ چند ماہ کے دوران مبینہ طور پر اس تنظیم کی بڑھنے والی سرگرمیوں نے پاکستانی عوام کو بالعموم اور صوبہ سرحد کے باشندوں کو بالخصوص تشویش میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ یہ اطلاعات عام تھیں کہ اس تنظیم نے مختلف این جی اوز کا لبادہ اوڑھ کر صوبہ سرحد میں عسکریت پسندوں اور طالبائزیشن کے خلاف مہم کی آڑ میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ پشاور کے واحد فائیو سٹار ہوٹل سے متعلق بھی یہی سننے میں آ رہا تھا کہ بلیک واٹر نے یہ ہوٹل خرید لیا ہے اور شہر کے اس محفوظ ترین حصہ میں بیٹھ کر وہ پورے صوبے میں اپنی کارروائیوں کی مانیٹر کرے گی۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ بھی کہا گیا کہ مذکورہ ہوٹل امریکہ نے اپنے قونصلیٹ کیلئے خرید لیا ہے۔ پی سی ہوٹل میں ہونے والے بم دھماکے کو اسی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے' جس کے بعد بلیک واٹر کے حوالے سے صوبہ سرحد کے عوام کا ماتھا ٹھنکا اور اب جب اس تنظیم کی طرف سے مبینہ طور پر اپنا دائرہ کار صوبے کے دیگر علاقوں تک پھیلانے کی خبریں آ رہی ہیں تو صوبے کے عوام کی تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں تک بلیک واٹر کا تعلق ہے تو عالمی قوتیں ہر دور میں اپنے استعماری ہتھکنڈوں کی تکمیل کیلئے اس قسم کی تنظیموں کا سہارا لیتی رہی ہیں' اس وقت چونکہ امریکہ عالمی تھانیدار بنا ہوا ہے' اس لئے اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ اطلاعات کے مطابق بلیک واٹر نے اپنی سرگزرمیوں کیلئے صوبائی دارالحکومت پشاور کے مختلف پوش علاقوں میں 67 بنگلے کرائے پر لئے ہوئے ہیں جبکہ اب اس تنظیم نے پشاور کے بعد اپنی سرگرمیوں کو دیگر اضلاع تک بھی وسعت دیتے ہوئے شبقدر میں بھی اپنے دفاتر کے قیام کیلئے اراضی خرید لی ہے جہاں سے یہ تنظیم ملاکنڈ ڈویژن اور مہمند ایجنسی میں عسکریت پسندوں کے خلاف اپنی کارروائیاں کرے گی۔ اس بات کی بھی اطلاعات ہیں کہ کمپنی کے انچارج کریک ڈیوس نے بھی جن کو پاکستان بدر کیا گیا تھا' غیر قانونی طور پر پاکستان واپس آ کر دوبارہ اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ بظاہر تو بلیک واٹر ایک سکیورٹی کمپنی ہے مگر اسکی ذمہ داریاں بہت مشکوک ہیں اگر اس کا کام امریکی سفارتی عملے کی حفاظت اور سکیورٹی ہے تو پھر این جی اوز کی آڑ میں اپنی پراسرار سرگرمیوں کے ذریعے یہ سفارتی حکام کو کون سی سکیورٹی فراہم کر رہی ہے بلکہ ان کی سرگرمیاں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ سکیورٹی ایجنسی نہیں بلکہ اس کا مقصد کچھ اور ہے۔

امریکی سکیورٹی ایجنسی بلیک واٹر کی پاکستان خصوصاً صوبہ سرحد میں بڑھتی ہوئی

سرگرمیوں پر سیاسی حلقوں میں بھی خاصی تشویش پائی جاتی ہے اور مختلف سیاسی جماعتوں اور قائدین
کی جانب سے بلیک واٹر کی سرگرمیوں کو ملک کیلئے انتہائی نقصان دہ قرار دیتے ہوئے حکومت سے
اس کی سرگرمیوں کو بند کر کے اس پر فوری طور پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جبکہ جماعت
اسلامی، جمعیت علمائے اسلام اور پاکستان تحریک انصاف کی جانب سے تو اس تنظیم کی بڑھتی ہوئی
سرگرمیوں کے خلاف عوامی بیداری کیلئے احتجاجی تحریک چلانے کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے۔ اس
سلسلے میں جماعت اسلامی کے صوبائی امیر سراج الحق کہتے ہیں کہ امریکہ نے افغانستان میں جس
طرح کی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں، بلیک واٹر کی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب امریکہ
نے پاکستان میں بھی اسی طرح کی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں۔ بلیک واٹر کی سرگرمیاں بالکل اسی
طرز کی ہیں۔ جس کا آغاز ماضی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں آ کر کیا تھا اور جس کا نتیجہ
ہندوستان پر قبضے کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ اس خطے کے عوام خصوصاً مسلمانوں نے سچ طرز
انگریزوں کو بھگایا تھا، اس خطے کو ایک مرتبہ پھر جنگی زون بنا کر اس کا تاریخی انتقام لیا جا رہا ہے۔

صوبہ سرحد میں بلیک واٹر کی سرگرمیوں کے ساتھ لوگوں کو اٹھا کر نامعلوم مقام پر منتقل
کئے جانے کا سلسلہ جاری ہے لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں برسر اقتدار قوم پرست
پختونوں کی حکومت بھی اس پر خاموش ہے لیکن جماعت اسلامی نے بلیک واٹر پر نظر رکھی ہوئی ہے
ان سب سرگرمیوں کا علاج عوام کے پاس ہے۔ ہم خطے کی حفاظت اور استعماری قوتوں سے نجات
کی خاطر بہت جلد قوم کی بیداری کیلئے احتجاجی تحریک کا اعلان کریں گے۔ تحریک انصاف کے
صوبائی صدر اسد قیصر کا کہنا ہے کہ بلیک واٹر کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے حوالے سے حکومتی خاموشی
عوام کی تشویش کا سبب بن رہی ہے اگر سکیورٹی ایجنسی حکومت پاکستان کی اجازت سے آئی ہے
حکومت عوام کے خدشات دور کرنے کیلئے فوری طور پر اس کی وضاحت کرے کیونکہ بلیک واٹر اور
امریکی میرینز کی پاک سرزمین پر موجودگی ہماری آزادی اور خودمختاری کیلئے بہت بڑا چیلنج ہے
انہوں نے سوال کیا کہ کس معاہدے اور مقصد کے تحت بلیک واٹر اور امریکی میرینز اسلام آباد
کراچی، پشاور، تربیلا اور دیگر علاقوں میں کام کر رہے ہیں۔ امریکی میرینز کی اسلام آباد میں اسلام
آباد پولیس کے ایک افسر کے ساتھ مبینہ بدسلوکی باشعور اور غیرت مند پاکستانیوں کیلئے ناقابل
برداشت ہے۔

O

حکومت انکار کرتی ہے

بلیک واٹر کا پاکستان میں کوئی وجود نہیں۔ بلیک واٹر کی موجودگی محض افواہ ہے۔ عوام ان
افواہوں پر ہرگز کان نہ دھریں۔ اگر کسی کے پاس بلیک واٹر کی موجودگی کے ثبوت ہیں تو وہ فراہم
کرے۔ حکومت پاکستان سخت کارروائی کرے گی۔ یہ الفاظ امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین
حقانی کے ہیں۔

چند روز قبل اسی قسم کے الفاظ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے بھی کہے تھے کہ بلیک واٹر
کا پاکستان میں کوئی وجود نہیں ہے اگر اس کی موجودگی کے کسی کے پاس ثبوت ہیں تو وہ پیش کرے
ہم کارروائی کریں گے۔

حیرت کی بات ہے حکومت پاکستان بار بار تردید کر رہی ہے کہ بلیک واٹر کا وجود نہیں
ہے لیکن پاکستان کے بچے بچے کو معلوم ہے بلیک واٹر کی مشکوک سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں۔ ''جانے
نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے'' والی بات ہے۔ ہماری ریسرچ، تحقیق اور
معلومات کے مطابق اس وقت بلیک واٹر کا نا صرف وجود ہے بلکہ وہ پاکستان کو افغانستان اور عراق
سمجھ کر بڑے منظم اور مربوط طریقے سے اپنا مشن آگے بڑھا رہی ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ
افغانستان اور عراق کے بعد بلیک واٹر کا سب سے مضبوط گڑھ اب پاکستان میں ہے۔

پاکستان میں بلیک واٹر کی سرگرمیوں کا آغاز بہت پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس کا ثبوت یہ
ہے کہ وزارت داخلہ نے 2007ء کو خبردار کیا تھا کہ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جائے لیکن ہماری
سکیورٹی ایجنسیوں نے اس پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ بلیک واٹر نے پاکستان میں
اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ بلیک واٹر کے آفس اس وقت
پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ صرف اسلام آباد اور پشاور میں ہی اس کے سات
سو افراد موجود ہیں جن کی رہائش کیلئے دو سو سے زائد گھر کرائے پر لئے گئے ہیں، جس کی تصدیق
امریکی سفیر بھی کر چکی ہیں۔

حکومت میں شامل اتحادی جماعت کے اہم ارکان کے ساتھ ان کی بات چیت ایک عرصے سے جاری ہے اور ان سے کرائے پر گھر لینے کیلئے بھاری رقوم کی پیشکشیں کی جارہی ہیں۔

دوسری طرف مصدقہ رپورٹس ہیں کہ کراچی میں لسانی اور مذہبی فسادات کروانے کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے' اسکے علاوہ کراچی کے مختلف علاقوں میں پانچ سو سے زائد امریکی موجود ہیں جن کو خفیہ طور پر ملک کے مختلف حصوں میں ٹرانسپورٹ کیا جاتا ہے۔ 19 اگست 2009ء کو اخبارات میں ہموی جن بکتر بند کے بارے میں رپورٹ چھپی۔ یہ گاڑیاں شہروں میں آپریشن کرنے کیلئے انتہائی کارآمد ہوتی ہیں۔ یہ جدید اسلحے سے لیس ہوتی ہیں۔ یہ پاکستانی کرنسی میں ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کی ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ کراچی میں بلیک واٹر کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں' یہاں اس نے باقاعدہ دفاتر قائم کر لئے ہیں۔

جب سے محب وطن عوام اور دانشوروں نے واویلا شروع کیا ہے' بلیک واٹر نے اپنا نام تبدیل کر لیا ہے لیکن اب تک اس کا مونوگرام' طریقہ واردات اور لیٹر پیڈ تک وہی پرانا ہے۔ ان معنی میں یہ بات حسین حقانی اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی درست ہے کہ اس وقت بلیک واٹر نام سے کسی تنظیم کا وجود نہیں کیونکہ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کے مطابق بلیک واٹر نے افغانستان اور پاکستان میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کیلئے نام تبدیل کر لئے ہیں' اب یہ ایک امریکی نجی سکیورٹی ایجنسی نہیں رہی بلکہ چار پانچ پرائیویٹ امریکی سکیورٹی ایجنسیوں کا روپ دھار چکی ہیں۔

اب ان کی سرگرمیاں اور کارروائیاں بالکل اسی طرح ہیں جس طرح جب جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں یہودیوں کی بدنام زمانہ تنظیم ''فری میسن'' پر پاکستان میں پابندی عائد کی گئی' انکے دفاتر سیل کر دیئے گئے۔ پشاور میں بڑی تعداد میں ان کے خلاف کارروائی ہوئی تو یہ پڑوسی ممالک میں جا چھپے لیکن کچھ ہی عرصے بعد یہ نام بدل کر پھر سرگرم ہو گئے اور زیرزمین ان کی سرگرمیاں تاحال جاری وساری ہیں۔ پاکستان میں فری میسن کے کارکنوں کے نام پڑھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ کیسے کیسے ''پردہ نشینوں'' کے نام آتے ہیں؟ ماسوائے ایک صدر کے امریکہ کے تمام صدر فری میسن سے وابستہ رہے ہیں۔

پشاور میں آجکل جس جگہ درویش مسجد قائم ہے' یہ کسی زمانے میں فری میسن کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ کراچی کے علاقے رنچھوڑ لائن میں ان کا ٹمپلر تھا لیکن سرکاری سطح پر جب پابندی لگی تو پھر اس کا زور نہ رہا۔ اس سے پہلے فری میسن کے کارکن بالکل اسی طرح دندناتے پھرتے تھے جس

طرح آج بلیک واٹر کے اہلکار اسلام آباد جیسے حساس علاقے میں پھر رہے ہیں' حتیٰ کہ پاکستان کے سکیورٹی اہلکاروں کو کسی خاطر میں نہیں لاتے۔ اس سے زیادہ سنگین اور خطرناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ سیکٹر ای سیون میں محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی رہائش کے قریب گھر کرائے پر لئے گئے ہیں۔ سیکٹر ای سیون میں دو' ایف سکس میں 37' جی سکس میں 43' ایف سیون میں 47' ایف ایٹ میں 45' ایف ٹین میں 20' ایف 11 میں پچیس اور آئی 18 میں نو اور دیگر سیکٹروں میں گھر کرائے پر لئے گئے ہیں۔ اسی طرح اسلام آباد ہی کے سیکٹر ایف سکس' ایف سیون اور ایف ایٹ کے باشندوں کے مطابق یہاں بلیک واٹر کی مشکوک سرگرمیاں عروج پر ہیں' صرف یہ نہیں بلکہ یہ اسلام آباد کی حساس ترین سڑکوں پر دندناتے پھر رہے ہیں۔

اسلام آباد میں ایف آئی اے کے صدر دفتر کے قریب ایک سیاہ شیشوں والی گاڑی میں سوار چار مسلح امریکی تھے جب پاکستانی سکیورٹی اہلکاروں نے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ یہ بلیک واٹر سے منسلک ہیں لیکن پھر کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں صرف اسلام آباد کا خاص طور پر اس لئے ذکر کر رہا ہوں کہ یہ پاکستان کا دارالحکومت ہے یہاں اہم ترین اداروں کے دفاتر ہیں۔ اہم ترین شخصیات رہائش پذیر ہیں۔ پاکستان کا ایٹمی پلانٹ ہے' سب سے بڑھ کر پاکستانی قیادت یہاں رہائش پذیر ہے۔ خاکم بدہن اگر وفاق بھی امریکہ کی سکیورٹی اہلکاروں کی مشکوک سرگرمیوں سے محفوظ نہیں تو پھر یہاں کون محفوظ ہے؟

امریکہ کا کسی آزاد جمہوری ملک پر اس حد تک کنٹرول اقوام متحدہ کے قوانین کی بھی صریح خلاف ورزی ہے لہٰذا حکومت کو چاہئے جس طرح فری میسن پر پابندی لگائی گئی تھی' اسی طرح جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلیک واٹر اور اس سے منسلکہ اداروں پر بھی پابندی عائد کرے تاکہ پاکستان اور اس کے باشندے محفوظ ہو سکیں۔ افسوسناک خبریں یہ ہیں کہ ریٹائرڈ پاکستانی بیوروکریٹ' دانشور اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے افراد اس معرکے کے لئے بھرتی کر لئے گئے ہیں جو اس پلان کو عملی جامہ پہنانے میں اس دہشت گرد امریکی سکیورٹی کمپنی کا دست و بازو بنیں گے۔ ایسے ماحول میں جب چاروں جانب سے مایوس یہ قوم جو کبھی ایک سمت دیکھتی ہے' کبھی دوسری سمت اور کبھی اسے منتخب سیاستدانوں کا خیال آتا ہے' ہمیں تو یوں لگتا ہے اس بار جو میدان جنگ سجنے جا رہا ہے' اس میں ان بے سروسامان پاکستانی عوام کو شاید خود ہی اس سیلاب کے سامنے بند باندھنا پڑے گا۔

بلیک واٹر عراق سے پاکستان تک

عراق کے بعد پاکستان میں بھی بلیک واٹر کی افواہیں پھیل رہی ہیں اور یہ کہا جارہا ہے کہ ملک میں مختلف شہروں میں امریکی خفیہ ایجنسیاں اس منصوبے میں شامل ہیں اور امریکی سفارتخانہ کی توسیع بھی پاکستان کے خلاف جاسوسی کیلئے کی جارہی ہے۔ جہاں تک بلیک واٹر کا تعلق ہے تو اس نے عراق میں ٹارگٹ کلنگ کی اور دنیا بھر میں بدنام ہوئی۔ یہ امریکی خفیہ ایجنسی کے لئے کام کرنے والی تنظیم ہے جو کسی بھی ملک میں امریکی مفادات کے خلاف کام کرنے والوں کی ٹارگٹ کلنگ کے علاوہ امریکی ایجنسیوں کیلئے راہ ہموار کرنے کی خاطر انتہائی اقدام کرتی ہے۔ بلیک واٹر کے حوالے سے یہ خدشات ظاہر کئے جارہے ہیں کہ اسلام آباد' کراچی' پشاور' لاہور اور دیگر شہروں میں امریکی سنٹرز کے نام پر عمارتیں حاصل کی جارہی ہیں جہاں امریکی ایجنسیوں کیلئے اسی مقصد کی خاطر کارروائیاں عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ یہ کہا جارہا ہے کہ امریکہ اور بعض دیگر یورپی ممالک کے سفارتخانے اور ان کے اہلکار اس مقصد کیلئے پاکستان میں سرگرم عمل ہیں۔

امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن نے گزشتہ دنوں امریکی سفارت خانے میں صحافیوں کو بریفنگ دی اور کہا کہ پاکستان کی جاسوسی کیلئے کسی بڑے سفارتخانے کی ضرورت نہیں اور امریکہ پاکستان میں جاسوسی کیوں کرے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ سینکڑوں میرینز لانے کی بات محض قیاس آرائی ہے۔ امریکی سفیر کے مطابق محض انتظامی ضروریات کیلئے سفارتخانہ کی توسیع کی جارہی ہے اور آئندہ آٹھ سالوں میں 73 کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالرز کی لاگت سے سفارتخانہ کی توسیع کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ این ڈبلیو پیٹرسن نے کہا کہ آئندہ اٹھارہ ماہ میں امریکہ کی طرف سے پاکستان کی سماجی و اقتصادی امداد ڈیڑھ ارب ڈالر ہوگی جبکہ ڈیڑھ ارب ڈالر کولیشن سپورٹ کی مد میں پاکستان کو ملیں گے اور کل پروگرام چار ارب ڈالر کے مساوی ہوگا۔

امریکی سفارتخانے میں ایک میرین ہاؤس بھی تیار کرنے کا انکشاف ہوا ہے' اس سے قبل یہ افواہیں گردش کرتی رہیں کہ امریکی میرینز کی ایک بڑی تعداد پاکستان لائی جائے گی۔ اس

حوالے سے امریکی سفیر نے تردید کی اور کہا کہ اس وقت پاکستان میں امریکی میرینز کی تعداد 9 ہے اور جو صرف اور صرف سفارتخانے کی اندرونی سکیورٹی پر تامور ہیں اور دنیا بھر میں امریکہ کے ڈیڑھ سو کے قریب سفارتخانوں میں ایک ہزار کے قریب میرینز سکیورٹی کا کام کرتے ہیں اور پاکستان میں بھی ایسا ہی ہے۔ سفارتخانہ میں توسیع کے بعد یہاں میرینز کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس ہو جائے گی۔ امریکی سفیر کا کہنا تھا کہ سفارتخانہ کی توسیع کے حوالے سے سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں کسی خفیہ معاہدے کی تمام باتیں غلط ہیں۔ امریکہ کی سفیر نے کہا کہ پاکستان میں بلیک واٹر کا انہیں کوئی علم نہیں اور نہ ہی اس کا امریکی وزارت خارجہ سے کوئی تعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈائن کورپ (DYNECORP) دو پروگراموں پر کام کر رہی ہے جن میں ایک وزارت داخلہ پاکستان کے ساتھ فضائی سپورٹ کیلئے ہے جو ہیلی کاپٹروں سے اینٹی نارکوٹکس فورس کوسٹ گارڈ کی سپورٹ ہے اور دوسرا قونصل خانوں کی حفاظت کیلئے ہے۔ امریکی سفیر نے اعتراف کیا کہ پاکستان میں سکیورٹی کی صورتحال ڈرامائی انداز میں ٹھیک ہو رہی ہے اور امریکی سفارتکار اپنے خاندانوں کو واپس اسلام آباد بلانے پر غور کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سیاستدانوں کو بھی اس حوالے سے بریفنگ دی جائے گی۔

امریکی سفیر کی بریفنگ اپنی جگہ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے نازک وقت میں جب پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی براہ راست مداخلت بڑھ گئی ہے اور پاکستانی قوم امریکہ کو اس کی پاکستان مخالف پالیسیوں کیوجہ سے پسند نہیں کرتی اور مستقبل میں امریکہ کی ان پالیسیوں کے اثرات سے بھی پاکستانی عوام بخوبی واقف ہیں' ان حالات میں امریکہ کیلئے اسلام آباد میں سفارتخانہ کے نام پر اڈا قائم کرنے کی آخر ضرورت کیوں پڑی اور میرین ہاؤس کیوں بنایا جارہا ہے۔ کیا پاکستان میں امریکہ کا اتنا بڑا اسیٹ اپ قائم کیا جارہا ہے' اس پر حکمرانوں کو سوچنا ہوگا۔ اس سے قبل اسلام آباد میں کنونشن سنٹر کے فائیو سٹار ہوٹل کی تعمیر بھی امریکی سفارتخانے کی سکیورٹی کے خدشات کے پیش نظر روک لی گئی تھی۔ پاکستان کے خفیہ ادارے یقیناً ان تمام اقدامات پر نظر رکھتے ہوں گے تاہم حکومت کو اس حوالے سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

O

اندر کی کہانی

دوسری جنگ عظیم کے بعد دو بڑی عالمی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہوتا ہے
کمیونسٹ اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحت دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے' جس کا مقصد عالمی سائل
پر قبضہ کرنا ہے۔ امریکہ اور روس اپنے اتحادیوں کو ساتھ ملا کر نیٹو اور وارسا معاہدے کرتے ہیں' عالمی تجز
نگاروں کے مطابق امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ صرف وسائل پر قبضے کی جنگ تھی جس کا مقص
دنیا کے تیل و گیس ذخائر پر کسی بھی صورت کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ روس اپنے تیل اور گیس کے وسائل ا
تجارت بڑھانے کیلئے گرم پانی تک آنے کی جستجو میں افغانستان پر حملے کی غلطی کرتا ہے' جس کا امریک
فائدہ اٹھاتا ہے۔ روس اپنی نادانی پر پاش پاش ہو جاتا ہے پھر سرد جنگ کا اختتام ہوتا ہے۔ روس کے
ٹکڑے ہونے پر امریکہ کیلئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ امریکہ کئی دہائیوں سے وسط ایشیائی ریاستوا
اور افغانستان میں قدرتی وسائل پر نظریں جمائے ہوئے تھا' امریکہ نے روس کو شکست دینے کیلئے ا
تمام تر وسائل کو استعمال کیا' جس کا مقصد صرف اور صرف خطے میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا تھا۔ صرف
سوویت یونین کے ٹوٹنے سے ہی وسط ایشیائی ریاستوں کو آزادی ملتی اور ان کے وسائل کو بروئے کا
جاسکتا تھا۔ وسط ایشیائی ریاستوں اور افغانستان میں اربوں ڈالر کے تیل' گیس اور معدنیات کے ذخا
موجود ہیں جو پوری دنیا کی ضروریات سے زیادہ ہیں۔

روسی انخلاء کے بعد مجاہد کے درمیان چپقلش اور افغانستان میں خانہ جنگی کئی سالوں تک
جاری رہی' جس کے باعث امریکہ کو اپنے دیرینہ خواب بکھرتے محسوس ہوئے۔ چنانچہ امریکہ
افغانستان میں طالبان کو برسر اقتدار لانے کا فیصلہ کیا' پاکستان کی حکومت اور ایجنسیوں
طالبان کی بھرپور معاونت کی۔ یوں طالبان 1996ء میں افغانستان کے حکمران بن بیٹھے
پاکستان نے اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے طالبان کی بھرپور معاشی اور دفاعی مدد کی' جم
میں سعودی عرب پیش پیش رہا۔ پاکستان اور سعودی عرب نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا جب
امریکہ خاموشی سے صورتحال کا جائزہ لیتا رہا اور اس دوران وسط ایشیائی ریاستوں سے گیس و تیل

کے ذخائر عالمی منڈی تک لانے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ عالمی برادری کے سامنے امریکہ اور
طالبان کے تعلقات کشیدہ دکھائی دیئے لیکن در پردہ امریکہ اور طالبان کے درمیان بہترین ورکنگ
ریلیشن شپ قائم تھی۔ 1997ء تک صورتحال معمول کے طابق امریکی مفاد میں چلتی رہی۔

وسط ایشیائی ریاستیں آذربائیجان' قازقستان' ترکمانستان' ازبکستان اور کرغستان کے گرد
گھومتی ہیں جو سابق سوویت یونین کی قدرتی وسائل سے مالا مال لیکن پسماندہ ترین ریاستیں تھیں۔
روس وسطی ایشیائی ریاستوں سے تیل اور گیس کے وسیع ذخائر اپنی مین پائپ لائن کے ذریعے اکٹھا کرتا
اور پھر انہیں فروخت کرتا تھا۔ دراصل امریکہ وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنے
کے لئے کئی سالوں سے بے چین تھا' اسے اربوں ڈالر کے ذخائر کو عالمی منڈیوں تک لے جانے اور
انہیں فروخت کرنے میں گہری دلچسپی تھی۔ امریکی اور جاپانی کمپنیاں اپنی حکومتوں کو مجبور کر رہی تھیں کہ وہ
جلد از جلد افغانستان کا مسئلہ حل کریں تا کہ وسط ایشیائی ریاستوں سے افغانستان کے راستے پاکستان
اور پھر بحیرہ عرب تک تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کو پہنچایا جا سکے۔ تیل اور گیس کے ذخائر سے امریکی
اور جاپانی کمپنیاں اربوں ڈالر سالانہ کما سکتی تھیں' جس میں اخراجات کا تخمینہ صرف تیل اور گیس کی پائپ
لائنیں بچھانے تک ہی محدود تھا' جس کے بعد امریکہ کا دنیا کے تیل و گیس پر مکمل کنٹرول ہو جاتا اور اربوں
ڈالر کا منافع بھی ملتا رہتا۔ امریکی حکومت اور امریکی کمپنیوں نے وسطی ایشیائی ریاستوں سے عالمی
منڈیوں تک تیل و گیس کے ذخائر کو لے جانے کیلئے کئی راستوں کا انتخاب کیا اور مکمل سٹڈی کروائی۔

امریکی کمپنیوں نے تیل اور گیس پائپ لائن بچھانے کیلئے شمالی روٹ کی فزیبلٹی رپورٹ
پیش کی جس کے مطابق روس کے آئل ٹرمینل کو آذربائیجان اور کرغرستان سے منسلک کر دیا جاتا اور
دونوں ممالک کے تیل اور گیس کو بحیرہ اسود (Black See) اور پھر بحیرہ روم کے ذریعے عالمی
منڈی تک لے جایا جاتا۔ اس اہم منصوبے میں بڑی رکاوٹ چیچنیا میں خانہ جنگی تھی' جس کے
باعث پائپ لائن کی حفاظت ممکن نہیں تھی۔ علاوہ ازیں اس منصوبے سے روس کو فائدہ ہوتا' اس لئے
امریکی حکومت نے اس روٹ کی مخالفت کی۔ ترکی نے بھی اس منصوبے کی مخالفت کر دی کیونکہ ترکی
کو اندازہ تھا کہ اس منصوبے کے تحت ترکی کے ساحل سمندر پر بحری جہازوں کا رش بڑھ جاتا اور اس
کیلئے مسائل پیدا ہوتے' اس لئے ترکی نے اس منصوبے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

امریکی کمپنیوں نے آذربائیجان سے پائپ لائن جارجیا کے ذریعے ترکی لے جانے کی
رپورٹ بھی مرتب کی لیکن چونکہ دیگر وسط ایشیائی ریاستوں ازبکستان' تاجکستان' ترکمانستان' کرغرستان

کو اس پائپ لائن کے ذریعے منسلک نہیں کیا جاسکتا تھا' اس لئے یہ منصوبہ بھی قابل عمل نہ رہا۔ علاوہ ازیں اس منصوبے سے ترکی کی ملکی مارکیٹ متاثر ہوتی' اس لئے ترکی نے منصوبے کی منظوری نہ دی۔

تیسرا روٹ ترکمانستان سے چین اور پھر جاپان تک پائپ لائن بچھانے کا تھا' جسکی لمبائی سات ہزار کلومیٹر بنتی تھی جو نہایت طویل اور مہنگی لاگت کا منصوبہ تھا لہٰذا اس منصوبے پر بھی کوئی کمپنی آمادہ نہ ہوئی۔

ترکمانستان اور ایران کے درمیان طویل سرحد ہے' اس راستے پائپ لائن عالمی منڈی تک باآسانی پہنچ سکتی تھی لیکن امریکہ نے ایران کے راستے پائپ لائن کی شدید مخالفت کی کیونکہ شاہ ایران کی حکومت ختم ہونے پر فرانس' امریکہ' جاپان' اٹلی' چین' ملائیشیا اور روس کی تیل وگیس کمپنیوں کو ایران سے جانا پڑا تھا لہٰذا امریکہ ایرانمیں سرمایہ کاری کا شدید مخالف رہا حالانکہ اس منصوبے پر لاگت کا تخمینہ نہایت کم تھا اور امریکی ویورپی کمپنیاں بھی امریکی حکومت پر دباؤ ڈالتی رہیں کہ امریکہ اسم نصوبے کو قبول کرلے۔

تمام تر صورتحال میں وسط ایشیائی ریاستوں سے تیل وگیس پائپ لائن منصوبے کیلئے سب سے کم لاگت اور قابل عمل راستہ صرف اور صرف افغانستان اور پاکستان کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ 1271 کلومیٹر پائپ لائن کے ذریعے ہر سال بیس ارب کیوبک میٹر گیس عالمی منڈی تک جانی تھی۔ ترکمانستان نے مجموعی طور پر 708 ارب کیوبک میٹر گیس کی فراہمی کا وعدہ کیا' منصوبہ پچاس سال تک قابل عمل تھا۔ جس سے افغانستان اور پاکستان کو تیل وگیس اور رائلٹی کی مد میں اربوں ڈالر ملنا تھے۔ علاوہ ازیں پاکستان کی بندرگاہ بھی دنیا کی مصروف ترین بندرگاہ بن سکتی تھی۔

1997ء میں پاکستان' افغانستان' ترکمانستان اور ازبکستان نے پائپ لائن بچھانے پر اتفاق کیا' جس کیلئے امریکہ نے ایک کنسورشیم بنایا جس میں 47 فیصد امریکہ' پندرہ فیصد سعودی عرب' سات فیصد ترکمانستان' 6.5 فیصد جاپان' 6.5 فیصد انڈونیشیا' پانچ فیصد ترکی اور 3.5 فیصد پاکستانی کمپنیوں نے سرمایہ کاری کرنا تھی۔ اس طرح کئی ممالک پر مشتمل کنسورشیم بن گیا جس کا نام Unocal Led Centgase Consortium رکھا گیا۔

امریکی حکومت صورتحال سے بظاہر مطمئن تھی کیونکہ معاملات طے پا گئے تھے اور افغانستان میں بھی طالبان کی حکومت تھی جو امریکہ کے مکمل کنٹرول میں تھی لیکن اس دوران ارجنٹائن کی ایک کمپنی BRIDAS میدان میں آ گئی اور ترکمانستان اور BRIDAS کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔ امریکہ نے معاہدے کی شدید مخالفت کی۔ ارجنٹائن کی کمپنی نے طالبان کو بھیاری

ساتھ ملا لیا اور انہوں نے طالبان کو سالانہ ایک ارب ڈالر رائلٹی کی پیشکش کر دی۔ کمپنی نے طالبان کو ہر بیس کلومیٹر پر پائپ لائن کے ساتھ ایک پولیس چیک پوسٹ' افغانستان میں سڑکوں کا جال بچھانے اور ترقیاتی منصوبوں کی بھی پیشکش کی' جس میں ریلوے کا وسیع نیٹ ورک بھی شامل تھا۔

امریکہ ترکمانستان اور ارجنٹائن کی کمپنی کے درمیان معاہدے سے شدید برہم تھا اور اس نے افغانستان کے ذریعے منصوبے کو ناکام بنانے کا فیصلہ کیا' طالبان کی حمایت کرنے والی امریکی انتظامیہ نے پلٹا کھایا اور طالبان حکومت کی شدید مخالف شروع کر دی۔ دنیا بھر میں طالبان کو تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ طالبان کو دنیا کے سامنے انتہا پسند اور ظالم کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے اس سلسلے میں امریکی اور یورپی میڈیا کا استعمال کیا اور طالبان کے اسلامی قوانین اور خواتین سے متعلق سخت رویے کو میڈیا کے ذریعے خوب اچھالا گیا۔ یکا یک افغانستان کو دہشت گردی کا مرکز قرار دے دیا گیا اور یوں القاعدہ کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ عالمی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ القاعدہ امریکہ کی پیداوار ہے' جس کے ذریعے امریکہ اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل ہے۔ القاعدہ کی سرگرمیوں کو جواز بنا کر 1998ء میں امریکہ نے اسامہ بن لادن کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا اور اس پر الزام عائد کیا کہ اسامہ بن لادن امریکی تنصیبات پر حملوں میں ملوث ہے۔ یوں امریکہ نے افغانستان کے حالات خراب کر دیئے۔ عالمی رائے عامہ بھی افغانستان اور طالبان کے خلاف ہوگئی۔ ارجنٹائن کی کمپنی اور ترکمانستان کے درمیان پائپ لائن کے معاہدے کو بھی سبوتاژ کر دیا گیا۔

حقائق کی روشنی میں اس امر کے واضح شواہد ملتے ہیں کہ امریکہ نے خطے میں پاؤں جمانے کیلئے القاعدہ کو تشکیل دیا اور پھر امریکہ میں نائن الیون کا ڈرامہ رچایا گیا' جس سے متعلق کئی تحقیقاتی رپورٹیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ نائن الیون کا واقعہ رچایا گیا۔ امریکہ نے نائن الیون کو جواز بنا کر افغانستان پر حملہ کر دیا' جس کے بعد 2001ء سے آج تک امریکہ افغانستان میں موجود ہے۔ امریکہ عراق میں مہلک ایٹمی ہتھیاروں کی میں گیا اور پھر عراق پر قابض ہوگیا جہاں سے اربوں ڈالر کا تیل ہڑپ کر گیا' جس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اربوں ڈالر کا تیل چوری کرنے کے بعد تیل کے کنوؤں کو آگ لگا دی جاتی تا کہ کوئی ثبوت ہی نہ رہے۔ اسی طرح اسامہ بن لادن کیلئے افغانستان کو نشانہ بنایا گیا لیکن آٹھ سال گزرنے کے باوجود القاعدہ کا سربراہ اسامہ بن لادن مل سکا اور نہ ہی طالبان سربراہ ملا عمر کا کوئی سراغ مل سکا' اس کے باوجود دہشت گردی کے خلفا جنگ جاری ہے' جس میں پورے خطے کو جھونک دیا گیا ہے۔

عالمی تجزیہ نگاروں کے مطابق امریکی کسی بھی صورت افغانستان سے واپس نہیں جائے گا بلکہ امریکہ کا مقصد وسط ایشیائی ریاستوں کے وسائل کو بروئے کار لا کر اربوں ڈالر کمانا ہے تا کہ اس کا اربوں ڈالر کا بجٹ خسارہ ختم ہو سکے۔ افغانستان بھی معدنیات کی دولت سے مالا مال ہے' جس کے وسائل کو بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکہ کی افغانستان کی دولت سمیٹنے میں بھی گہری دلچسپی ہے' افغانستان کے صوبے بامیان میں دنیا کے لوہے کے سب سے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ 1961ء کی ایک رپورٹ کے مطابق بامیان میں صرف دو ارب ٹن سے زائد لوہے کے وسیع ذخائر موجود ہیں جبکہ افغانستان کے پہاڑوں میں تیل اور گیس کے توسیع ذخائر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ امریکہ افغانستان میں طالبان کو کچلنا چاہتا ہے تا کہ اس کی کٹھ پتلی حکومت قائم ہو سکے لیکن امریکہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود طالبان کو ختم نہیں کر سکا اور نہ ہی ختم کر سکے گا۔ پاکستان کے نقطہ نظر سے طالبان حکومت پاکستان کے بہترین مفاد میں تھی لیکن امریکہ نے طالبان حکومت کو ختم کر دیا۔ آج اگر طالبان افغانستان سے ختم ہوتے ہیں تو امریکہ اور بھارت کو فائدہ اور پاکستان کو نقصان اٹھانا پڑے گا کیونکہ امریکہ صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرے گا' اسی بناء پر طالبان کو پاکستان کا سٹریٹیجک اثاثہ قرار دیا جاتا ہے۔ امریکہ کو خطے سے نکالنے کیلئے بھی طالبان ہی موثر کردار دے سکتے ہیں' اس لئے پاکستان کی خارجہ پالیسی بھی طالبان کے گرد گھومتی ہے۔ افغان طالبان کو ختم کرنا ہرگز پاکستان کے مفاد میں نہیں البتہ افغان حکومت کے ساتھ بہترین تعلقات قائم کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔

اقتصادی ماہرین کے مطابق پاکستان' افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستیں تیل و گیس اور معدنیات کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں' دنیا بھر میں تیل و گیس کے ذخائر میں کمی آ رہی ہے' اس لئے دنیا کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے وسطی ایشیائی ریاستوں کے ذریعے تیل و گیس کی فراہمی ناگزیر ہوگی۔ آئندہ صدی میں جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا کے ممالک اقتصادی طور پر مضبوط ترین ممالک کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں گے۔ امریک اور یورپ کی تجارت بھی ایشیا کی مرہون منت ہوگی' ان تمام حقائق کی روشنی میں با آسانی کہا جا سکتا ہے امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ صرف اور صرف معاشی جنگ کا ایک حصہ ہے' جس کا مقصد چھوٹے ممالک کے وسائل پر قبضہ کر ہے۔ امریکی ریاست اسلحے کی ایک بڑی فیکٹری ہے' جس کے وسائل نہایت کم اور اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ امریکہ انہی اخراجات کو پورا کرنے کیلئے دنیا بھر میں اسلحہ فروخت کرتا ہے' اسلحے کی فروخت اور پھر جنگیں امریکہ کی مجبوری ہیں' امریکہ نیٹو کے وسائل کو بھی اپنے مفادات کیلئے استعمال کر رہا ہے۔

امریکہ پھنس چکا ہے

امریکی صدر باراک اوبامہ کے دعوؤں اور مرضی کے بالکل برخلاف اس وقت افغانستان روز بروز امریکہ کیلئے ایک نئے ویت نام میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس دوران افغانستان میں امریکی فوج کے کمانڈر جنرل اسٹلی میک کرسٹال کی رپورٹ نے بھی مغربی حلقوں کی نیند اڑا دی ہے اور افغانستان کے حقائق کو پہلے سے بھی زیادہ آشکارہ کر دیا ہے۔ 11 ستمبر 2001ء کے مشکوک حادثات کے بعد امریکہ نے فوراً افغانستان پر حملہ کر دیا اگرچہ دل کی بات اس وقت کے امریکی صدر بش کی زبان پر آ ہی گئی تھی کہ وہ اب ایک اور صلیبی جنگ کرنے جا رہے ہیں مگر عالمی سطح پر جب ان کے اس بیان کی شدید الفاظ میں مذمت کی گئی تو انہوں نے افغانستان میں دہشت گردوں کی موجودگی کا بہانہ بنا کر اس ملک پر چڑھائی کر دی اور افغان عوام کے جذبہ حب الوطنی اور اغیار کو قبول نہ کرنے کی ان کی سرشت کے پیش نظر انہوں نے جنگ زدہ ملک افغانستان کے عوام کو خوشحالی اور دہشت گردوں کے چنگل سے چھڑانے نیز اس ملک میں جمہوریت کا بول بالا کرنے کے وعدوں کے ساتھ قبضہ کر لیا مگر اس کے فوراً ہی بعد افغان عوام کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ ترقی خوشحالی اور آزادی دلانے کا امریکی نعرہ فریب جھوٹ سے زیادہ کچھ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اس ملک میں طویل عرصے تک اپنا غاصبانہ قبضہ برقرار رکھنا ہے۔ امریکی فوج نے نا صرف افغانستان کو دہشت گردوں کے وجود سے پاک نہیں کیا بلکہ اپنی موجودگی سے اس ملک میں دہشت گردی کو مزید فروغ دیا اور امریکی فوج کے قبضے سے قبل جس افغانستان میں منشیات کی کاشت سینکڑوں ٹنوں میں ہوتی تھی وہیں اب یہ کاشت ہزاروں ٹنوں میں ہونے لگی ہے۔ یہی نہیں جس امریکی فوج نے افغان عوام کو خوشحالی ترقی اور آزادی دلانے کے نعرے سے اس ملک میں قدم رکھا تھا' اسی نے بیگناہ افغان بچوں اور خواتین کا خون بہانا شروع کر دیا اور شادی کی تقریبات پر بمباری امریکی فوج کا معمول بن گیا۔ نتیجے میں افغان عوام جو پہلے ہی اپنے ملک میں اغیار کے قبضے سے راضی نہیں تھے۔ امریکی اور نیٹو فوج کے بہیمانہ

حملوں سے اغیار کے تیئں اور بھی زیادہ متنفر ہوگئے اور یوں جس افغانستان پر گھنٹوں میں امریکہ
نے قبضہ کرلیا تھا' اب وہی ملک اِس کیلئے گلے کی ہڈی بنتا جارہا ہے۔ چنانچہ امریکی فوج کے کمانڈ
نے اپنی حالیہ رپورٹ میں جس بات کا اعتراف کیا ہے وہ اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے جس کی
جانب امریکی حکام کچھ کہنے اور بولنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں۔ امریکی فوج کے کمانڈ
نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ اگر امریکہ اور مغرب افغانستان کے تعلق سے فوری طور پر کوئی چار
جوئی نہیں کرتے اور اس ملک کیلئے مزید افواج روانہ نہیں کرتے تو طالبان بہت جلد پور
افغانستان پر مسلط ہو جائیں گے اور پھر طالبان کا مقابلہ کرنا بہت ہی مشکل ہو جائے گا۔ امریکی
فوج کے کمانڈر کا یہ بیان افغانستان میں امریکہ اور نیٹو کے کنٹرول سے صورتحال کے خارج ہو
کے بارے میں کسی بھی امریکی عہدیدار کا سب سے واضح اعتراف شمار ہوتا ہے۔

مبصرین کا کہنا ہے کہ اب یہ بات طے ہوچکی ہے کہ افغانستان میں امریکہ اور اس کے
اتحادیوں کی تمام چالیں اور تدبیریں دھری کی دھری رہ گئی ہیں۔ افغانستان کے حالات بالکل ا
نوعیت کے ہوگئے جو افغانستان پر حملے سے پہلے کے تھے۔ دریں اثناء افغانستان میں موجود
افواج کے چہروں پر تھکن کے آثار پورے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں اور اس کی مثال یہ ہے کہ کینیڈ
نے جو نیٹو کا ایک سرگرم رکن کہلاتا ہے' اعلان کیا ہے کہ وہ امریکہ کی درخواست کی پرواہ کئے بغیر ا
فوج وہاں سے نکال رہا ہے۔ جرمنی نے بھی اعلان کردیا ہے کہ وہ بھی اب مزید فوج افغانستان نہیں
بھیجے گا جبکہ گزشتہ دنوں اٹلی کے کئی فوجیوں کی ہلاکت کے بعد اٹلی بھی کہہ چکا ہے کہ وہ نا صرف یہ
اپنے مزید فوجی افغانستان روانہ نہیں کرے گا بلکہ وہ افغانستان سے اپنے فوجی واپس بلانے پر
غور کررہا ہے۔ نیٹو کے رکن ممالک کے یہ بیانات ایک ایسے وقت میں سامنے آرہے ہیں جب
کے نئے سیکرٹری جنرل راسموس کی کوشش ہے کہ وہ نیٹو کے اتحاد کو پارہ پارہ ہونے سے بچالیں
انہوں نے امریکی صدر باراک اوبامہ سے ملاقات میں اس بات کا اطمینان دلایا کہ جب تک
ضرورت ہوا نیٹو کی فوجیں افغانستان میں موجود رہیں گی لیکن شواہد قرائن اور حقائق کسی اور ہی چیز
غمازی کررہے ہیں۔ افغانستان میں امریکی اتحادیوں میں اب مزید یہاں ٹھہرانے کا حوصلہ
ہوتا جارہا ہے۔ نیٹو کے رکن ممالک یہ دیکھ رہے ہیں کہ افغانستان میں آٹھ سال سے ان
موجودگی کا انہیں کم از کم کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ مالی اور جانی طور پر بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔
جبکہ افغان عوام میں ان کے خلاف نفرتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر اور خود ان

ملک کے اندر بھی رائے عامہ میں اس فیصلے کے خلاف ناراضگی بڑھتی جارہی ہے۔ اس وقت نیٹو
کے اکثر ممالک کی حکومتوں پر اپنے ملک کے عوام کا سخت دباؤ ہے۔ برطانیہ میں گورڈن براؤن کی
سیاسی زندگی اسی افغانستان کے مسئلہ کی وجہ سے سخت خطرات سے دوچار ہے اور اب تو برطانیہ کے
بہت سے لوگ اور بیشتر سیاسی جماعتیں افغانستان کے تعلق سے برطانیہ کی پالیسیوں کو احمقانہ اور
لاحاصل قرار دے رہی ہیں۔ یہی صورتحال نیٹو کے دیگر رکن ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یورپی
ممالک کے حکام اگرچہ اپنے اپنے ملک کے اندر کی صورتحال اور افغانستان کے تعلق سے ہونیوالی
مخالفتوں اور مسائل کو سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر واشنگٹن کے حکام کو بیان نہیں کرسکتے لیکن وہ
افغانستان کے مسائل کے بارے میں اپنے جدید خیالات اور نئی حکمت عملی کو بیان کرکے اپنے
اعتراضات امریکہ کے سامنے ضرور درج کرارہے ہیں البتہ اس پوری صورتحال کے باوجود ایسا لگتا
ہے کہ یورپی ممالک کے پاس افغانستان کے بحران سے خود کو نکالنے کیلئے ابھی بھی کوئی مستقل حل
نہیں ہے یا پھر وہ امریکہ کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہتے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ افغانستان کو لے کر
امریکہ اور نیٹو کے درمیان اختلافات اور فاصلے بڑھتے جارہے ہیں اور امریکی حکام کی بے بسی کا
اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ جس نے اکیلے افغانستان پر قبضہ کرنے کا خواب
دیکھا تھا' اب اس کے صدر باراک اوبامہ یہ کہہ رہے ہیں کہ افغانستان کی جنگ صرف امریکہ کی
نہیں ہے' ان کے اس بیان سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ امریکہ افغانستان میں تنہا ہوتا جارہا ہے اور
اسی لئے وہ اس بحران سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش میں روز بروز ایک نئے بحران میں پھنستا
جارہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ امریکی صدر باراک اوبامہ آگے چل کر افغانستان کے بحران کو اکیلے ہی
ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنے کندھوں پر لئے پھریں گے اگرچہ امریکہ نے اپنی ناکامی پر پردہ
ڈالنے کیلئے بحران کا رخ پاکستان کی طرف موڑنے کی کوشش کی ہے اور یہ پراپیگنڈا کرنا شروع کر
دیا ہے کہ طالبان کی اعلیٰ قیادت پاکستان کے شہر کوئٹہ میں روپوش ہے اور حکومت پاکستان طالبان
قیادت کو دوبارہ منظم ہونے کی اجازت دے رہی ہے مگر امریکی حکام اپنے اس طرح کے بیانات
سے اپنی ناکامیوں پر پردہ نہیں ڈال سکیں اور اگر امریکہ نے کوئٹہ میں طالبان قیادت کی موجودگی کا
بہانہ بنا کر وہاں بھی ڈرون حملے کرنے کی حماقت کی تو اس کا حال پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گا۔

O

امریکہ افغانستان کی جنگ ہار رہا ہے

امریکہ افغانستان میں جنگ ہار رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد اختیار کردہ اس کی اندھی جنگی حکمت عملی بری طرح ناکام ہوتی صاف نظر آ رہی ہے اور اس کا اعتراف خود امریکی و برطانوی فوج کے سربراہ پچھلے چند ہفتوں کے دوران متعدد بار کر چکے ہیں۔ فروری 2009ء میں امریکی فوج کے مشترکہ کمان کے سربراہ ایڈمرل مائیک مولن نے ایک خفیہ رپورٹ میں اعتراف کیا تھا کہ پاکستان میں جاری دہشت گردی عراق' افغان جنگ اور عالمی سطح پر اقتصادی عدم استحکام کے باعث امریکی فوج کسی نئے بحران سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ مسلسل جنگوں سے تھکے ہارے اور بم دھماکوں' خودکش حملوں کے خطرہ سے دوچار امریکی فوجی اب مزید کسی جنگی مہم سے نمٹنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ گوکہ یہ اعتراف پہلی بار نہیں ہوا بلکہ گزشتہ برس کے دوران بھی امریکی و برطانوی جنرلوں نے اسی قسم کے پیغامات اپنی حکومت کو دیئے تھے کہ عراق کی اعصاب شکن جنگ کے بعد افغانستان میں بھی حالات موافق نہیں جا رہے۔ طالبان کی سرگرمیوں میں تیزی آ رہی ہے اور اتحادی افواج کے جانی نقصان کا گراف مزید بلند ہو رہا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی فوجی کمان کے سربراہ نے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں بتایا تھا کہ سال 2008ء امریکی اور اتحادی افواج کیلئے جانی نقصان کے حوالے سے بدترین سال تھا۔ امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کی اعلیٰ قیادتیں اپنے پالیسی سازاداروں تک بگڑتی صورتحال برابر پہنچا رہی ہیں اور ان کا اصرار بڑھ رہا ہے کہ افغانستان میں صرف جنگی محا قائم رکھنے کی بجائے اس بے سروپا جنگ کے خاتمے کیلئے طالبان لیڈرشپ سے بات کی جائے۔

مارچ 2009ء افغانستان میں اپنی فوج بھیجنے والے ایک اہم امریکی اتحادی پڑوسی ملک کینیڈا کے وزیراعظم سٹیفن ہارپر کا بہت ہی اہم بیان سامنے آیا تھا' کینیڈین وزیراعظم کا کہنا تھ کہ میں نہیں سمجھتا کہ افغانستان میں اتحادی افواج انتہاپسندوں کو شکست دے کر مکمل فتح حاصل کر سکتی ہیں۔ امریکی ٹی وی سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے سٹیفن ہارپر نے کہا کہ میں واضح طور

ہتا ہوں کہ افغانستان میں انتہاپسندوں کو کبھی شکست نہیں دی جا سکتی۔ افغانستان کی تاریخ کے طالعہ کے بعد جہاں تک میری معلومات ہیں' یہ ملک ہمیشہ سے شورش زدہ رہا ہے۔ سٹیفن ہارپر نے مزید کہا کہ افغانستان میں طالبان سے نمٹنے کیلئے ایک موثر افغان حکومت کا قیام ضروری ہے۔ ضح رہے کہ اس وقت افغانستان میں کینیڈا کے 2300 فوجی موجود ہیں جنہیں 2011ء کے خر تک واپس بلانے کا پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ کینیڈین وزیراعظم کا یہ اصرار امریکی انتظامیہ اور یگر اتحادیوں بالخصوص امریکی بغل بچے برطانیہ کیلئے خاصا پریشان کن تھا' چنانچہ امریکی صدر بامہ نے اس پر فوراً ردعمل ظاہر کیا اور کہا کہ پاکستان میں صورتحال انتہائی خراب ہو چکی ہے' اس لئے ہم فاٹا میں القاعدہ اور طالبان کی محفوظ پناہ گاہوں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ پاکستان کو نظرانداز ر کے افغانستان کا مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا جبکہ برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن کا کہنا تھا کہ میں بہرحال دہشت گردوں سے نمٹنا ہوگا' ہم انہیں محفوظ پناہگاہوں میں آزاد نہیں چھوڑ سکتے۔

نومنتخب امریکی صدر باراک اوبامہ کے وائٹ ہاؤس سنبھالنے کے بعد دفاعی مبصرین امید کر رہے تھے کہ شاید وہ اپنے انتخابی سلوگن (تبدیلی) کو اسی طرح آگے بڑھائیں گے تاکہ نیا میں امن قائم ہو سکے۔ بالخصوص امریکی افواج جس بڑے پیمانے پر عراق و افغانستان کے دو اذوں پر مصروف جنگ ہیں' صدر اوبامہ یقیناً اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر لیں گے۔ مبصرین ی پیشگوئی کے مطابق صدر اوبامہ نے کچھ فیصلے تو کئے مگر ان کی نوعیت زیادہ خوش کن اس لئے نہیں ہی جا سکتی کہ صدر اوبامہ کے پس پشت موجود جنگی لابی فوری طور پر دونوں محاذوں سے امریکی ج کے انخلاء یا جنگ بندی کا اعلان کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ چنانچہ صدر اوبامہ عراق سے مریکی افواج نکالنے کا ٹائم ٹیبل دینے پر تیار ہو گئے مگر افغانستان کے بارے میں امریکی پالیسی یک اور موقع آزمانے پر مشتمل منصوبہ کی تکمیل تک باقی رکھی گئی ہے۔ عراق جنگ نیا مریکہ کو دنیا بس رسوا اس لئے کر دیا تھا کہ وہ جن خطرناک ہتھیاروں کی تلاش میں وہاں پہنچا وہ صدام حسین کی وت کے بعد بھی اسے دستیاب نہ ہو سکے اور یہ ایک ایسا جھوٹ تھا' جس کی تلافی امریکی حکام کیلئے ممکن نہیں' تاہم وہ آئندہ دو سال میں اپنی افواج وہاں سے نکالنا چاہتے ہیں جبکہ افغانستان کا معاملہ طعاً مختلف ہے۔ سی آئی اے اور پینٹاگان کے پلانر پہلے بھی ایک عظیم منصوبہ بندی کے تحت یہ یڈیا مہم چلا چکے ہیں کہ القاعدہ امریکی حملوں سے شکست کھا کر پاکستان کے قبائلی علاقوں میں تقل ہو چکی ہے لہٰذا اب امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کی توجہ کا مرکز افغانستان اور پاکستان کے

قبائلی علاقے ہوں گے۔ امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے نے گزشتہ برس سے اب تک کم وبیش سات رپورٹوں میں اس بات کو مرکزی نکتہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں القاعدہ اور طالبان ایک بار پھر اپنی صفیں منظم کر رہے ہیں اور انکی کارروائیوں کا دائرہ کار بڑھ ہوا امریکہ اور یورپ تک پہنچنے کے خطرات بھی پوری طرح موجود ہیں۔

دوسری طرف نیٹو فورسز کے کمانڈر پاکستان کو موردالزام ٹھہرائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہیں کہ قبائلی علاقوں میں عسکریت پسندوں کی نقل وحمل اور ان کی جنگی کارروائیوں کو ہر صورت روکا جائے۔ سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں امریکی حکام کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی کھلی اجازت حاصل تھی، چنانچہ امریکی حکام نے اس اجازت کا بھرپور فائدہ اٹھایا گزشتہ نو برسوں کے دوران امریکی خفیہ اداروں کے سینکڑوں ارکان ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے انتہائی خطرناک سرگرمیوں میں ملوث چلے آرہے ہیں، جس پر قومی سلامتی کے ذمہ دار ادارے پہلے پرویز مشرف کو اور اب پیپلز پارٹی کی حکومت کو مطلع کر رہے ہیں کہ ہمارے قبائلی علاقوں میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعات میں امریکہ، بھارت اور اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کے لوگ پوری طرح ملوث ہیں اور انہوں نے سرمائے کے بل بوتے پر ایسے گم کردہ راہ جرائم پیشہ افراد کو اپنے ساتھ ملا رکھا ہے جو پیسے کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

یہی وہ عناصر ہیں جو پاکستان کو ایک ناکام ریاست اور دہشت گردوں کی پناہ گاہ ثابت کرنے کیلئے پوری تندہی سے کام کر رہے ہیں اور انکی مذموم سرگرمیوں کا دائرہ کار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قبائلی علاقوں سے نکل کر دوسرے شہروں اور صوبوں تک پہنچنے لگا ہے۔ ان کا ٹارگٹ عام لوگ ہیں، عبادت گاہوں پر حملے بھی اسی حکمت عملی کا حصہ ہیں جسکے تحت فرقہ وارانہ منافرت فساد پیدا کر کے پاکستان کو اندرونی طور پر کمزور کرنا ہے۔ دوسری طرف جو لوگ اس بہیمانہ کھیل کو سمجھ رہے ہیں، وہ برملا اعتراف کرتے ہیں کہ بہت کچھ ایسا ہو رہا ہے جو ناقابل فہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں دہشت گردی کی جنگ کے حوالہ سے امریکی نقطہ نظر اور طرز عمل سے متفق نہیں ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ پاکستان کو امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے اپنی سرزمین، اپنے لوگ، اپنی فوج اور قومی وسائل کو ہرگز نہیں جھونکنا چاہئے اور نہ ہی اپنے لوگوں کا قتل عام کرانے کیلئے ملنے والی ممکنہ امداد کو قبول کرنا چاہئے۔

امریکہ افغانستان میں اگر جنگ لڑنا چاہتا ہے تو وہ اپنا یہ شوق پورا کرلے حالانکہ عقلمندی

ی ہے کہ وہ ماضی سے سبق سیکھے اور جان لے کہ ڈھیل ڈھالے لباسوں میں ملبوس یہ عمامہ پوش قوم ماہر عام وسادہ لوح دیکھنے کے باوجود یہ امتیاز رکھتی ہے کہ اس نے آج تک کسی غیر ملکی تسلط کو قبول ہیں کیا۔ بالخصوص برطانوی سامراج اور سابق سوویت یونین (روس) سے زیادہ بہتر یہ بات کوئی ہیں سمجھ سکتا لیکن امریکہ کی مشکل یہ ہے کہ وہاں وزیر دفاع رابرٹ گیٹس جیسے لوگ موجود ہیں جن ا تعلق اسی جنگجو لابی سے ہے جس نے افغانستان وعراق میں اس خونی کھیل کا آغاز کیا تھا۔ اس کے علاوہ امریکی صہیونی مسلم دشمن لابی بھی صدر باراک اوبامہ کو افغانستان میں فوری جنگ بندی ر طالبان قیادت سے مذاکرات کر کے معاملات درست سمت میں لانے کی راہ میں حائل ہے۔ ن کا خیال ہے کہ پاکستان گزشتہ آٹھ برسوں میں امریکی پالیسیوں پر عمل پیرا ہو کر اتنا آگے بڑھ کا ہے، اس کے وجود کو اتنے خطرات لاحق ہو چکے ہیں اور معاشی طور پر اس کی حالت اتنی دگرگوں وچکی ہے کہ اب اسے امداد کا لالچ دے کر دباؤ میں لانا بہت آسان ہو گیا ہے اور اگر یہ کسی طرح کستانی حکومت عوامی دباؤ یا سیاسی جماعتوں کے پریشر اور اندرون ملک پیدا ہوتی خانہ جنگی کی ورتحال سے بچنے کیلئے دہشت گردی کی جنگ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو ایسی صورت ں امریکی افواج افغانستان میں بری طرح پھنس کر سینڈوچ بن جائیں گی۔ لہٰذا ایسی نوبت نہ نے دی جائے کہ پاکستان سیاسی ومعاشی سطح پر سنبھل سکے بلکہ کوشش کی جائے کہ جس طرح نائن لیون کے بعد افغانستان میں امریکی افواج کے قیام اور وہاں جنگی کارروائیوں کا تسلسل باقی رکھنے کیلئے پاکستان نے بھرپور کردار ادا کیا ہے، اسی طرح وہ طالبان کے خلاف ایک آخری اور بھرپور نگ لڑنے کیلئے بھی امریکہ کی مدد کرے۔ امریکی پالیسی ساز کئی ماہ سے اس نکتہ پر توجہ مرکوز کرتے وئے پاکستان سے بات چیت کر رہے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ پاکستانی حکومت یہ کردار ادا کرنے کیلئے ہر صورت تیار ہو جائے۔

اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ 2004ء سے پہلے پاکستان میں کوئی خودکش ملہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی پاک فوج یا دیگر سکیورٹی فورسز پر حملے کئے گئے تھے۔ بات تب بڑھی جب مریکی دباؤ پر سابق صدر جنرل پرویز مشرف نے فوجی کارروائیوں کا آغاز کرنے کا حکم دیا اور پھر مریکی طیاروں اور افواج کے حملے براہ راست پاکستان قبائلی علاقوں میں ہونے لگے۔ تب سے ب تک یہ سلسلہ جاری ہے، نہ امریکی پالیسیاں تبدیل ہو رہی ہیں اور نہ ہی خودکش حملوں اور سکیورٹی ورسز کو ٹارگٹ بنائے جانے کے واقعات تھمنے میں آرہے ہیں۔

پاکستان میں رائے عامہ اس بات پر متفق ہے کہ ہماری مشکلات کا باعث امریکی جنگی جنون ہے اور دہشت گردی کے خلاف وہ جنگ جو صرف افغانستان میں لڑی جارہی تھی اسے سابق صدر پرویز مشرف اپنے اقتدار کو طول دینے اور امریکی گڈ بک میں اپنا نام باقی رکھنے کیلئے پاکستان میں گھسیٹ لائے اور اب اس فیصلے کے خطرناک منطقی نتائج یوں ظاہر ہو رہے ہیں کہ پاکستان کا کوئی صوبہ اور کوئی شہر بھی خودکش حملوں سے محفوظ نہیں رہا لیکن اس کے باوجود پاکستان سے کہا جارہا ہے کہ حالات ٹھیک کئے جائیں حالانکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ پاکستان کے اندرونی حالات کی خرابی کا ذمہ دار امریکہ ہی ہے۔

O

شیطانی جال

کسی ملک کی سلامتی کا انحصار اس ملک کے مضبوط انتظامی ڈھانچے پر ہوتا ہے۔ انتظامی ڈھانچے میں سب سے مضبوط ستون اس ملک یا ریاست کی خفیہ ایجنسی ہوتی ہے۔ خفیہ ایجنسی اس ملک کے تحفظ اور استحکام کی آئینہ دار اور ضامن ہوتی ہے۔ دنیا میں تقریباً ہر ملک کی اپنی ایک خفیہ ایجنسی ہے جو اس ملک کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے بچاتی ہے اور وقت پڑنے پر کسی بھی انتہائی حد تک جانے کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی ملک کے مضبوط ہونے کا اندازہ اس کی خفیہ ایجنسی کی کارکردگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس وقت جو خفیہ ایجنسیاں عالمی سیاست میں توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں ان میں سی آئی اے، ایم آئی سکس، را، خاد، کے جی بی اور موساد RAAM قابل ذکر ہیں۔ ہر خفیہ ایجنسی اپنی پالیسی اور حکمت عملی ملکی مفادات کو مدنظر رکھ کر بناتی ہے۔ یہ بات کبھی سننے کو نہیں ملی ہوگی کہ کسی ملک کے خفیہ ادارے نے ملکی پالیسی کے مخالف کام کیا ہے اور ملک کے استحکام کو خطرے میں ڈالا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اگر کسی ملک کی خفیہ ایجنسی مستحکم ہے تو ملک کو کسی قسم کے خطرات کا خوف نہیں بلکہ خطرات کو ملک میں پیدا ہونے سے پہلے ہی خفیہ ادارے اس کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ حالیہ دنوں امریکی اخبار سے ایک خبر شائع ہوئی، جس نے امریکہ کو چلانے والے کالے ہاتھوں کو بے نقاب کر دیا۔ مطلب یہ کہ دنیا کی سب سے فعال اور بڑی خفیہ ایجنسی سی آئی اے جو کہ کہنے کو مریکہ کے مفادات کی دنیا میں جنگ لڑ رہی ہے، کا سیکنڈل سامنے آیا، جس میں یہ بات واضح کی گئی کہ سی آئی اے نے نائن الیون کے بعد جو بھی کارروائی کی ہے، اس کا امریکی کانگریس کو علم نہیں بلکہ اسے اندھیرے میں رکھا گیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سی آئی اے نے امریکی انتظامیہ کو اندھیرے میں رکھا تو یہ خفیہ ادارہ کس کے کہنے اور کن عناصر کے مفادات کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے؟ اس مذموم ایجنسی کے پیچھے کون سے عناصر ہیں؟ ایک بات تو واضح ہوگئی ہے کہ امریکہ اس ایجنسی کو لگام ڈالنے سے قاصر ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سی آئی اے نے سابق امریکی نائب صدر ڈک چینی کے احکامات پر ایک خفیہ انسداد دہشت گردی پروگرام کے متعلق آٹھ سال تک امریکی انتظامیہ اور کانگریس کو بے خبر

رکھا۔ نیویارک ٹائمز نے یہ بات لکھی ہے کہ دو نامعلوم ذرائع کے مطابق سی آئی اے کے ڈائریکٹر لی آن پینٹا نے گزشتہ ماہ کے اختتام میں کانگریس کی انٹیلی جنس کمیٹیوں سے بند کمرہ کی بریفنگ میں ڈک چینی کے ملوث ہونے کا انکشاف کیا ہے۔ لی آن پینٹا نے جنہیں صدر باراک حسین اوبامہ کی جانب سے اس سال کے اوائل میں ایجنسی کا سربراہ نامزد کیا گیا تھا' ڈک چینی کے پروگرام کو ختم کر دیا جو کہ ابھی تک صیغہ راز میں ہے' جب انہیں 23 جون 2009ء کو سی آئی اے کی اس کارروائی کا علم ہوا تو انہوں نے اخباری حکام سے کہا تھا کہ سی آئی اے نے گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد پروگرام کا آغاز کیا تھا اور کہا کہ ایجنسی کی یہ کارروائی ملکی مفاد میں کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ اخبار نے کہا کہ ان کی رشتہ داروں اور رفقاء کے توسط سے ڈک چینی تک پہنچ کر ان کے خیالات حاصل کرنے کی کوشش تاحال کامیاب نہیں ہوئی۔

ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق سی آئی اے کے ترجمان پال گیمک سے اس مسئلے پر پوچھنے پ انہوں نے بتایا کہ یہ خفیہ ایجنسی کی پریکٹس ہے کہ درجہ بند بریفنگ پر غور وخوض کرے' جب سی آئی اے کے ایک یونٹ نے یہ معاملہ نئے ڈائریکٹر پینٹا کے علم میں لیا تو یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ کانگریس کا مناسب طور پر اس کی ساجھے داری کی جائے جو ان کا ایک نظریہ ہے اور انہوں نے اس کو نافذ العمل کرنے کیلئے فیصلہ کن کارروائی کی۔ گیمک لیانو نے یہ بات کہی اور مزید معاملے پر تبصرہ کرنے سے انکا کر دیا۔ ڈک چینی متنازعہ تفتیشی طریقوں کے استعمال کے حوالے سے بش انتظامیہ میں ایک اہم وکیل اور سرگرم رکن رہے ہیں اور اوبامہ کی قومی سلامتی کے حوالے سے پالیسیوں کے ایک سرکردہ نقاد کے طور ابھرے ہیں۔ سی آئی اے کی جانب سے کانگریس سے پوشیدہ رکھی گئی اہم اطلاع کی گونج مئی میں اسوقت ہوئی جب ایوان نمائندگان کی سپیکر نینسی پلوسی نے خفیہ ایجنسی پر 2002ء میں انکشاف میں ناکامی کا الزام لگایا' جس کے بعد امریکی انتظامی حلقوں میں سی آئی اے کے حوالے سے بے چینی کی دوڑ گئی' جس پر اس مسئلے پر تحقیق کرنے اور ڈک چینی کو شامل تفتیش کرنے کی بات کی جارہی ہے۔

امریکی اٹارنی جنرل ایرک ہولڈر نے کہا ہے کہ وہ سابق صدر جارج ڈبلیو بش کی انتظا اور امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے خلاف اس دوران مشتبہ انتہاپسندوں سے پوچھ گچھ کے سخت غیر انسانی طریقوں کی انکوائری کیلئے فوجداری کے وکیل کو مقرر کرنے کے سلسلے میں سنجیدگی سے س رہے ہیں۔ ایک سرکاری افسر نے اپنا نام خفیہ رکھنے کی شرط پر بتایا کہ سارے معاملے میں کسی طرح انکوائری اس بات کے اردگرد منحصر ہوگئی کہ اس دوران پوچھ گچھ کے طریقے کہیں محکمہ انصاف کی ہدایا سے زیادہ سخت تو نہیں رہے لیکن ذرائع کے مطابق اپنے خفیہ افسروں کو انکوائری کے دائرہ کار میں نہیں

جائے گا جنہوں نے اس دوران محکمہ انصاف کی ہدایات کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ ری پبلک ممبر پارلیمنٹ اور صدارتی امیدوار جان میک کن نے اس اقدام کی سخت مذمت کی ہے جبکہ ڈیموکریٹک ممبران پارلیمنٹ اور انسانی حقوق سے متعلق اداروں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ خیال رہے کہ گزشتہ اپریل میں محکمہ انصاف کی جانب سے بش انتظامیہ کی طرف سے پوچھ گچھ کے دوران غیر انسانی طریقہ کار استعمال کرنے کی منظوری سے متعلق اشتہارات کے عام کرنے کے بعد ہی اوبامہ حکومت نے اس معاملے کی انکوائری کے شارے دیئے تھے۔ انٹیلی جنس کمیٹی کے صدر فینس ٹین نے کہا کہ ان کو دو ہفتے قبل سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے حالات سے آگاہ کیا تھا۔ انہوں نے میڈیا کو بتایا کہ سابق نائب صدر ڈک چینی نے سی آئی اے حکام کو حکم دیا تھا کہ سی آئی اے کی موجودہ کارروائیوں کے متعلق کانگریس کو کچھ نہ بتایا جائے۔ سینٹ میں جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو اس معاملے کی تحقیقات کے حوالے سے منظوری مل گئی۔ سینٹ نے ایک اعلامیہ جاری کیا' جس میں کہا گیا ہے کہ خفیہ ایجنسی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی بھی کارروائی کو حکومت سے پوشیدہ رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی کانگریس کو اندھیرے میں رکھنے کا اختیار رکھتی ہے بلکہ یہ خفیہ ایجنسی کے فرائض میں شامل ہے کہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے کانگریس اور متعلقہ انتظامیہ کو بریفنگ دی جائے اور کارروائی کرنے کی منظوری لی جائے۔ مطلب یہ کہ سی آئی اے یا کوئی بھی خفیہ ایجنسی کانگریس کے ماتحت ہے نہ کہ کانگریس خفیہ ایجنسی کے ماتحت کام کرتی ہے۔

سینٹ کے رکن ڈربن نے بی بی سی کے ایک پروگرام میں خفیہ ایجنسی کے معاملے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسے امور کو مناسب طریقے سے سرانجام دینا چاہئے تاکہ قومی سلامتی کو خطرہ نہ لاحق ہو لیکن ایک بڑا پروگرام جسے کانگریس سے چھپایا جائے' نا صرف ایک غیر مناسب حرکت ہے بلکہ یہ غیر قانونی بھی ہوسکتا ہے۔ ڈک چینی کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ کوئی بھی شخصیت قانون سے بالاتر نہیں ہوسکتی۔ ان کے مطابق کسی بھی شخص کو قانون سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ ڈک چینی کے اس پروگرام میں ملوث ہونے میں پوچھے گئے ایک سال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی قانون سے ماورا نہیں' کوئی بھی آدمی نائب صدر سے یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ آپ نائب صدر ہیں' اس لئے قانون کی پابندی کرنا ضروری نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈک چینی کو سی آئی اے پروگرام کے حوالے سے کانگریس کو بریفنگ دینی چاہئے تھی۔ اس وقت ڈک چینی اوبامہ کی قومی پالیسی پر ایک سرکردہ ناقد کی حیثیت سے ابھر کر آرہے ہیں۔ اوبامہ نے 20 جنوری 2009ء کو صدارتی عہدہ سنبھالتے ہی پہلا حکم مشتبہ دہشت گردوں کے ساتھ انسانی سلوک کرنے کے متعلق جاری کیا تھا'

جس پر ڈک چینی نے اوبامہ پر سخت تنقید کی تھی۔ نئے سی آئی اے کے ڈائریکٹر پینٹا نے بھی یہ عہد کیا۔ کہ وہ اپنے دور میں غیر انسانی رویہ اختیار کرنے کی خفیہ ایجنسی کو ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ انہوں۔ یہ بھی کہا کہ وہ قیدیوں کو ماضی کی خفیہ جیلوں میں نہیں رکھیں گے اور نہ ہی ایسے ممالک کے حوالے کر گے جوان کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کریں جبکہ اس طریقہ کار کی بش انتظامیہ میں خلاف ورزی گئی۔ ڈک چینی کو بدنام زمانہ خفیہ سکواڈ جسے ڈیتھ سکواڈ کے نام سے جانا جاتا ہے اور جو دنیا بھر میں نام اشخاص کی اموات اور حکومتوں کا تختہ الٹنے میں مشہور رہا ہے کا بانی کہا جاتا ہے۔ یہ وہی سکواڈ ہے جم کے متعلق چند ہفتے پہلے نیویارک ٹائمز کے نمائندے نے یہ انکشاف کیا تھا کہ بینظیر کے قتل میں ڈیتھ سکواڈ کا ہاتھ ہے' یہ سکواڈ براہ راست ڈک چینی سے حکم لیتا ہے اور اس حکم پر عملدرآمد کرتا ہے۔

امریکہ میں ایوان نمائندگان کی سپیکر نینسی پلوسی نے بھی کہا ہے کہ مشتبہ دہشت گردوں۔ تفتیش کے طریقوں اور زیر حراست افراد پر تشدد کے بارے میں خفیہ ادارے سی آئی اے نے ان۔ جھوٹ بولا تھا۔ نینسی پلوسی کے مشیر نے کہا تھا کہ سپیکر کو سی آئی اے نے تفتیش کے طریقوں اور خاص واٹر بورڈنگ کے بارے میں 2002ء میں بریفنگ دی تھی جب وہ ایران کی انٹیلی جنس کمیٹی کی ا رکن تھیں۔ مشیر نے اس بیان کے بعد سے سپیکر پر اس بارے میں تفصیلات بتانے کے حوالے۔ سخت دباؤ پڑا ہے۔ سپیکر کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اگر ان کو تفتیش کے ان متناز طریقوں کے بارے میں معلوم تھا تو پھر انہوں نے پہلے اس حوالے سے آواز کیوں نہیں اٹھائی؟ ج کے جواب میں سپیکر نینسی پلوسی نے ایک ہنگامی اخباری کانفرنس میں کہا کہ سی آئی اے نے اس وق ان کو پوری بات نہیں بتائی تھی بلکہ ان سے جھوٹ بولا تھا' ان کے مطابق سی آئی اے نے ان سے کہا کہ تفتیش کے دوران واٹر بورڈنگ طریقے کو استعمال نہیں کیا گیا تھا حالانکہ بش انتظامیہ نے اس طر کار کی منظوری دے دی تھی۔ وائٹ ہاؤس نے پچھلے دنوں دستاویز شائع کئے تھے جن میں 002 اور 2005ء کے درمیان مشتبہ دہشت گردوں سے تفتیش کیلئے قانونی حدود مقرر کی گئی تھیں جبکہ پ کے الزام کے بعد خفیہ پریشر میں آکر سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے اس الزام کو غلط قرار دیا ہے۔

سی آئی اے کی جانب سے جاری کردہ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ سی آئی اے نے ایسا نہیں کیا اور ہماری پالیسی یا عمل یہ نہیں ہم کانگریس کو گمراہ کریں یا اس سے غلط بیانی کریں' یہ ہمار قوانین اور اصولوں کے خلاف ہے۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر کا کہنا تھا کہ ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سی آئی اے نے مکمل طور پر کانگریس اور ایوان کو بریفنگ دی تھی اور انہوں نے مشتبہ دہشت

ابوزبیدہ سے تفتیش میں استعمال کئے گئے متعدد طریقوں کا بتایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اب اس معاملے میں جھوٹ اور سچ جاننے کا کام کانگریس کو تمام ریکارڈ اور شواہد کا جائزہ لینے کے بعد کرنا ہوگا جبکہ امریکی ادارے سی آئی اے نے پہلی مرتبہ یہ اعتراض کیا ہے کہ ان کے اہلکاروں نے واٹر بورڈنگ کا متنازعہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے مشتبہ شدت پسندوں کو پانی کے ذریعے تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر امریکی انٹیلی جنس حکومت کے ماتحت کام نہیں کرتیں تو پھر وہ کس کے ایجنڈے کی تکمیل کیلئے کام کر رہی ہیں؟ ڈک چینی اور رمزفیلڈ صیہونی لابی اور ناجائز اسلحہ فروخت والے صیہونی مافیا کے فرنٹ مین کے طور پر بھی مشہور ہیں۔ اب تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر شدت پسندوں نے نہیں بلکہ سی آئی اے کی خفیہ اہلکاروں نے حملہ کیا تھا اور الزام افغانستان پر ڈلا کر وسطی ایشیا کے ذخائر حاصل کرنے کی غرض سے مداخلت کی شروعات کی تھی۔ امریکہ کا خفیہ ادارہ دنیا میں جہاں بھی اپنے فرائض انجام دے رہا ہے' ان کی کارروائیوں کا حکومت کو نہیں بلکہ امریکہ میں موجود صیہونی لابی کو علم ہوتا ہے' جس کی مثال ڈک چینی کے ڈیتھ سکواڈ کی کارروائیاں ہیں۔

جس طرح امریکہ دنیا میں کسی بھی امریکی مخالف ملک کی ترقی کو نہیں دیکھ سکتا اور اس خطے یا ملک کے توازن کو عدم توازن میں بدلنے کیلئے مذموم مکاریوں کا جال بنتا رہتا ہے تاکہ وہ ملک اس کے مقابل آکر اس کی سپر پاور کی حیثیت کو چیلنج نہ کردے۔ امریکہ' یورپ اور صیہونیوں کی مکاریوں کی فہرست تاریخی اعتبار سے کئی صدیوں پر محیط ہے۔ موجودہ دور میں بھی پوری دنیا جنگ وجدل کا جو نقشہ پیش کر رہی ہے وہ بھی انہیں سامراجی طاقتوں کے مفادات کے حصول کی وجہ سے ہے۔ یہ استعماری طاقتیں کسی صورت بھی دنیا میں امن قائم کرنے کے حق میں نہیں۔ اگر کسی بھی خطے میں امن قائم ہوجاتا ہے تو اس خطے میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی مداخلت کا جواز ختم ہوجائے گا جو کہ امریکہ بہادر کیلئے تشویش کا باعث ہے۔ مگر اب عالمی منظرنامے پر تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ امریکہ کی پوزیشن کو چیلنج کرنے کیلئے کئی ممالک عالمی نقشے پر ابھر آئے ہیں اس کی وجہ امریکہ کی ڈوبتی ہوئی اقتصادیات اور مدمقابل ممالک کی مستحکم ہوتی ہوئی معیشت ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ عالمی دانشوروں کے مطابق مستقبل کی عالمی طاقت وہ ملک ہوگا جو وسطی ایشیا اور افریقہ کے قدرتی وسائل پر قابض ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اپنی اپنی پالیسی اور حکمت عملی کے مطابق ان خطوں میں قدم مضبوط کر رہا ہے ان دنوں عالمی سیاست کا گڑھ سنٹرل ایشیا کو کہا جا رہا ہے کیونکہ کچھ عرصہ قبل وسطی ایشیا میں امریکہ اور اس کی اتحادی فوج نیٹو کی اجارہ داری قائم تھی اس کی وجہ روس کا تحلیل ہونا اور اس کی معیشت کا غیر مستحکم ہونا تھا مگر وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ روس نے چین کی مدد سے کافی حد تک اپنی دفاعی صلاحیت اور معیشت کو مض
کرلیا ہے جبکہ عالمی تجزیہ نگار تیسری عالمی جنگ جو گزشتہ عالمی جنگوں سے زیادہ ہولناک اور تباہ کن
رہے ہیں اس کی سرزمین سنٹرل ایشیا یا افریقہ ہوگی اور اس کی وجہ ان خطوں میں موجود تیل و گیس
ذخائر ہوں گے' جو جنگ کی وجہ بننے کے ساتھ عالمی سطح پر بحران بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ ان بدلتے ہو
حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے امریکہ نے بھی اپنی وسطی ایشیا کے حوالے سے پالیسی بدلنے کا سو
ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح افغانستان میں جاری جنگ میں پاکستان کو شامل کر کے سارا
پاکستان حکومت پر ڈال دیا اور خود تماشائی بن کر پاگلوں کی طرح بیان بازی کر رہا ہے۔ سوویت یونین
تحلیل کے بعد امریکہ نے یورپی یونین اور نیٹو کی مدد سے وسطی ایشیا میں براہ راست اثر ورسوخ قائم
تھا مگر چین کی مداخلت اور روس کے دوبارہ مستحکم ہونے سے ان کی مذموم امیدوں پر پانی پھیر گیا۔
جس کی وجہ سے امریکی وصہیونی تھنک ٹینک نے انڈیا کو وسطی ایشیا میں اپنے مہرے کے طور پر استع
کرنے کی حکمت عملی ترتیب دے دی ہے جس کا ثبوت امریکہ کے ضرورت سے بڑھ کر انڈیا کے سا
دفاعی معاہدے کرنا اور اقتصادی لحاظ سے اس کو مضبوط کر کے چین کے مدمقابل لانا ہے۔ سوویت یو
کی تحلیل سے پہلے انڈیا امریکہ کا نہیں بلکہ روس کا سب سے بڑا اتحادی مانا جاتا ہے اور اس کے روس
ساتھ گہرے تعلقات تھے اور روس سے اسلحہ کی خرید وفروخت کا سب سے بڑا ڈیلر بھی انڈیا ہی تھا۔

سوویت یونین کی تحلیل کے بعد انڈیا نے روس سے الگ ہونے والی ریاستوں
ساتھ مفادات کی بنیاد پر روس کو بائی پاس کر کے تعلقات استوار کرنے کی کوششیں شروع کر د
1991ء اور 1992ء میں انڈیا نے باقاعدہ قازقستان' کرغرستان' تاجکستان' ترکمانستان
ازبکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ انڈیا کے وسطی ایشیا کے ممالک کے ساتھ
الفور تعلقات قائم کرنے کی سب سے بڑی وجہ پاکستان کی ان ممالک تک رسائی کو روکنا تھا
پاکستان ان ممالک کے ساتھ مل کر انڈیا اور روس کے خلاف کوئی نئی جماعت بندی نہ کرے۔

1993ء میں اس وقت کے وزیراعظم ''پی وی نرسیما راؤ'' نے ازبکستان
قازقستان کا دورہ کیا تھا اور امداد کے ساتھ ساتھ توانائی کے مختلف معاہدوں کی بنیاد رکھی تھی جس
فروری 1995ء میں قازقستان کے وزیر دفاع نے انڈیا کا دورہ کیا اور انڈیا کے ساتھ د
معاہدوں پر بات چیت کی۔ اس وقت انڈیا کا صرف مقصد پاکستان کی سنٹرل ایشیا کی مداخل
روکنا تھا جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ 1992ء میں انڈیا

افغانستان میں مارکسٹ حکومت کو سپورٹ بھی کیا تھا تا کہ افغانستان میں اسلام پسند جماعت نہ
آجائے جو پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے انڈیا کیلئے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ انڈیا کے روس کے ساتھ تعلقات 5 سے 6 دہائیوں پر
محیط ہیں۔ انڈیا روس کا دوست رہا ہے جس طرح اب چین اور روس ایک ساتھ ہیں لیکن سوویت
یونین کی تحلیل کے بعد انڈیا نے روس کی بجائے آزاد اسلامی ریاستوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنا
شروع کر دیئے تھے اور روس کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سرد جنگ کا دور تھا۔ سرد جنگ کے
خاتمے کے بعد روس نے چین اور ایران کے ساتھ براہ راست تعلقات بنا لئے اور انڈیا کو تنہا چھوڑ
دیا۔ امریکہ نے یہ موقع غنیمت جان کر کھلم کھلا انڈیا کے ساتھ اسرائیل کی مدد سے یارانہ بنا لیا تھا۔
اس سے پہلے پس پردہ اسرائیل اور امریکیوں کے ساتھ انڈیا کے قریبی تعلقات موجود تھے جس کی
مثال 1971ء میں انڈیا کے دباؤ کے تحت امریکہ نے پاکستان کی امداد روک دی تھی۔ ایشیائی خطے
میں انڈیا امریکہ کیلئے اسرائیل جیسا کردار ادا کرنے کیلئے سب سے زیادہ موزوں ملک ہے۔ عالمی
منظرنامے پر چین کی بڑھتی ہوئی اقتصادیات اور متوقع سپر پاور بننے کے ڈر سے انڈیا کو بھی مستحکم کیا
جا رہا ہے۔ چین نے وسطی ایشیا میں اپنا اثر ورسوخ اپنی پرامن اور خوشحال پالیسیوں کی وجہ سے قائم
کر لیا ہے جس کی وجہ سے سنٹرل ایشیا کی ریاستیں اور روس نے چین پر اعتماد ظاہر کر دیا ہے۔ امریکہ
اب براہ راست وسطی ایشیا میں مداخلت سے کترا رہا ہے کیونکہ اس گریٹ گیم میں مین ٹیمیں تین
ہیں۔ امریکہ جس کا جغرافیائی لحاظ سے وسطی ایشیا سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس کی کوئی سرحد بھی ان
ممالک سے نہیں ملتی' دوسری طرف چین اور روس ہیں جن کا جغرافیائی لحاظ سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ان
کی سرحدیں وسطی ایشیائی ممالک سے ملتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی ان ممالک تک رسائی آسان ہے۔

تاجکستان امریکی گیٹ گیم میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس سنٹرل
ایشیا کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ وسطی ایشیا میں داخل ہونے کیلئے تاجکستان دروازے کی سی حیثیت
رکھتا ہے۔ دوسرا اس ملک کی سرحد چینی صوبے Xinjiang سے ملتی ہے۔

تیسری بات اس علاقے میں امریکہ دہشت گرد تنظیموں کو تیار کر رہا ہے جو چین میں
فسادات پھیلا رہی ہیں تا کہ چین کا ایجنڈا وسطی ایشیا کے حوالے سے متاثر ہو۔ یہ علاقہ پورے وسطی
ایشیا کے پانی کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور وسطی ایشیا میں منشیات کی سمگلنگ کا سب سے اہم راستہ بھی
ہے اور سب سے اہم بات کہ سوویت یونین کے دور میں روس کا سب سے اہم' مضبوط اور بڑا فوجی
اڈا بھی اسی علاقے میں تھا جس وقت روس نے چین کے ساتھ مل کر علاقائی تعاون کی تنظیم

(SCO) کی بنیاد رکھی امریکہ تشویش میں مبتلا ہوگیا جبکہ روس نے وسطی ایشیائی ممالک سے مل
خطے میں نیٹو کی طرز کی ایک نئی فوج متعارف کروائی ہے جس کو سسٹو (CSTO) کا نام دیا ہے ج
مضبوط کرنے میں چین پس پردہ امداد فراہم کر رہا ہے اور سسٹو علاقے میں نیٹو کے توسیع پسند
عزائم میں سے بڑی رکاوٹ پروف ہو رہی ہے لہٰذا یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ (SCO) اور (CSTO
نے سنٹرل ایشیا میں امریکہ، نیٹو اور یورپی یونین کا اثر زائل کر دیا ہے۔ روس اور چین کے مضبوط اتح
کی سب سے بڑی وجہ نیٹو کی وسطی ایشیا میں مداخلت اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم بنی۔ ماضی
سابق امریکی صدر نکسن اور نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر ہنری کسنجر اس اتحاد کو توڑنے کیلئے بھرپور کوشش
کرتے رہے ہیں۔ امریکہ اب تک اس کاوش میں لگا ہوا ہے کہ کسی نہ کسی طرح شنگھائی تعاون تنظیم
کمزور کیا جائے جس کیلئے انڈیا سب سے کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے۔ اس مقد
کیلئے امریکہ بھارت کی معیشت کو بڑھا رہا ہے۔ اس وقت انڈیا کی اقتصادیات امریکہ کے مقابلے
بہت کم ہے۔ بھارت کی معیشت ایک ٹریلین ڈالر جبکہ امریکہ کی معیشت 14 ٹریلین ڈالر پر محیط ہے

امریکہ کی افغان پالیسی تھنک ٹینک کی سوچ سے زیادہ امریکی مفادات کیلئے خطرناک
ثابت ہو رہی ہے۔ آٹھ سال پر محیط اس جنگ میں امریکہ اور مغربی استعماری طاقتوں کو کوئی خا
خواہ فائدہ نہیں بلکہ جانی و مالی نقصان ہی اٹھانا پڑا ہے۔ اس پالیسی کے س پردہ وسطی ایشیائی مما
کے قدرتی وسائل ہی ہیں جن تک رسائی امریکہ کا مقصد ہے جس کے حصول کیلئے خطے کو عدم استح
پر مزید گامزن کرنے کیلئے بھارت کے ساتھ نیوکلیئر معاہدے اور اقتصادی طور پر چین کے مقا
کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ بھارت، ایران اور پاکستان گیس پائپ لائن کا معاہدہ اس با
کا ثبوت ہے کہ اب بھارت وسطی ایشیا میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

امریکہ پاکستان پر اس گیس معاہدے کے حوالے سے دباؤ ڈال رہا ہے کہ بھار
زیادہ سے زیادہ ریلیف دے سکے۔ حال ہی میں بھارت کے وزیر پٹرولیم کا دورہ آذربائیجان
اسی امریکی پالیسی کا حصہ ہے۔ اس دورے کے دوران تیل کی ترسیل کے معاہدوں کی کوشش
اور بھارت نے براہ راست تیل و گیس سے مالا مال بحیرہ قزوین کے اس علاقے میں مداخلہ
عندیہ دے دیا ہے۔ اس معاہدے کے تحت بھارت تیل بحری جہازوں کے ذریعے لے گا
اسرائیل کی بندرگاہ سے ہوتے ہوئے مقررہ مقام تک جائیں گے۔ اس امر میں عرب لیگ او
آذربائیجان نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے جس پر بھارت کوئی متبادل راستہ تلاش کر رہا ہے
امریکی تیل کی کمپنی انوکال (UNOCAL) کے تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور وسطی ایشیا

جیکٹس چل رہے ہیں۔ اس وقت وسطی ایشیا میں اس امریکی کمپنی کے چھ ہزار ملازمین کام کر رہے
ں جبکہ دوسری طرف دنیا کی تیسری بڑی تیل کی چینی کمپنی (CNOOL) ہے جو (UNOCAL)
ا اس وقت ہر میدان میں شکست دے رہی ہے جس کی وجہ سے امریکہ نے بھارت کی کمپنیوں کے
ریعے وسطی ایشیا میں تیل و گیس کی ترسیل کے معاہدے کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ دوسری طرف
غانستان میں بھارت کے سفارتخانوں کے ساتھ ساتھ فوجی اڈے بھی قائم کئے جا چکے ہیں۔ جہاں
را، موساد اور سی آئی اے، چین، روس اور پاکستان مخالف تخریب کاریوں میں مصروف ہیں۔ بھارت
نے تاریخ میں پہلی بار باقاعدہ فوجی بیس کیمپ تاجکستان میں قائم کر دیا ہے جو کہ وسطی ایشیا میں موجود
عارت کے کئے گئے معاہدوں کی حفاظت کرے گا۔

انڈیا کو وسطی ایشیا میں ہر دو سہولت اور ریلیف دیا جا رہا ہے جو کہ امریکہ نیٹو کو فراہم کر رہا ہے
تاکہ نیٹو کے ساتھ ساتھ بھارت بھی امریکی مفادات کی جنگ لڑ سکے۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کو
خوشگوار بنانے کیلئے امریکہ بھارت کی بجائے پاکستانی انتظامیہ پر دباؤ ڈال رہا ہے تاکہ بھارت کو وسطی
ایشیاء میں مداخلت کے دوران پاکستان کی طرف سے مذمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چین نے بھارت
کی شنگھائی تعاون کی تنظیم میں بطور مبصر شمولیت کی مخالفت نہیں کی کیونکہ چین کی پالیسی ہے کہ

"Keeping its friends close, but its enemies closer"

ترجمہ: ''دوستوں کو قریب لاؤ لیکن دشمنوں کو قریب تر''

اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ چین بھارت کی جارحانہ مکاریوں پر نظریں لگائے ہوئے
ہے۔ چین کو پتہ ہے کہ بھارت اس کا کبھی بھی دوست نہیں ہوسکتا مگر عالمی سفارتی منظرنامے پر
بھارت کے ساتھ تعلقات کو چین اہمیت لازمی دے رہا ہے۔ اس وقت دنیا کی تمام ابھرتی ہوئی
طاقتوں کی نظر وسطی ایشیا پر ہے کیونکہ روس اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن بڑی تیزی سے بحال کر رہا ہے۔
یہ ایک خطرہ ہے کہ سرد جنگ سے حاصل ہونے والی ریاستوں پر روس پھر سے نہ قبضہ کرے اور دنیا
کی سپر پاور نہ بن جائے۔ عالمی تجزیہ نگار بھارت کو امریکہ کا آخری حربہ قرار دے رہے ہیں کیونکہ
حالات وواقعات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ نیٹو اور یورپی یونین وسطی ایشیا میں چین اور روس
کے آگے بے بس ہو چکی ہیں اب بھارت ہی ہے جو امریکہ کے قدم وسطی ایشیا میں مضبوط کر سکتا ہے
جس کیلئے امریکہ نے بھارت کو مضبوط کرنے کی حکمت عملی پر تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔
امریکہ پاکستان کو بھی وسطی ایشیا کی گریٹ گیم کے حوالے سے استعمال کر رہا ہے۔ پاکستانی انتظامیہ کو
بھی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے وسطی ایشیا کے حوالے سے اپنی واضح پالیسی ترتیب دینی چاہیے۔

سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی (CIA)

سی آئی اے کا نام دوسری جنگ عظیم کے بعد خصوصاً (Cold-War) کے دنوں
بہت تیزی سے دنیا کے سامنے آتا ہے۔ ایک دور تھا جب سی آئی اے اور روسی انٹیلی جنس ا
کے جی بی ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹول کرتے رہے تھے۔ ان دونوں ایجنسیوں کی آپ
چپقلش سے تیسری دنیا کے کمزور ممالک کا بھی موج میلہ لگا رہتا تھا لیکن ایک وقت ایسا آیا
روس کا دماغ خراب ہوا وہ افغانستان پر چڑھ دوڑا اور امریکہ کے لئے ویت نام کا قرض بم
وصول کرنے کا سنہری موقعہ ہاتھ آ گیا۔ پاکستان میں اِلّا ماشاالله ہمارے امیر المومنین جنرل
الحق سر پر آرائے تخت ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے امریکہ اور روس کے بجائے اسلام اور
جنگ بنا دیا۔ ساری دنیا کے مجاہدین پاکستان کے گلے لگ گئے۔ انہوں نے ہمارے ہار
مجاہدین کی ایک فوج ظفر موج کھڑی کر دی۔ سائیکل سے پجارو تک ہمارے ان پاکستانی مجا
نے جس تیزی سے سفر کیا اس پر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ قصہ کوتاہ! ہم نے جہاد کیا، ا
نے ثمرات سمیٹے، روس کے ٹکڑے ہوئے اور پاکستان کو دہشت گردی کے ایندھن میں جھو
امریکی یہاں سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے بعد میں تمسخر اڑاتے ہوئے اسے سی آئی ا
شاندار کارنامہ قرار دیا۔ سی آئی اے کو جاننے کے لئے اس کے ڈھانچے کا مختصر جائزہ پیش ہے

جنگ عظیم دوم سے پہلے امریکہ کے پاس سراغ رسائی کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں
صرف سفارتی ذرائع پر ہی انحصار کیا جاتا تھا اور ان ہی سے معلومات حاصل کر کے پالیسی مرتب
جاتی تھی، لیکن جنگ عظیم دوم میں امریکیوں کو اپنی اس کمزوری کا بڑی شدت سے احساس
جنرل آئزن ہاور جو اتحادیوں کا سپریم کمانڈر تھا، نے اس صورت حال پر کڑی تنقید کی، اس۔
کہ سراغ رسانی کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہ ہونے کے باعث جنگی حکمت عملی متاثر ہو رہی ہے،
امریکیوں نے اپنی اس کمزوری کا ازالہ کرنے کے لئے 1941ء میں ''وی سٹریٹیجک سروسز''
نام سے ایک محکمہ کی بنیاد رکھی، کئی امریکی ماہرین کو اس محکمے کو چلانے کے لئے بھاری

معاوضوں پر رکھا گیا مگر ان میں سے کوئی بھی مناسب کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکا، چنانچہ اس محکمہ کو ختم کرنا پڑا۔

1946ء میں ایک نئے ادارے ''سنٹرل انٹیلی جنس گروپ'' کا قیام عمل میں لایا گیا جس کو بعد میں ''سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی'' (سی آئی اے) کا نام دے دیا گیا۔

اس کے قیام کا مقصد دنیا کے مختلف ممالک سے معلومات اکٹھی کر کے وہاں کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرنا تھا، مختلف آپریشنز ترتیب دینا تھا، اس سب کچھ کا مقصد امریکی مفادات کی سلامتی کو یقینی بنانا تھا۔

نیشنل سیکورٹی کونسل، صدر اور سی آئی اے ایک تکون کی شکل میں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے معاملات سرانجام دے رہے ہیں، اوّل الذکر دونوں ادارے سی آئی اے کو اپنا دماغ، آنکھیں اور کان قرار دیتے ہیں، ان تینوں اداروں کی رہنمائی کے لئے ایک اور ادارہ موجود ہے جسے سینٹ کہا جاتا ہے، صدر سینٹ کے دو ڈائریکٹر صاحبان کی منظوری سے سی آئی اے کے ڈائریکٹر اور اس کے نائب کا تقرر کرتا ہے۔ ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر کے نیچے ایک پورا جال ہے جو سارے امور کو سرانجام دیتا ہے، یہ حال صرف امریکہ تک محدود نہیں ہے بلکہ شاخ در شاخ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ سی آئی اے کے کارندوں نے مختلف ممالک میں وہاں کے اہم اور نمایاں افراد کو کسی نہ کسی شکل میں اپنے کنٹرول میں لے رکھا ہے۔ مال و دولت کا لالچ، بلیک میلنگ، دھونس سب سی آئی اے کے ہتھیار ہیں، آغاز میں سی آئی اے کے لئے جو مقاصد طے کئے گئے تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقاصد میں اضافہ ہوتا چلا گیا، پھر بات صرف جاسوسی تک ہی محدود نہ رہی بلکہ مستقبل میں پوری دنیا کو اپنے زیر نگیں لانے کے ایجنڈے پر کام شروع کر دیا۔

جنگ عظیم دوم میں روس، امریکہ کا اتحادی تھا۔ اس جنگ میں دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو گئے اور جنگ کے بعد دونوں ہی ایک دوسرے کو حریف سمجھنے لگے۔ دونوں قوتوں نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا، اس موقع پر سی آئی اے نے روس کے خلاف سرد جنگ کا آغاز کر دیا، یہ جنگ کئی دہائیوں تک لڑی گئی۔ سی آئی اے نے اپنی سرگرمیوں کا نشانہ روس کو ہی نہیں بنایا بلکہ کئی دوسرے ممالک بھی اس کا شکار ہوئے۔

برطانوی اخبار ''گارڈین'' نے سی آئی اے کے متعلق ایک جامع تبصرہ تحریر کیا ہے جس

کے مطابق یہ ادارہ دنیا کا سب سے زیادہ بے رحم اور عالمی جاسوسی نظام کا اتنا مضبوط اور طاقتو
ادارہ ہے کہ جس کا کوئی ثانی نہیں۔اس کی خفیہ سرگرمیوں اور سازشوں سے دنیا کا کوئی گوشہ محفوظ
نہیں ہے۔اس کا سالانہ بجٹ اٹھائیس ارب امریکی ڈالر ہے۔اب یہ بجٹ کئی گنا بڑھ چکا ہے،
ایک صد سے زائد ملکوں میں خفیہ ایجنٹ بھاری بھرکم معاوضوں پر کام کرتے ہیں۔

(گارڈین.....26/اکتوبر 2001ء

سی آئی اے کی سرگرمیوں کو ''باب وڈورڈ'' نے اپنی کتاب ''سی آئی اے کی خفیہ
جنگیں'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔باب وڈورڈ ''واشنگٹن پوسٹ'' سے وابستہ ایک
ریسرچ سکالر ہے۔یہ وہی صحافی تھا جس نے ''واٹرگیٹ سیکنڈل'' کے انکشافات میں کلیدی کردار
ادا کیا تھا، جس کے باعث صدر نکسن کو شدید خفت کا سامنا کرتے ہوئے مستعفی ہونا پڑا۔اس کتاب
میں سی آئی اے کی دنیا کے دس علاقوں میں جاری سرگرمیوں پر بحث کی گئی ہے، مصنف نے سی آئی
اے کو ایک دہشت گرد تنظیم قرار دیا ہے جس کا نشانہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک بنے ہیں۔

جونہی یہ خفیہ ایجنسی کا قیام عمل میں آیا، یہودیوں نے اس کو ایک نعمت سمجھتے ہوئے اس
پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی۔آج اس کے تمام اہم عہدے یہودیوں کے پاس ہیں، جبکہ
غیر اہم عہدیداران کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔

اس خفیہ ایجنسی نے اگر مخالف لیڈروں کو اپنا نشانہ بنایا ہے تو دوست لیڈر بھی اس
شر سے محفوظ نہیں رہے، بعض ملکوں کے حکمران باقاعدہ طور پر سی آئی اے کے تنخواہ دار ملازم تھے
''وڈورڈ'' کے مطابق تیسری دنیا کے کچھ منتخب ممالک میں سی آئی اے نے اپنے عمل دخل
اضافے کئے ان ممالک کے حکمرانوں کو جدید مواصلاتی نظام کے قیام کے سلسلہ میں مدد دینے
ان کے اپنے تحفظ کو مستحکم کرنے کی پیشکش کی، پہلے اچھی طرح خوف زدہ کر کے اس کے بعد
تعاون اور حفاظت کا یقین دلانے کا طریقہ بہت سے ممالک میں کامیاب رہا، جن حکمرانوں
خوف زدہ کرنے کے بعد سی آئی اے نے اپنے تحفظ کا یقین دلایا، یہ سارے حکمران سازشوں
ذریعے حکومت میں آئے تھے۔اس لئے نفسیاتی طور پر انجانے خوف کا شکار رہتے تھے، اسی خوف
بھانپتے ہوئے سی آئی اے نے ان کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے تحفظ کی پیشکش کی تو انہوں
اپنے سارے دروازے اس کے لئے کھول دیئے، یوں تیسری دنیا کے صدر دفاتر اور رہائش گا
میں سمعی آلات نصب کر دیئے جاتے تھے اور ان کے عملے کے بیشتر افراد کو بھی خرید لیا جاتا تھا

حکمرانوں نے سی آئی اے کی طرف سے سلامتی پر مبنی پیشکش کا فائدہ اٹھایا ان میں لبنان کے صدر
امین جمائل، مصر کے صدر انور سادات اور موجودہ حسنی مبارک، سوڈان کے صدر جعفر النمیری، چاؤ
کے صدر حسین ہبرے، لائبیریا کے صدر سموئیل وڈ اور ال سلویڈور کے صدر جوز نپولین دورائے
شامل ہیں۔

مصر کے صدر انور سادات کی درخواست پر امریکیوں نے ان کی ذاتی سلامتی کی ذمہ
داری قبول کی، اس کے لئے سی آئی اے نے نہ صرف انکے ذاتی محافظوں کو تربیت کے نام پر
امریکہ میں مختلف کورسز کروائے بلکہ ایک نیا حفاظتی یونٹ بھی قائم کیا جس کو بین الاقوامی دہشت
گردی سے نمٹنے کے لئے خصوصی طور پر ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا۔اسی یونٹ میں سی آئی
اے کے ایک امریکی ملازم جان فز کی ڈیوٹی صدر انور سادات کے دفتر میں لائی گئی۔وہ صدر کی
سلامتی اور تحفظ سے متعلق امور نمٹانے کا ذمہ دار تھا، اس نے صدر کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے ملک
کے سیاسی و غیر سیاسی اور دفاعی نوعیت کے معاملات تک رسائی حاصل کر لی، لبنان کے مقتول صدر
بشیر جمائل سی آئی اے کے تنخواہ دار تھے، انہیں عیسائی ملیشیاء کے لئے ایک کروڑ ڈالر کی خفیہ امداد
فراہم کی گئی، اسی طرح السلویڈور کے صدر جوز نپولین دورائے پر بھی سی آئی اے مکمل بھروسہ کرتی
تھی۔سی آئی اے میں ان کا درجہ مخبر سے زیادہ اور ایجنٹ سے کم تھا، 1983ء میں بیروت میں
امریکی سفارت خانے میں بم دھماکے کے بعد جو لوگ پکڑے گئے تھے ان سے سی آئی اے ہی کے
لوگوں نے تفتیش کی تھی، دوران تفتیش ایک مشتبہ شخص ہلاک ہو گیا تھا۔

سی آئی اے کا اگر ایک روپ دوستی کا تھا تو دوسرا دشمنی پر مبنی تھا۔اس نے اپنے مقاصد
کی تکمیل کی خاطر مختلف حکمرانوں کے تختے الٹنے میں مرکزی کردار ادا کیا اور بعض حکمران قتل کروا
دیئے گئے۔شام میں اس سلسلے کی پہلی کارروائی کی گئی، اس کے بعد 1954ء میں ایران میں قوم
پرست ڈاکٹر مصدق کا تختہ الٹ کر اس کی جگہ رضا شاہ پہلوی کو مسند اقتدار پر بٹھا دیا گیا۔ڈاکٹر
مصدق کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایران میں تیل کے حوالے سے کچھ ایسے فیصلے کر بیٹھے تھے جو امریکی
مفادات سے متصادم تھے، 1955ء میں مصر میں جمال عبدالناصر کو قتل کروانے کی سازش کی گئی،
حالانکہ اسی جمال عبدالناصر کو ایوان اقتدار میں لانے والی بھی سی آئی اے تھی، سی آئی اے کا وطیرہ
ہے کہ وہ اپنے لائے ہوئے آدمی کو بھی زیادہ دیر تک برسر اقتدار نہیں رہنے دیتی، جب اسے محسوس
ہوتا ہے کہ اس کا بندہ اپنے پاؤں مضبوط کر رہا ہے اور اسی مضبوطی کے باعث آنے والے دنوں

میں وہ اکڑ سکتا ہے تو اسے ایوان اقتدار سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ پاکستان اس کی بہترین م
ہے۔

انڈونیشیا کو سامراج سے آزادی دلانے میں وہاں کی اسلامی تحریک کا کردار مرکزی
نمایاں تھا لیکن اقتدار سوئیکارنو کو اقتدار سونپ دیا گیا، اسی سوئیکارنو کے خلاف سی آئی ا
نے 1960ء کی دھائی کے وسط میں بغاوت کروائی، فوج کے آٹھ اعلیٰ ترین جرنیلوں کا خون
گیا اور اس کے بعد سی آئی اے نے اپنی حفاظتی چھتری کے سائے میں سہارتو کو 32 برس تک ہ
بنائے رکھا۔ 1990ء کی دھائی میں سہارتو کے خیالات بدلنے لگے تو ان کے خلاف سیکنڈلز کی
مار ہوگئی اور پھر وہ بھی رخصت ہو گئے۔

1969ء میں امریکہ نے لیبیا میں بغاوت کروائی اور معمر القذافی کو اقتدار پر فائز
گیا مگر آنے والے دنوں میں سی آئی اے کو احساس ہو گیا کہ قذافی ان کے کام کا نہیں ہے، چنا
ان کو اقتدار سے محروم کرنے کی سازشیں ہونے لگیں، صدر ریگن کے دور حکومت میں بھی قذافی
حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی، اس کے لئے سی آئی اے کے ذریعے پروپیگنڈہ کی ایک خ
اور انتہائی غیر معمولی مہم چلائی گئی کہ امریکہ لیبیا پر حملہ کرنے والا ہے، حملے کا مقصد کرنل قذافی
خلاف بغاوت کرنا تھا، یہ خفیہ منصوبہ وائٹ ہاؤس میں منعقدہ ایک اجلاس میں منظور کیا گیا، ا
منصوبے کا خاکہ صدر ریگن اور ان کے مشیر جان ایم یولڈیکسٹر نے پیش کیا تھا، منصوبے کے مطا
صدر قذافی کو یہ باور کروایا جاتا تھا کہ ان کے سرکردہ مشیر اور ساتھی وفادار نہیں ہیں جبکہ دوسر
طرف ان کے مشیروں اور ساتھیوں کو قذافی کے خلاف بھڑکایا گیا، لیکن جب یہ ساری سازش
ثمر آور نہ ہو سکی تو امریکہ نے جھنجھلا کر 1986ء میں ان کی رہائش گاہ پر بموں کے ساتھ حملہ کروا
جس کے نتیجے میں خود قذافی بچ گئے مگر ان کی بیٹی شہید ہو گئی۔

1975ء میں عراق میں صدر حسن البکر کے خلاف صدام حسین سے بغاوت کروا
گئی، صدام کی صورت میں سی آئی اے کو ایک کام کا آدمی مل گیا تھا، چنانچہ 1979ء میں ایرا
میں انقلاب برپا ہوا تو امریکہ نے صدام کو ایران پر چڑھائی کی ترغیب دی، سی آئی اے کے سربر
ولیم کیسی نے اپنے آلہ کار سینئر عراقی افسروں پر زور دیا کہ وہ ایران پر حملہ کر دیں کیونکہ امریکہ محسو
کرتا تھا کہ آیت اللہ خمینی کا ایران اس کے لئے خطرہ بن سکتا ہے اور خلیجی وسائل پر قبضہ کر سکتا ہے
اس لئے امریکہ نے عراق کے ساتھ سات برس تک اس جنگ میں الجھائے رکھا، اسی دوران

آیت اللہ خمینی کے مخالف جلاوطن رہنماؤں سے رابطہ کر کے انہیں وہ تمام وسائل فراہم کئے جن
کے ذریعے خمینی کی حکومت کا تختہ الٹا جا سکتا تھا۔

سی آئی اے کی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے اصول پر مبنی ہے۔ اس لئے اس نے
خلیجی ممالک کو بھی ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے میں ہمیشہ محنت سے کام لیا، ایک طرف ریگن
انتظامیہ عراق کے ساتھ بہتر تعلقات کی دعویدار تھی اور اس کے ذریعے ایران کو کمزور کرنے کی ہر
ممکن کوشش کی گئی جبکہ دوسری طرف عراق کے صدام حسین کا تختہ الٹنے کا منصوبہ ایران کو پیش کیا
جاتا رہا، اس مقصد کی خاطر ایران کو خفیہ طور پر اسلحہ فراہم کیا گیا۔

سی آئی اے نے بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی نگرانی اور جاسوسی کی جب اس کا
علم اندرا گاندھی کو ہوا تو ان کو بہت رنج ہوا مگر جب سی آئی اے کے اعلیٰ حکام نے انہیں سمجھایا کہ یہ
ان کی حفاظت اور سی آئی اے کے مفاد کا معاملہ ہے تو وہ خاموش ہو گئیں، بظاہر اندرا گاندھی کی
سیاست روس نواز تھی مگر انہیں اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے سی آئی اے کا آلہ کار بننا پڑا۔ انہوں نے
کمیونسٹ پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لئے سی آئی اے سے براہ راست رقم وصول کی، اندرا گاندھی
نے سی آئی اے کو ذاتی طور پر اختیار دیا کہ وہ چین کے خلاف جاسوسی کی غرض سے ان بھارتی
علاقوں کو استعمال کر سکتے ہیں جو چین کی سرحد سے ملحق ہیں، چین بھارت اور امریکہ دونوں کا
مشترکہ دشمن ہے۔ اس لئے دونوں ممالک کا اشتراک عمل حیرت انگیز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ
اشتراک عمل ہر بھارتی حکمران نے برقرار رکھا، بی جے پی کی حکومت جب اپوزیشن میں تھی تو
امریکی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی مہمات چلاتی تھی مگر یہی بی جے پی کی حکومت اقتدار
میں امریکہ کے تلوے چاٹتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔

سی آئی اے نے مسلمان ممالک کے اتحاد کی ہر کوشش کو ناکام بنایا، اس اتحاد کے حامی
سعودی فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز کو ان کے بھتیجے کے ہاتھوں شہادت کے پیچھے آنے والے
دنوں نے سی آئی اے کے ہاتھ بے نقاب کر دیئے تھے، یہی ہاتھ آج بھی مسلمانوں کو منقسم رہنے پر
مجبور کر رہے ہیں۔

اس وقت بہت سے مسلمان ممالک کے حکمران ان خفیہ ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں جو
مسلمان حکمران عرب قومیت کے سحر میں مبتلا تھے۔ ان کے گھروں میں عیسائی ازواج داخل کر دی
گئیں اور یہی عیسائی خواتین ان حکمرانوں کے سیاسی فیصلوں پر پوری طرح اثر انداز ہوتی رہیں۔

ان حکمرانوں کے فیصلے دراصل سی آئی اے کے ایجنڈے کی تکمیل کا باعث بنتے رہے جس کے مطابق سی آئی اے پوری دنیا کو ایک حکومت کے تحت ملانا چاہتی ہے۔اس حقیقت کے ثبوت آج بڑے واضح طور پر دیکھنے کو مل رہے ہیں کہ جب امریکہ اور برطانیہ افغانستان پر حملہ آور ہیں لیکن ان حملوں کی قابل قبول وجوہات بیان کرنے سے بھی قاصر ہیں اس کے باوجود مسلمان حکمران ان حملوں کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

افغانستان کے حوالے سے امریکہ ایک عرصہ سے کئی خواب دیکھنے میں مصروف تھے۔ افغانستان کے لئے سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں آج سے بیس بائیس برس قبل ایک منصوبہ منظور ہوا تھا یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب افغانستان مکمل طور پر روس کی گود میں چلا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں لوگوں نے کلہاڑیوں، ڈنڈوں اور بالکل دیسی قسم کے اسلحہ سے جہاد کا آغاز کر دیا تھا پاکستان کی حکومت نے بھی روس کے خطرے کو اپنے سر پر دیکھتے ہوئے متحرک کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔سی آئی اے کے منصوبے کے مطابق امریکہ نے روسی اثرات کو روکنے کے لئے پاکستان کے کردار کی تعریف کی اور بھرپور امداد کا یقین دلایا، امریکہ کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھ مضبوط کر کے ان کے ذریعے روس کو ایک عرصہ تک افغانستان کی سرزمین پر الجھایا جائے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سوویت یونین بے وقار ہوگی اور اس کی معیشت تباہ حال ہو جائے گی۔روس دس برس تک افغانستان میں افغان مجاہدین کے ہاتھوں زخم زخم ہوتا رہا، بالآخر شکست کا تمغہ لے کر واپس اپنی سرزمین پر لوٹ گیا لیکن اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکا۔ معیشت کی تباہی اور رعب و دبدبے، وقار و عزت کے پامال ہو جانے کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ درجن ریاستوں نے آزادی کا اعلان کر دیا۔

اب افغانستان میں مسند اقتدار ان لوگوں کی راہ تک رہی تھی کہ جو اپنے پندرہ لاکھ ساتھیوں اور دوستوں سے محروم ہو چکے تھے۔افغانستان میں جہاد کی نئے سرے سے بنیاد رکھنے والی حزب اسلامی تھی مگر سی آئی اے کے ایجنٹوں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق حزب اسلامی کو اختلافات کا شکار کر دیا، مختلف کمانڈوں کو ایک دوسرے سے متنفر کر دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے نئے گروپ سامنے آنے لگے، برہان الدین ربانی، مولوی یونس خالص، عبدالرب رسول سیاف سمیت مختلف لوگوں نے اپنے الگ الگ گروہ بنا لئے، اس گروپنگ کے نقصان کا احساس اس وقت شدت کے ساتھ ہوا جب جہاد افغانستان کے اثرات سمیٹنے کا وقت تھا، روسی فوجوں کی واپسی

کے بعد مسند اقتدار کے خواہش مند کئی گروہ سامنے آ گئے، سی آئی اے نے پاکستان کے حکمرانوں کے ذریعے کابل کے صدارتی محل میں کمزور ترین افراد کو بٹھا دیا جو اپنی محدود ترین افرادی قوت کی وجہ سے پورے افغانستان کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔یوں پورا افغانستان مختلف جہادی تنظیموں کے زیر تصرف آ گیا، اب منصوبے کا اگلا مرحلہ طالبان کی شکل میں سامنے آیا، سی آئی اے کا یہ سارا منصوبہ خدائی منصوبہ نہیں تھا کہ اس میں کی گئی ہر تدبیر کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی، طالبان کو سامنے لانے کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کی سخت گیر پالیسیوں کی وجہ سے افغانی عوام کے اوپر ظاہر شاہ کی حکومت ایک مرتبہ پھر قائم کر دی جائے، لیکن امریکی تدبیر یہاں الٹ ہو گئی، طالبان حکومت نے اگرچہ سخت گیر پالیسیوں سے کام لیا لیکن افغانستان کے نوے فیصد علاقے میں امن و امان بحال کر کے وہاں شرعی حکومت کو استحکام دینا شروع کر دیا، امریکہ نے افغانستان پر پابندیاں لگا کر مستحکم ہوتی ہوئی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اب امریکہ کی ہر تدبیر الٹ ہو رہی تھی، منصوبے کا تیا پانچہ ہونے کا خدشہ تھا۔اس لئے امریکہ نے افغانستان پر جارحیت مسلط کر دی جبکہ دوسری طرف طالبان کی سرپرست پاکستانی حکومت کو سرپرستی سے دست کش ہو جانے کو کہہ دیا، سی آئی اے نے افغانستان کے حوالے سے اپنے منصوبے کی تکمیل ظاہر شاہ کی حکومت کی صورت میں کرنی تھی لیکن افغانستان میں تمام جہادی تنظیموں کا دوبارہ اتحاد اور پوری پاکستانی قوم کا طالبان کی پشت پر کھڑا ہو جانے سے سی آئی اے کی ساری محنت پر پانی پھر جانے کا خدشہ تھا، اس لئے وہ ہر قیمت پر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی جس کا منطقی انجام ''نائن الیون'' ہوا۔

پاکستان کے وجود میں مذکورہ بالا بیماریاں پیدا کرنے کے لئے پاکستانی متعین امریکی سفیر ہر لحہ مصروف رہے ہیں، چند ماہ قبل ایک رپورٹ منظر عام پر آئی تھی، جس میں کئی حیران کن انکشافات کئے گئے تھے، اس رپورٹ کے مطابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی صورت میں متحدہ پاکستان امریکہ کے لئے سخت پریشانی کا باعث تھا، اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے امریکی اس وقت کے پاکستانی گورنر جنرل غلام محمد سے کام لے ہی رہے تھے لیکن اس کے لئے انہوں نے اپنے سفیر کو وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کے پاس بھی بھیجا تا کہ ان کو بھی اعتماد میں لیا جا سکے، امریکی سفیر نے خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کی اور انہیں کہا کہ اگر وہ مشرقی پاکستان کی آزادی کا اعلان کر دیں تو امریکہ اسے ایک آزاد خود مختار ملک تسلیم کر لے گا، امریکی سفیر نے ان پر یہ بھی واضح کر

دیا تھا کہ متحدہ پاکستان امریکہ کے مفاد میں نہیں، امریکہ بھارت کو خطرات سے بچانا چاہتا تھا
کیونکہ بھارت کئی اطراف سے پاکستان اور اس کے دوستوں کے درمیان محصور ہو چکا تھا، چنانچہ
قیام پاکستان کے چند سال بعد خواجہ ناظم الدین کو "شیخ مجیب" بنانے کی کوشش کی گئی مگر خواجہ ناظم
الدین نے امریکی کھیل کو سمجھتے ہوئے بنگالی عوام کو خبردار کر دیا۔ انہوں نے ایک جلسہ عام میں
امریکی سفیر کی گفتگو عوام کے سامنے رکھ دی۔ اس جرم کی "سزا" انہیں وزارت عظمیٰ سے رخصتی کی
صورت میں ملی اور امریکہ نے اپنا یہ ہدف 1971ء میں پورا کر لیا۔

پاکستان میں امریکی سفیر کی حیثیت ایک وائسرائے کی طرح بن گئی اب تو کئی پاکستانی
سیاست دانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی شادیوں کی تاریخ بھی امریکی سفیر سے پوچھ کر
طے کرتے ہیں، یہ سفیر پاکستان میں رہتے ہوئے پاکستان کو دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں، سوال
یہ ہے کہ کیا کسی دوسرے ملک کے سفیر کو پاکستان میں اس قدر آزادی حاصل ہے جس قدر امریکی
سفیر کو پاکستان میں حاصل ہوتی ہے؟ اس آسان سے سوال کا جواب سارے ثبوت فراہم کر دیتا
ہے جو پاکستانی حکمرانوں کی امریکہ کے ہاتھوں غلامی کی ساری تصویر کو واضح کر دیتے ہیں۔

حکمران طبقہ امریکیوں پر اندھا دھند اعتماد کرتا چلا آ رہا ہے، یہ اعتماد "سرخ بتی" کو
بھی کرتا رہا، ایک پاکستانی سائنس دان منیر احمد خان چھٹیاں گزارنے کے لئے یورپ جاتا چاہتے
تھے انہوں نے پاکستان سے یورپ کی طرف عازم سفر ہوتے ہوئے اپنی جوان بیٹیوں کو امریکی
سفیر کے گھر چھوڑ دیا، دونوں بیٹیاں دو ماہ تک اس امریکی سفیر کے گھر میں رہیں جو خود غیر شادی
شدہ تھا۔ شاید اس فراخدلی سے متاثر ہو کر امریکی سفیر بیک ویل نے بیان دیا تھا کہ پاکستان
ویزے کے لئے کہاں تک چلے جاتے ہیں

پاکستانی مقتدر طبقے کے غلامی کے جذبے سے شہ پاتے ہوئے سی آئی اے نے
پاکستان میں مذموم کھیل کھیلنے میں مصروف رہے، انہوں نے ملک کو ہر اعتبار سے عدم استحکام کا
بنایا، امریکی سفارت خانے کا ایک سیکنڈ سیکرٹری بوب اسلام آباد کے 7/4 سیکٹر میں رہائش
تھا۔ یہ سیکرٹری اسلحہ اور منشیات کا بہت بڑا اسمگلر تھا، یہ ایک مثال ہے اس طرح کے جرائم پیشہ
عملے کے سینکڑوں افراد پاکستان میں کام کر چکے ہیں جن کے ذمے پاکستان کی جڑوں کو
کرنے کا کام تھا، انہوں نے ملک کے محب وطن طبقات کو آپس میں لڑایا اور اس لڑائی کے
میں اپنے مذموم مقاصد پورے کئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، اگر یہ کہہ دیا جائے کہ

کے اندر امریکی سفارت خانہ تمام تر برائیوں اور بیماریوں کا مرکز ہوتا ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔
سی آئی اے کی پوری دنیا میں کارروائیاں اگرچہ آج بھی جاری ہیں لیکن موجودہ افغان
بحران نے اسلامی ممالک میں سی آئی اے کو لرزہ براندام کر دیا ہے، ان سب اسلامی ممالک کے
حکمران امریکہ کے حامی جبکہ عوام روز بروز امریکہ کے شدید سے شدید تر مخالف ہوتے جا رہے
ہیں، عوامی نفرت کا نشانہ کم ہمت مسلمان حکومتیں بھی ہیں اس لئے اگر یہ حکومتیں عوام کی نفرت کے
سامنے ڈھیر ہو گئیں تو اس کے بعد سی آئی اے کے ایجنٹوں کا نیٹ ورک بہت متاثر ہوگا۔

کچھ عرصہ پہلے صومالیہ میں امریکہ اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ کر رہا تھا مگر عوامی نفرت
کے طوفان نے جب امریکی فوجوں کا رخ کیا تو امریکی فوجیوں اور سی آئی اے کے ایجنٹوں کے
لئے فرار مشکل ہو گیا تھا۔ چونکہ امریکہ اس وقت فائنل راؤنڈ کھیل رہا تھا۔

O

"امریکہ سے دشمنی مول لینا خطرناک ہو سکتا ہے، لیکن امریکہ سے دوستی اپنی موت کو
دعوت دینے کے مترادف ہے۔" ہنری کسنجر کا یہ قول بھی آج کا سب سے بڑا اور تلخ سچ ہے جس کا
تجربہ پاکستان کو ہو رہا ہے۔

آج کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال کے تناظر میں اگر ڈاکٹر ہنری کسنجر کی اس بات
پر غور کیا جائے تو ان کا کہنا سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ
اپنے مفادات کے حصول کی خاطر امریکہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی اپنا
حق سمجھتا ہے اور اس مقصد کو پانے میں وہ کسی بھی بین الاقوامی ضابطے یا عالمی قوانین کی پابندی کو
ضروری نہیں سمجھتا۔ قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک اور مریخ سے لے کر سمندروں کی تہوں
تک کسی بھی معاملے سے وہ لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ امریکہ اس خطے میں مصروف عمل ہے، پہلے تو وہ
چاہتا ہے کہ اس خطہ کے رہنے والے اس کے ہمیشہ دست نگر رہیں۔ دوسرے تیل پر کنٹرول ایک
ایسا ہتھیار ہے جو اگر امریکہ کے ہاتھ لگ جائے تو وہ تمام تیل استعمال کرنے والے ممالک پر اپنی
سیاسی، اقتصادی اور دفاعی پالیسی مسلط کر سکتا ہے، تیسرے اس خطے کی جغرافیائی حیثیت کو وہ دور
دراز علاقوں میں پہنچنے کے لئے بیس کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔

پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع، ایٹمی صلاحیت، زرعی اور تکنیکی ہنرمندی اور خاص طور پر
اسلامی نظریاتی بنیاد ایسے عوامل ہیں جو امریکی پالیسی سازوں کی خاص توجہ کا مرکز ہیں۔ امریکہ نے

کبھی پاکستان کو اپنے معاملات خود چلانے کی اجازت نہیں دی۔ ہماری تاریخ کے ابتدائی بر
میں ہی امریکہ نے ہمارے قومی مفادات کو ہائی جیک کر لیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ہ
امریکہ نے پاکستانی حکام کے اردگرد ایک ایسا جال بُن دیا کہ پاکستان کسی صورت اس سے آز
ہو سکے۔ کبھی آئی ایم ایف او اور ورلڈ بینک کے قرضوں کی واپسی کے لئے دباؤ، کبھی ا
ہتھیاروں کی روک تھام کا عزم، کبھی چین اور ایران سے دوستی پر خفگی اور کبھی چرس اور افیون پر
پاکستان کو ان مسائل میں اس بُری طرح سے الجھا کر رکھ دیا گیا ہے کہ وقت کے ساتھ ہ
پاکستان نہ صرف اقوام عالم میں اپنا منفرد مقام اور تشخص کھوتا جا رہا ہے بلکہ سیکورٹی اور اقتص
لحاظ سے بہت سے خطرات سے دوچار ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے
ہی سے ہر حکومت امریکہ کے ساتھ دفاعی اور اقتصادی معاملے کرنے پر مجبور رہی ہے۔ ج
بدولت امریکہ کو تو اپنی قومی سلامتی اور دیگر مفادات کے تحفظ میں مدد ملی، مگر امریکی حاسدوں ک
سے پاکستانی قوم آج تک ہر قسم کے مفاد کے حصول سے محروم ہے۔ اس بے سود دوستی کا ہمیں
نقصان بھی ہوا کہ امریکہ نے روس کے خلاف جاسوسی کے لئے ہماری سرزمین کو بلاخوف وخط
عام استعمال کیا۔ امریکہ نے ہمارے عزیز دوست چین اور ایران کے ساتھ ہمارے تعلا
بگاڑنے کی بھی پوری کوشش کی اور آج بھی وہ اپنی اس مذموم کوشش میں مصروف ہے۔ جس ک
ترین ثبوت یہ ہے کہ چین کو میزائل ٹیکنالوجی پاکستان کو منتقل کرنے پر پابندی عائد کر رکھی
امریکہ کی یہ کوشش بھی ہے کہ ہم برادر اسلامی ملک ایران سے بھی مکمل طور پر کٹ جائیں ا
مقصد میں ناکامی کے باوجود وہ ابھی تک ہمارے ایران کے ساتھ تعلقات پر کڑی نظر رکھے
ہے۔

اپنے انتظامی، اقتصادی اور سیاسی اثر کو قائم رکھنے اور شکنجے مزید مضبوط بنانے کے
امریکہ اپنی خفیہ دہشت گرد تنظیم سی آئی اے کی کارکردگی کو فعال رکھتا ہے۔ یہ امریکہ ادارہ د
دیگر ممالک کے قومی وقار کو زیر نگیں رکھنے اور اس ضمن میں امریکی مفادات کے تحفظ اور حصو
لئے پوری دنیا میں بدنام ہے۔ اس ادارہ کے پاس بے پناہ وسائل ہیں اور اس کے کارکن
مقاصد کی تکمیل میں کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں۔ سی آئی اے کے جنونی طریقہ کار
جھلکیاں یہ ہیں:

1- دیگر ممالک کے دفاع، خارجہ امور، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبہ جات، اقتصاد

اور تعلیمی پروگراموں اور سیاسی اداروں کی خفیہ نگرانی۔

2- پراپیگنڈہ، ڈس انفارمیشن، دہشت گردی، نفسیاتی حربے، قتل وغارت، بلیک میلنگ، رشوت اور ڈرانے دھمکانے جیسے مذموم ہتھکنڈے۔

3- کسی بھی حکومت کو ایسے سیاسی صلاح مشورے دینا کہ وہ امریکی پالیسیاں اختیار کرنے پر مجبو ہو جائے۔

4- اقلیتوں، طلبہ یونینوں اور مزدوروں کے سوداکاری ایجنٹوں کو مالی امداد فراہم کرنا۔

5- سائنس دانوں، دانشوروں اور سکالروں کے لئے سیمینار، لیکچرز اور فلم پروگرام سپانسر کرنا۔ تاکہ ان کے ذہنوں میں امریکی سوچ پیدا کی جا سکے۔ منتخب افراد کو امریکی بیویاں اور شاندار ملازمتیں فراہم کر کے ان کی وفاداریاں خریدنا۔

6- بعض اہم سیاستدانوں، صحافیوں، سرکاری اہل کاروں اور دیگر اہم عہدیداروں کو رشوت، اعزازات، تحائف اور امداد فراہم کرنا۔

7- کسی بھی ملک کے سیاسی نظام کو اپنی منشاء کے مطابق چلانے کے لئے اپنی منتخب سیاسی جماعت یا سیاستدانوں کو مشاورت اور مالی امداد مہیا کرنا۔

8- اپنی پروردہ سیاسی جماعت کو برسر اقتدار لانے کے لئے برسر اقتدار حکومت کے خلاف تشدد مظاہرے کروانا اور اس مقصد کے حصول کے لئے چلائی جانے والی نام نہاد سیاسی تحریک کو بھرپور مالی امداد فراہم کرنا۔

9- مختلف ممالک کے صدور، وزرائے ماعظم، وزراء، جرنیلوں اور سینئر مشیروں کی خدمات سی آئی اے کے ایجنٹ کے طور پر حاصل کرنے کی مذموم کوشش کرنا۔

امریکہ اس خطے میں خاص طور سے دلچسپی لے رہا ہے اور اس کی لالچی نگاہیں نہ صرف (سابق) روس کی چھ اسلامی ریاستوں کے خزانوں پر لگی ہوئی ہیں، بلکہ چین سے آگے بھی جاتی ہیں۔ افغانستان میں اس نے اپنے پنجے سنٹرل ایشیا پر اپنا قبضہ جمانے اور وہاں کی قدرتی دولت لوٹنے کے لئے جمائے ہیں۔

جب روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں تو ایک دفعہ پھر امریکہ کو موقعہ مل گیا کہ وہ اس خطے میں واپس آ جائے اور افغان جہاد میں امداد کا بہانہ بنا کر ایک دفعہ پھر پاکستانی حکمرانوں پر چھا جائے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان اور افغانستان صرف اسلامی ممالک سے مدد حاصل کرتے،

مگر امریکہ نے ہمیں اپنا دست نگر بننے پر مجبور کر دیا۔ اس کا خمیازہ نہ صرف پاکستان اور افغ
بلکہ ساری اسلامی دنیا ابھی تک بھگت رہی ہے اور نہ جانے ہمیں کب تک اور کتنا خمیازہ بھگت
گا۔ پاکستان میں سی آئی اے کی مداخلت کس حد تک موجود ہے، اس کا اندازہ پاکستان آ
سابق چیف آف سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کے ایک مضمون کے اقتباس سے لگایا جا سکتا
''دی مسلم'' کی 29 رجنوری 1994ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

''امریکہ نے پاکستان کی غیر جمہوری حکومتوں میں اعلیٰ ترین عہدوں پر اپنے تعینات کر رکھے تھے تا کہ وہ پاکستان کے پورے سیاسی وسماجی نظام کو تہہ و بالا کر سکے اور ا مقاصد کے حصول میں آسانی رہے۔ ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی صلاحیوں کو بروئے کار لائیں اور سی آئی اے کے ایجنٹوں اور ان ''آقاؤں'' سے نجات کریں۔'' (روزنامہ دی مسلم 29 رجنوری 1994ء)

O

آئی ایس آئی بمقابلہ سی آئی اے

پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا دور اقتدار، ہنگاموں، بحرانوں، تنازعات اور عدم اعتماد کے ابواب پر مبنی ایک طویل داستان ہے۔ انہوں نے دسمبر 1971ء میں اس وقت اقتدار سنبھالا جب پاکستانی قوم کو اپنے تاریخ کے شدید ترین بحران کا سامنا تھا۔ پاکستان کا وجود پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ اس پر لگے والے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا اور بیرونی جارحیت کے نتیجے میں قوم کے حوصلے بڑی حد تک پست ہو چکے تھے لیکن ان کی خارجہ پالیسی اس حد تک کامیاب تھی کہ پاکستان کو بہت جلد قوموں کی عالمی برادری میں اس کا کھویا ہوا اعزاز واپس مل گیا۔ چین، شمالی کوریا، لیبیا، شام اور پی ایل او، پاکستان کے بہترین دوستوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ 1974ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ بھٹو کی پوری توجہ خارجہ امور کی طرف مبذول تھی اور خاص طور پر جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو ایک محب وطن سیاسی وقومی راہنما کی حیثیت سے ان کی یہ سوچ انتہائی مثبت تھی کہ پاکستان کا وجود برقرار رکھنے کے لئے ایٹمی قوت کا حصول ناگزیر ہو گیا۔ اس حوالے سے کئے گئے ان کے فیصلوں اور مختلف اقدامات نے مغرب کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں، کیونکہ ان کے لئے ذوالفقار علی بھٹو تیسری دنیا اور اسلامی دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے ابھر رہا تھا اور پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کی سعی امریکہ اور اس کے حواریوں کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا جو مستقبل میں ان کے مفادات کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یہی دور ہے جب امریکہ کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی فکر ہوئی۔ اُن دنوں انٹیلی جنس کی بعض مصدقہ اطلاعات کے مطابق امریکہ جو بھٹو سے پہلے ہی خوف زدہ تھا، مخالف سیاسی جماعتوں میں پوری طرح شامل ہو گیا۔ اس نے نہ صرف صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھایا، بھٹو کے خلاف نفرت کی آگ پر تیل ڈالا بلکہ بھٹو کا تختہ الٹنے کی خاطر اپوزیشن کو بھرپور مالی اور سیاسی امداد بھی فراہم کی۔ بھٹو کو اقتدار سے

الگ کرنے میں امریکہ کے مفادات مضمر تھے۔ اوّل یہ کہ بھٹو پاکستان کے لئے ایٹمی طاقت
حصول کے لئے دیوانہ وار کوششیں کر رہے تھے اور اس مقصد کے لئے ان کو امریکہ اور اس
اتحادیوں کی کسی پالیسی کی پروانہ نہیں تھی۔ دوم یہ کہ اپنی ذہانت اور منصوبہ بندی سے وہ اسلامی
تیسری دنیا کے متعدد ملکوں کی پالیسیوں پر نہ صرف اثر انداز ہی ہو رہے تھے بلکہ ان کی کوشش تھی
تیسری دنیا ایک قوت بن کر ابھرے اور روس اور امریکہ کے مقابلے میں اپنے مفادات کی حافظ
کر سکے، جو یقینی طور پر عالمی قبضے کے لئے امریکی خواب کی تعبیر کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی
بھٹو کی سرگرمیوں نے علاقے میں امریکی مفادات کو سخت گزند پہنچانا شروع کر دیا تھا۔

9/اگست 1972ء کو امریکہ کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر نے لاہور میں ذوالف
علی بھٹو سے ایک خصوصی ملاقات کی تاکہ پاکستان کو ایٹمی تکنیک کے حصول اور فرانس سے ا
ریپروسیسنگ پلانٹ کے سودے سے روکا جا سکے۔ حالانکہ اس وقت تک پاکستان فرانس سے ا
پلانٹ کے حصول کے لئے باقاعدہ معاہدہ کر چکا تھا، اور عالمی ایٹمی توانائی اتھارٹی کو اس ضمن
تمام تحفظات کی ضمانت بھی دے چکا تھا۔ اس ملاقات کے دوران کسنجر کو اس بات کا بخوبی انداز
گیا کہ بھٹو کا فیصلہ اٹل ہے اور وہ ہر حال میں پاکستان کو ایٹمی قوت بنانا چاہتے ہیں۔ مسٹر کسنجر
جہاز پر سوار ہونے سے پہلے بھٹو سے کہا۔

''مسٹر بھٹو ہم تمہیں ایک عبرتناک مثال بنا دیں گے'' اپنی بات کی مزید وضاح
کرتے ہوئے انہوں نے ایک اور مثال دی کہ ''مسٹر بھٹو! جب سامنے سے ریل گاڑی آتی دکھ
دے تو عقل مند پٹڑی سے ہٹ جاتا ہے''۔

(Profile of Intelligence مصنف بریگیڈئر (ر) سید اے ایم ترمذی صفحہ 3

ذوالفقار علی بھٹو نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور ہنری کسنجر کو اپنا موقف منوائے
واپس جانا پڑا۔ یہی ملاقات ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کے زوال کا نقطہ آغاز تھی۔ امریکہ
فیصلہ کر لیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کا وجود ختم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لئے اس نے اپنے ''شکا
کتے'' چھوڑ دیئے۔ 77-1976ء کے دوران بھٹو کے خلاف جو سیاسی اور اقتصادی بحران پید
اس چنگاری کو شعلہ بنانے میں امریکہ نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا، جس کی چند مثالیں درج ذ
ہیں:۔

1- امریکہ نے انتہائی چالاکی سے بعض بیوروکریٹس، پاکستان پیپلز پارٹی کے چند مر

عہدیداروں، راہنماؤں اور وزراء کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اپنے حلیفوں کی صف میں
شامل کر لیا۔ ان ایجنٹوں کے ذریعے سی آئی اے کو نہ صرف اندر کی خبریں مل جاتی تھیں
بلکہ وہ ان لوگوں کی مدد سے اپنی سازشوں کے جال بہتر طریقے سے پھیلانے میں
کامیابی حاصل کر رہا تھا۔

2- 77-1976ء کے درمیان انہی ''قریبی ساتھیوں'' کے مشوروں کی وجہ سے بھٹو ایک
گہری سیاسی دلدل میں پھنستے چلے گئے۔ جس سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں
آتی تھی۔ ان دوست نما دشمنوں نے بھٹو کو باور کرایا کہ پیپلز پارٹی کے لئے اسمبلی میں دو
تہائی اکثریت حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ جن دنوں پی این اے کی تحریک
زوروں پر تھی اور حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے تھے۔ ان ''قریبی
ساتھیوں'' نے اس تحریک کو اسلحے کے زور پر دبانے کا مشورہ دیا اور کچھ لوگوں نے تو
بھٹو سے باقاعدہ ہتھیار سپلائی کرنے کا مطالبہ بھی کیا تاکہ اسلحے کے زور پر اس تحریک کو
ختم کیا جا سکے اور آخر کار بھٹو صاحب نے سنجیدگی سے اس مشورے پر غور کرنا شروع کر
دیا۔

3- USMAAG کے بعض افسروں کو جنرل ہیڈ کوارٹرز تک رسائی تو حاصل تھی ہی، اب
انہوں نے سروسز ہیڈ کوارٹرز کے چیدہ چیدہ پاکستانی افسروں کو اپنے ''قیمتی مشوروں''
سے نوازنا بھی شروع کر دیا۔

4- بعض امریکی سفارت کاروں نے پی این اے کے متعدد راہنماؤں سے ''براہ راست
دوستی'' کا شرف حاصل کر لیا اور ہر طرح سے ان کی امداد کرنے لگے۔

جن دنوں پی این اے کی تحریک عروج پر تھی، غیر ملکیوں کا ایک بڑا ریلہ جن میں زیادہ
تعداد یہود اور نصارا کی تھی، صحافیوں، فوٹو گرافروں، رپورٹروں اور سیاسی مبصرین کے روپ میں
پاکستان آ پہنچا۔ بظاہر یہ لوگ کیمروں اور ٹیپ ریکارڈوں سے ''مسلح'' تھے۔ مگر اندرون خانہ ان
کے مقاصد کچھ اور تھے۔ ان کے پاس ڈالروں کی کمی نہ تھی اور پاکستان میں بھی بعض خفیہ ہاتھ ان
کی ہر قسم کی امداد کے لئے پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان کے پاس تمام سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں
کے نام، پتے اور فون نمبر تک موجود تھے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ گوری چمڑی کا جادو اس قدر چل
چکا تھا کہ ہمارے کچھ سیاستدان اور چند بلند اور قد آور قومی رہنما ایک نام نہاد سفید فام صحافی کی فون

کال کے منتظر رہتے اور اس سے گفتگو کرنا اپنے لئے بڑا اعزاز سمجھتے تھے (مارک ٹیلی)۔ ہر روز
ایس آئی کے پاس ان کی جانب سے بھیجی گئیں ''خبروں'' کے ٹیلی گرام کا ایک ڈھیر لگ جاتا ج
پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ہمارے کچھ سیاستدان کس قدر بونے قد کے ہیں، اور وہ ان
نہاد صحافیوں کو جو دراصل سی آئی اے کے ایجنٹ تھے قومی مفادات کے خلاف کیا کیا رپورٹ کر
تھے اور ان کی گفتگو سے آئندہ آنے والے دنوں میں کیا کیا نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔

بریگیڈیئر ترمذی اپنی کتاب ''پروفائل آف انٹیلی جینس'' میں لکھتے ہیں انہیں د
ہمیں کراچی سے یہ اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ کھلی منڈی میں امریکی ڈالر کا زرتبادلہ کا
بڑی حد تک گر گیا ہے۔ مارکیٹ میں امریکی ڈالروں کا ایک سیلاب آ چکا تھا اور لوگ دھڑا
امریکی ڈالر کے عوض پاکستانی روپیہ خرید رہے تھے۔ اس حقیقت کو جاننا اب قطعی مشکل نہیں
''سیلاب بلا'' کہاں سے آیا تھا اور اس کے پیچھے کیا خفیہ مضمرات تھے۔ امریکہ نے فوری طور
ایل 480 کے تحت جمع شدہ رقم کی تجوریاں بھی کھول دیں اور جمہوری اتحاد کے چیدہ چیدہ کار
کی جیبیں راتوں رات امریکی ڈالروں اور پاکستانی روپوں سے بھر دی گئیں اور بظاہر ملک
اسلامی حکومت کے قیام کے یہ خواہش مند حضرات پہلی بار پرتعیش زندگی گزارنے لگے۔ یہ
یہیں پر ختم نہیں ہوتا، بعض صنعت کار اور تاجر بھی جو بھٹو کی اقتصادی پالیسیوں سے نالاں تھے
''جہاد'' میں شامل تھے اور وہ پی این اے کو بڑی بڑی رقوم چندے کے طور پر دے رہے تھے
چندوں کا چونکہ کوئی حساب کتاب نہیں تھا اس لئے پی این اے کے بعض مرکزی راہنماؤں
لاکھوں کمائے۔ 30 لاکھ روپے کا ایک چیک جو ایک بیرونی حکومت سے جماعت اسلامی کے
سربراہ کے نام آیا تھا، حکومتی کارندوں کے ہاتھ لگ گیا، اس کی ایک فوٹو کاپی سندھ کے وزیر
غلام مرتضیٰ جتوئی کو دے دی گئی جو انہوں نے وزیراعظم تک پہنچا دی۔

اپریل کے مہینے میں پی این اے کا ایک احتجاجی جلوس کوئنز روڈ (اب شاہراہ
جناح) سے گزر رہا تھا۔ جب یہ جلوس امریکن سنٹر کے قریب پہنچا تو یو ایس آئی ایس کے
افیئرز آفیسر کرسٹوفر ایل شلز کو اپنے ایک پاکستانی سٹاف ممبر اجمل خان کے ساتھ سنٹر کی چھت
دیکھا گیا۔ انہیں دیکھ کر جلوس میں شامل امریکی نمک خواروں نے اپنا نمک حلال کرنے کی
امریکہ کی حمایت میں نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ردعمل کے طور پر شلز نے بچوں کی طرح
سے ہاتھ ہلا کر ان نعروں کا جواب دیا۔ وہ یقینی طور پر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا کہ امریکی

منصوبہ بندی بالآخر اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

اس حوالے سے پاکستان ٹائمز لاہور 4 رمئی 1977ء کی اشاعت میں مسٹر ایم اے
ٹی کا شائع ہونے والا خط قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا انہوں نے لکھا۔

زندہ باد مردہ باد

''میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی 28 راپریل کی قومی اسمبلی میں کی گئی تقریر کا حوالہ
نا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے راولپنڈی کے ایک جلوس میں ''کارٹر مردہ باد'' کے نعروں پر
ریکی سفارت خانے کا حکومت پاکستان سے احتجاج کا ذکر کیا تھا۔ 19 راپریل کو امریکن سنٹر کے
منے سے گزرتے ہوئے پی این اے کے ایک جلوس کے شرکاء نے ''کارٹر زندہ باد'' کے نعرے
ئے۔ اس وقت سنٹر کی چھت پر سنٹر کے ایک امریکی افسر کرسٹوفر شولز اور ایک پاکستانی ملازم محمد
ل خان موجود تھے۔ جنہوں نے ان نعروں کے جواب میں انتہائی خوشی کا اظہار کیا اور جلوس کے
کاء کا ان نعروں پر ہاتھ ہلا ہلا کر شکریہ ادا کیا۔ میں امریکی سفارت خانے سے صرف یہ پوچھنا
ہتا ہوں کہ انہوں نے یہ واقعہ پاکستان کے محکمہ خارجہ کو رپورٹ کیوں نہ کیا اور ''کارٹر مردہ باد''
نعروں پر احتجاج کرتے ہوئے ''کارٹر زندہ باد'' کے نعروں کو کیوں بھول گئے؟''

بھٹو کو برطرف کرنے کا یہ امریکی منصوبہ اس قدر مضبوط تھا کہ 4 رجولائی 1977ء کو
ب پی این اے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان مذاکرات کا آخری دور ہوا اور دونوں
عتیں ایک متفقہ سمجھوتے پر پہنچ گئیں تو پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کے ارکان مفتی محمود، نوابزادہ
راللہ خان اور پروفیسر غفور نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے مذاکرات کے
ران جو تجاویز پیش کی ہیں وہ انہیں قبول ہیں، مگر اس اعلان کے ساتھ ہی ایئر مارشل (ریٹائرڈ)
فرخان، پیر پگارو، بیگم نسیم ولی خان اور مولانا نورانی نے اس معاہدے کو نہ صرف تسلیم کرنے سے
ف انکار کر دیا بلکہ ان تینوں راہنماؤں کی حیثیت کو بھی چیلنج کر دیا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا
ناہے کہ ان لوگوں کی ڈور کس کے ہاتھ میں تھی اور کون اس ڈور کے دوسرے سرے پر بیٹھا اپنی
ہش کے مطابق اسے حرکت دے رہا تھا۔ (ایفا صفحہ 35 تا 45 کی تلخیص)

O

19 راکتوبر 1976ء کو سعودی عرب کے شاہ خالد پاکستان تشریف لائے۔ بھٹو نے
ہ خالد کو باور کروایا کہ امریکی آپ کے تیل پر قابض ہونا چاہتے ہیں، ہم اور آپ (یعنی پاکستان

اور سعودی عرب) مل کر امریکی ارادے خاک میں ملا سکتے ہیں حکومت کے ایوانوں سے یہ بھ
چلا ہے کہ مسٹر بھٹو نے شاہ خالد سے انڈس سپر ہائی وے اور ایٹمی پروگرام کو آگے بڑھانے کے
امداد مانگی۔ ساتھ ہی مسٹر بھٹو نے مشورہ دیا کہ آپ (سعودی عرب) روس کو تسلیم کر لیں اور یہ
کے لئے راہ ہموار کر سکتا ہوں۔ یہ خبر امریکہ تک فوراً پہنچ گئی اور امریکہ نے شاہ خالد کو نہ ہی
تسلیم کرنے دیا، نہ ہی انڈس سپر ہائی وے کے لئے یا پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لئے پا
کو امداد دینے کی اجازت دی، صرف مسٹر بھٹو کی پھانسی پکی ہو گئی۔

7 رجولائی 1977ء کو امریکہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جوزف نی جو ایٹمی ہتھیارو
محکمے کا ذمے دار تھا، وہ پاکستان آیا اور جنرل ضیاء الحق سے کہا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام
دیا جائے (جہاں ہے وہیں روک دیا جائے) جنرل ضیاء الحق نے اپنے مخصوص انداز میں ا
دکھلایا۔

O

کہوٹہ اور سی آئی اے

1978ء میں فرانسیسی ریپروسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ کروانے کے بعد امریکہ کی آنکھوں میں کہوٹہ کھٹک رہا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ پاکستان اس جنگل بیابان میں کیا کر رہا ہے۔ امریکہ نے جہاں اپنے خلائی جہازوں اور جاسوسوں سے کام لیا وہاں اسلام آباد میں مقیم چند سفارت کاروں کو بھی اس بات پر مامور کیا کہ وہ کہوٹہ کے علاقے کی ''سیر'' کریں اور دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کی سیکورٹی آئی ایس آئی کی ذمہ داری نہ تھی۔ اس مقصد کے لئے ایک علیحدہ سیکورٹی آرگنائزیشن قائم تھی جو کلی طور پر خود مختار سربراہ کی قیادت میں اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت میجر جنرل ریٹائرڈ سید اے زیڈ نقوی کو فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد پی اے ای سی سیکورٹی کا سربراہ تعینات کیا گیا تھا۔ جنرل نقوی جب لاہور میں 10 ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے، میں ان دنوں کور ہیڈ کوارٹرز میں جی ایس او۔1 (آپریشنز) کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہمارے باہمی تعلقات کا آغاز اسی زمانے میں ہوا مگر بعد ازاں جنرل صاحب کے اسلام آباد آنے پر یہ تعلقات نئے سرے سے استوار ہو گئے۔ ہمارے درمیان پائی جانے والی پیشہ وارانہ ورکنگ ریلیشن شپ کی بنیاد پر وہ کبھی کبھار آئی ایس آئی سے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کی سیکورٹی کے حوالے سے معاونت کے لئے کہتے یا کبھی ہمیں کسی اہم کیس پر تحقیقات کرنے کے لئے بھی کہہ دیتے۔ ایٹمی ریسرچ کی تنصیبات اور ادارے جن میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بھی شامل ہے، روز آغاز ہی سے ہمارے دشمنوں کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی نظر خاص کا نشانہ ہے اور روز اوّل ہی سے دشمنوں کی کوشش یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور یہ جان لیں کہ کہوٹہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ ان کا ٹارگٹ کہوٹہ کمپلیکس اور اس کے گرد و نواح کی تصویر کشی تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ مشن اتنا حساس اور اہم تھا کہ خود سفیر صاحب علاقے کے سروے کے لئے تشریف لے گئے اور اس سروے پلان میں پلانٹ کی عمارت کو جانے والے راستوں، اس کے در و دیوار، اس کے گرد و پیش سیکورٹی کے سسٹم، حفاظتی انتظامات اور

سارے ممنوعہ علاقے کا تفصیلی معاملہ شامل تھا۔

بنیادی طور پر یہ فوٹو گرافری اور دیکھ بھال کا مشن تھا جو عام طور پر اس علاقے میں ک
جاتا ہے جہاں حملہ کرنا مقصود ہو۔ تاہم یہ بات ابھی تک راز ہی ہے کہ پاکستان کو ایٹمی ر
پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی سے انکار کے بعد فرانس، کہوٹہ کے بارے میں اس قدر تشویش میں
کیوں مبتلا تھا اور کس کی ایماء پر اس نے اس خطرناک مشن پر اپنے دو اعلیٰ ترین سفارتکاروں ک
زندگیاں داؤ پر لگانے کا فیصلہ کیا۔ ایسے مشن کسی صورت بھی اعلیٰ اتھارٹی کی اجازت کے بغیر عمل
میں نہیں لائے جاتے۔ معلوم نہیں اس مشن کی اجازت فرانس کے صدر سے حاصل کی گئی تھی یا و
سرے سے اس سے آگاہ ہی نہیں تھے۔ تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فرانس کے سفیر کا مقص
محض کہوٹہ کے فطری حسن سے لطف اندوز ہونا اور اس کی تصویر کشی کرنا نہیں تھا۔ انہیں اچھی طرح
علم تھا کہ علاقے کی کیا اہمیت ہے اور وہ کسی صورت بھی اس سیکورٹی زون میں داخل نہیں ہو سکتے
اس لئے ان کی یہاں آمد کا واحد مقصد علاقے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر
تھا تا کہ کہوٹہ پر کسی زمینی یا فضائی حملے کی صورت میں سو فیصد کامیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔ انہیں کر
حالات، کس بات اور کن لوگوں نے ایک باعزت سفارتکار سے ایک گھٹیا قسم کا 007 جیمز بونڈ بنے
پر مجبور کیا۔ اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں تاہم ہمارے نزدیک یہ ایک نہایت ہی بچگانہ او
احمقانہ حرکت تھی۔

اس کے گردونواح میں مکانوں اور درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے اور شتر مرغ کی
چال چلتے ہوئے تصویریں اتارنا شروع کر دیں۔ ان کی اس حرکت کا دیہاتیوں نے کوئی خاص
نوٹس نہ لیا لیکن چند لڑکیوں نے سمجھا کہ یہ گورے ان کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے
چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ گاؤں کے کچھ لڑکے جو ارد گرد کھیتوں میں کام کر رہے تھے یہ شور سن کر
بھاگ کر آ گئے اور لڑکیوں نے چیخ چیخ کر انہیں بتایا "بھیا گورے ہماری تصویریں اتار رہے ہیں۔"
پھر کیا تھا۔ لڑکوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ ان کی دھنائی شروع کر دی۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ
گاؤں کے چند بزرگ بھی پہنچ گئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کر کے ان کی جان چھڑوائی۔ بہر حال
اس وقت تک لڑکے ان کی ہڈی پسلیاں توڑ چکے تھے۔ اس "مہمان نوازی" کے باوجود فرانسیسی
سفارت کاروں نے ڈھٹائی اور بے شرمی کی حد کر دی اور انہوں نے اس واقعہ کے خلاف ہمارے
دفتر خارجہ میں جا کر باقاعدہ احتجاج ریکارڈ کروایا۔ دفتر خارجہ نے پہلے جنرل نقوی سے اس واقعہ

کے بارے میں پوچھا مگر وہ اس سارے معاملے سے لاعلم تھے۔ انہوں نے مجھے فون کیا اور پوچھا
"ارشاد میاں کہوٹہ میں کیا ہوا؟" میں نے فوراً جواب دیا جی کیا ہوا؟ "مجھے تو معلوم نہیں، آپ ہی
بتایئے؟"

لیکن انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے سوچا کہوٹہ میں ضرور کوئی نہایت ہی اہم واقعہ
رونما ہوا ہے اور ابھی جنرل اختر بھی مجھ سے پوچھیں گے۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنا ایک افسر کہوٹہ کی
طرف روانہ کیا تا کہ معلومات حاصل کی جا سکیں۔ جب جنرل اختر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر
پوچھا اس وقت تک میرا بھیجا ہوا افسر تمام معلومات حاصل کر کے آ چکا تھا۔

"کہوٹہ میں کیا ہوا ہے؟" ظاہر ہے ہمارے دفتر خارجہ نے صدر صاحب کو رپورٹ کیا
ہوگا اور انہوں نے جنرل نقوی کے بعد جنرل اختر سے پوچھا ہوگا۔

میں نے جنرل اختر کو تمام تفصیل بتا دی۔

جنرل اختر چونکہ یہ جانتے تھے کہ ہماری ٹیم کے کان بہت لمبے اور آنکھیں بہت دور تک
جاتی ہیں اس لئے انہوں نے ذرا اپنی آنکھیں سکیڑ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تمہارے لڑکے تو وہاں نہیں تھے؟"

میں نے جواب دیا کہ ہماری اطلاع کے مطابق فرانسیسی "جاسوس" اپنی گاڑی میں بیٹھ
کر اسے خود ڈرائیو کرتے ہوئے واپس گئے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری ٹیم وہاں نہیں
تھی۔ اگر ہمیں یہ علم ہوتا کہ وہ ہمیں کہوٹہ کے تفریحی دورے کا اعزاز "بخش" رہے ہیں تو ہم اس
سے بہتر طریقے پر ان کی خاطر تواضع کرتے۔ انہیں بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کرتے اور شاید
پھولوں کی دو خوبصورت "چادریں" بھی ان کے ہمراہ فرانس جاتیں۔ میری یہ گفتگو سن کر جنرل
اختر کے چہرے پر ایک خاص فخریہ مسکراہٹ آ گئی اور انہوں نے من و عن صدر صاحب سے کہہ
دیا۔

فرانسیسیوں نے ہمارے فارن آفس کے پاس اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے بیان
دیا تھا کہ کہوٹہ کے سیکورٹی سٹاف نے انہیں زدوکوب کیا ہے مگر انہوں نے امریکیوں کو کچھ اور ہی
کہانی سنائی، جس کا علم مجھے ایران سے شائع ہونے والی کتاب پڑھ کر ہوا جو ایرانی طلباء کے
امریکی سفارت خانے پر قبضے کے بعد حاصل کی جانے والی اہم دستاویزات پر مشتمل تھی اور جو
"اسناد لانہ جاسوسی" (45) "پاکستان" جلد 1 "امریکہ کی اسلامی ممالک میں مداخلت" کے

عنوان سے شائع کی گئی تھی۔

متعلقہ حصے کا ترجمہ کچھ یوں ہے:۔

خفیہ

امریکن سفارت خانہ اسلام آباد 29 جون 1979ء

سیکرٹری آف سٹیٹ، واشنگٹن

عنوان: فرانسیسی سفارت کاروں کا اسلام آباد ایٹمی صلاحیت والے کارخانے کے قریب زدوکوب

اسلام آباد 1997

مختصراً۔ فرانس کے سفیر اور اوّل سیکرٹری جین فورلوٹ کو 26 جون کو کہوٹہ کے قریب کچھ ٹھگوں نے اس وقت زدوکوب کیا جب وہ اپنی گاڑی میں اس گاؤں کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ فورلوٹ جو پہلے ہی بیہوش ہوگیا، کہتا ہے کہ پاکستان کی حکومت نہیں چاہتی کہ کہوٹہ کے نزدیک جہاں یورینیم کا کارخانہ ہے، کوئی غیر ملکی آئے۔

تفصیل۔ جین فورلوٹ نے 28 جون کو ہمیں اطلاع دی کہ 26 جون کی شام تقریباً پونے سات بجے وہ اور اس کا سفیر کہوٹہ کے علاقے سے جو اسلام آباد سے 30 میل کے فاصلے پر ہے، واپس اسلام آباد آ رہے تھے کہ راستے میں چند ٹھگوں نے انہیں پیٹا۔ 1978ء میں فورلوٹ اپنے ایک آسٹریلوی سفارتکار کے ہمراہ اس علاقے میں گیا تھا۔ جہاں خیال کیا جاتا ہے پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے اور انہوں نے اس علاقے کی کافی تصویریں اتاریں تھیں۔ فورلوٹ اپنے سفیر کے ساتھ پچھلے ہفتہ سفارا کی میٹنگ کے دوران پاکستان میں ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ فورلوٹ نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں کہ وہ اس سفیر کو اس علاقہ میں لے جائے گا اور یہ علاقہ ویسے بھی بڑا خوبصورت ہے اور سیاحت کے کتابچوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔

فورلوٹ اور اس کا سفیر شام تقریباً چار بجے اسلام آباد سے کہوٹہ کی جانب روانہ ہوئے اور راستے میں چند ایک ''دیدہ زیب'' مقامات پر رکے۔ نہ ہی تو ان کے پاس کوئی کیمرہ تھا اور نہ ہی گاڑی سے باہر آئے۔ جیسے ہی انہوں نے کہوٹہ سے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ ایک بسنتی رنگ کی گاڑی جس میں چار آدمی سوار تھے ان کے پاس سے گزری اور آگے جا کر رک گئی۔ آگے سے ایک ٹرک بھی آ گیا اور راستہ تقریباً بند ہوگیا۔ فورلوٹ نے کار کو ریورس کرنا چاہا کہ پیچھے سے

موٹر سائیکل سوار آ گئے اور راستہ روک لیا۔

چار آدمی گاڑی سے اترے اور دو موٹر سائیکل سے اور انہوں نے فورلوٹ اور بوڑھے سفیر کو کھینچ کر گاڑی سے نکال لیا۔ وہ زیادہ تگڑے نہیں تھے اور شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ فورلوٹ تو پہلے ہی ناک آؤٹ ہوگیا۔ پھر بوڑھے سفیر کی دھنائی شروع ہوئی۔ نہ ہی تو وہ فوجی لگ رہے تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ہتھیار تھے۔ پر ان کی شکلیں غنڈوں جیسی تھیں۔ فورلوٹ بیان کرتا ہے کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر مار رہے تھے کہ نشانات کم پڑیں۔ پھر بھی سفیر کا ایک دانت ٹوٹا اور گہری چوٹیں آئیں اور فورلوٹ کے سر کی ہڈی میں کریک آ گیا۔

فورلوٹ کہتا ہے کہ تقریباً دس منٹ بعد جب اسے ہوش آیا تو حملہ آور جا چکے تھے اور سفیر اپنی چوٹیں سہلا رہا تھا۔ فورلوٹ کی عینک ٹوٹ چکی تھی۔ انہوں نے کار کی چابیاں زمین پر سے اٹھائیں اور اسلام آباد پہنچ کر پولیس کو رپورٹ کی، پولیس نے پوری مدد کا وعدہ کیا۔ پروٹوکول آفیسر اور صدر پاکستان کو بھی اطلاع ہوئی اور صدر نے سفیر کے ساتھ بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ قطع نظر اس کے کہ حکومت پاکستان نے مجرموں کو پکڑنے کا وعدہ کیا ہے۔ فورلوٹ کو یقین ہے کہ یہ لوگ سرکاری غنڈے تھے اور انہوں نے سرکار کے حکم پر ہی ان کی پٹائی کی اور نہایت پھرتی اور صفائی سے یہ کام سرانجام دیا۔ نہ گاڑی توڑی نہ کوئی مال لوٹا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ کوئی غیر ملکی اس طرف کا رُخ نہ کرے۔

فورلوٹ بتاتا ہے کہ کہوٹہ کے گردونواح کافی بدل چکے ہیں۔ اس جگہ کو اب گاڑیوں کی ورکشاپ بھی کہتے ہیں اور کافی پرانی فوجی گاڑیاں اردگرد کھڑی ہیں۔ تار کی باڑ کی بجائے اب اس علاقے کے گرد ایک اونچی دیوار بنائی جا رہی ہے کہ باہر سے کچھ دکھائی نہ دے۔ سرکار پاکستان کو یہ علاقہ ممنوعہ قرار دے دینا چاہئے تھا اور فرانسیسی بیچارے تو یونہی پھنس گئے۔ بہرحال چونکہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہاں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات ہیں اور اس کی نگہداشت لازمی ہے شاید اس لئے چند نوجوان افسروں نے جوش میں آ کر ان فرانسیسیوں کی پٹائی کر دی۔

کنگ

بی ٹی 7335

یہ پڑھنے کے بعد کوئی قاری بھی یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فرانس کا اوّل سیکرٹری جین فورلوٹ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کی جاسوسی کے لئے امریکی جاسوسی ادارے سی آئی اے کا

تنخواہ دار ملازم تھا اور اس کا شاید فرانس کو بھی علم نہیں تھا۔

اسی ایرانی کتاب میں ایک اور سفارتی پیغام درج ہے، جو فورلوٹ کی جار سرگرمیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پیغام کا ترجمہ:

خفیہ

ازطرف: امریکی سفارتخانہ اسلام آباد

برائے: سیکرٹری سٹیٹ واشنگٹن رقو نصلری کراچی رامریکی سفارتخانہ دہلی رفرانس رہنولولوز

عنوان: فرانسیسی آفیسر کے ساتھ ایٹمی معاملات پر بحث

1- جین فورلوٹ فرانس کے سفارت خانہ میں فرسٹ افسر ہے اور ہم ایٹمی معاملات پ سے باقاعدہ اطلاعات لیتے رہتے ہیں۔ 19 ردسمبر کو ہمارے پولیٹیکل قونصل ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ کہوٹہ کے قریب عجیب قسم کی عمارتیں بہر رفتاری سے تعمیر کی جارہی ہیں۔ کہوٹہ اسلام آباد کے جنوب مشرق میں ایک گاؤں جہاں تقسیم ہند کے وقت بہت سے ہندو مارے گئے تھے۔

2- فورلوٹ کا کہنا ہے کہ اس نے اس جگہ کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اور یہ ایک ایٹمی تنص والی عمارت لگتی ہے۔ پچھلے چھ ماہ کے دوران تیزی سے 10 عمارتیں تعمیر ہو چکی جس میں ایک مستطیل شکل کی بہت بڑی عمارت ہے۔ پاکستان میں عموماً اتنی سے کام نہیں ہوتا جس تیزی سے اس عمارت پر ہو رہا ہے۔ فورلوٹ کا کہنا ہے نے کافی معلومات حاصل کی ہیں اور یہ پتہ چلا ہے کہ کراچی کی ایک فرم کو 50 لا کا ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکہ ملا ہے۔ فورلوٹ نے ہمارے پولیٹیکل کونسلر کو بہت سی ا بھی دکھائی ہیں جو اس نے اور اس کے آسٹریلوی سفارت کار دوست نے تھیں۔ (یہ ویسی ہی تصاویر ہیں جو آسٹریلیا کے سفارت کار نے ہمیں دیں تھیں بیگ میں بھجوا چکے ہیں) یقیناً یہ ایٹمی تنصیبات کی تصاویر ہیں۔ فرانسیسی سف فورلوٹ سے بھی کہا کہ وہ یہ تصاویر پہلے ہمیں دکھائے پھر ملٹری اتاشی کے فرانس بھجوادے۔

3- ہماری پولیٹیکل قونصلر نے کہا کہ اس نے بھی سنا ہے کہ کہوٹہ میں کچھ کام ہو رہا۔ اس سے زیادہ اسے بھی معلوم نہیں۔ بہرحال اس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

4- فرانسیسی ریپروسیسنگ پلانٹ کے متعلق فورلوٹ نے بتایا کہ باقی ماندہ دو افراد میں سے کیمسٹ 2 رجنوری کو شاید واپس چلا جائے اور دوسرا جو انجینئر تھا اگر اسے فرانس میں کوئی خاطر خواہ کام نہ ملا تو وہ شاید واپس آ جائے لیکن مشکل معلوم ہوتا ہے چونکہ انجینئر کی بیوی بچے یہاں خوش نہیں تھے اور انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ سپروائزر جو پاکستان اور فرانس کے درمیان دورہ پر رہتا تھا۔ کراچی گیا ہوا ہے اور شاید واپس نہ آئے۔ فرانس کا ایک قونصلر لاہور میں ہے جو انجینئر ہے لیکن وہ ایٹمی سائنسدان نہیں بلکہ بلڈنگ انجینئر ہے اور اس کی خدمات ایک فرانسیسی فرم SEEE سے مستعار لی گئی ہیں۔ فورلوٹ نے مزید کہا کہ اسے بھی کبھی کبھی مشورہ کے لئے بلایا جاتا ہے اور شاید وہ یہیں رہے اور واپس نہ جائے۔

5- فورلوٹ کا ذاتی خیال ہے کہ پاکستان از خود ریپروسیسنگ پلانٹ بنانے کی کوشش کرے گا جس میں شاید بہت وقت اور پیسہ لگے۔ جب فورلوٹ سے پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین منیر خان کے فرانسیسیوں کے ساتھ روابط کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔

ہمل

بی ٹی 2497

(Profiles of Intelligence صفحہ 55 تا 58)

O

سفارت کاری کی آڑ میں

کسی بھی غیر ملکی سفارت کار کا میزبان ملک میں غیر سفارتی سرگرمیوں اور غیر قانونی حرکات کا مرتکب ہونا یوں تو معمول کی بات ہے مگر جنیوا کنونشن کی رو سے یہ معاملہ انتہائی حساس سمجھا جاتا ہے اور اس کے بارے میں کنونشن کی دستاویزات میں ضروری اصول طے کر دیئے گئے ہیں۔ تاہم کسی بھی سفارت کار کی اس طرح کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے پہلے مہمان سفارت کار کے ملک اور میزبان ملک کے مابین عمومی تعلقات، ان ممالک کی سیاسی آب و ہوا اور ان کے لئے دفاعی خطروں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو ایسی حرکات کی بناء پر منظر پر آ سکتے ہیں۔ امریکی سفارت خانے کا ایک سیکنڈ سیکرٹری جس کا نام بوب تھا، اسلام آباد 7/4 سیکٹر میں رہائش پذیر تھا۔ ہماری معمول کی نگران ٹیم نے کئی بار ہمیں رپورٹ کیا کہ اکثر رات کے اندھیروں میں بہت سے خان اور ملک صاحبان پیجارو اور دیگر بڑی بڑی گاڑیوں میں بوب کے گھر آتے ہیں۔ یہ اطلاع ہمارے لئے اس لئے اہم تھی کہ مسٹر بوب کا نام نہ تو آئی ایس آئی کے ساتھ افغانستان کے حوالے سے رابطہ افسران کی فہرست میں تھا اور نہ ہی ان کا تعلق انسداد منشیات کے سکواڈ سے تھا۔ اس لئے بوب ہمارے لئے ایک پُراسرار شخصیت بن گیا۔ بوب کی بیوی تھی نہ بچے اور وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا اور مزید یہ بھی مشاہدے میں آیا کہ وہ اکثر پاکستان سے باہر بھی جایا کرتا تھا۔

اس کیس میں دو معاملات خاصے اہم تھے۔ ایک افغانستان کی جنگ، جب سے روسی فوجوں کے خلاف افغانستان میں مزاحمت کی جنگ شروع ہوئی تھی امریکہ کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود اس جنگ کا کنٹرول حاصل کر لے اور آئی ایس آئی کا کردار محض بارہویں کھلاڑی کا ہو کر رہ جائے۔ امریکی سفارتکار ہمیشہ خواہش کرتے تھے کہ افغان راہنماؤں کے ساتھ ان کی ملاقات کا اہتمام کیا جائے اور وہ ان لوگوں کو امدادی رقوم اور دیگر سامان خود اپنے ہاتھوں سے دیں تاکہ

افغان راہنما امریکہ کے مرہون منت رہیں۔ آئی ایس آئی کو امریکہ کی اس خواہش کی تکمیل سے باز رکھنے کے لئے خصوصی منصوبہ بندی کرنا پڑی، کیونکہ ان کی اس خواہش کی تکمیل کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ نے افغان جدوجہد کو ہائی جیک کر لیا ہے۔

دراصل امریکہ براہ راست اس جدوجہد کو کنٹرول کر کے افغانستان میں امریکہ کی حامی ایک ایسی حکومت کے قیام کا خواہاں تھا جو کلیتاً سیکولر ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو ہم نے فوری طور پر اس کی اطلاع صدر پاکستان کو دی۔ انہوں نے جب اس معاملے پر امریکیوں سے بات کی تو وہ اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے نزدیک یہ ناممکن بات تھی۔ مگر جب تیسرے ہی دن افغان مہاجرین اسلام آباد میں آنا شروع ہوئے تو امریکیوں کو "علم" ہوا کہ افغانستان پر روسی قبضہ ہو چکا ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ انہیں روسی حملے کا بہت پہلے سے علم تھا۔ مگر امریکی ہمیں یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ یہ حملہ ان کے لئے بھی حیرت کا باعث ہے۔ روسی فوجوں کی افغانستان میں آمد یقینی طور پر امریکیوں کے ایک بڑے منصوبے کا حصہ تھی، اس جنگ میں امریکہ کے منفی کردار کا تفصیلی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ انہوں نے پوری جدوجہد کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیا اور آئی ایس آئی کے کردار کو بھی سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لئے ایک علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے)

دوسرا معاملہ منشیات کا تھا۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ منشیات نے امریکہ کی خارجہ پالیسی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ پاکستان میں بھی انہوں نے ہماری قدروں اور اخلاقیات کی تباہی کے لئے منشیات کے ہتھیار کو کامیابی سے استعمال کیا۔ ہمارے پاس یہ اطلاعات بھی موجود تھیں کہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر مغربی ممالک کے سفارت خانوں سے منسلک ڈرگ لیزان آفیسرز (DLO) نے بجائے خود اپنی حکومتیں قائم کر رکھی ہیں اور وہ ہمارے دفتر خارجہ کی اجازت کے بغیر پاکستان کے ہر حصے میں گھومتے تھے اور جاسوسوں کا ایک جال بچھا رکھا تھا جو ان کے لئے وہ معلومات بھی اکٹھی کرتے تھے جن کا انسداد منشیات سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے بلیک میلنگ سے لے کر بھاری رشوتیں تک دینے کا سلسلہ جاری رکھا اور کھلے عام پاکستان کے تحفظ کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

منشیات کے عالمی سوداگروں کو پکڑنے کے لئے یہ طریقہ کار وضع کیا گیا تھا کہ وہ اپنے منتخب شدہ کسی "کیریئر" کو منشیات کی تھوڑی سی مقدار دے کر باہر بھیجیں گے تاکہ امریکہ اور یورپ

میں ان کی مدد سے پورے گینگ کو پکڑا جا چکے۔ مگر انسداد منشیات کے یہ ذمہ دار افسران طے شدہ تھوڑی مقدار سے کہیں زیادہ منشیات ان ''کیریئرز'' کے ہاتھ باہر بھجواتے رہے اور خود بھی بلا روک ٹوک جتنی اور جیسی منشیات کی قسم چاہیں لے جاتے تھے یوں نہ صرف اس مکروہ دھندے میں شامل رہے بلکہ انہوں نے منشیات کی عالمی منڈی میں لاکھوں ڈالر بھی کمائے۔ ہماری بے بسی دیکھئے کہ کسی ایجنسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ ان کے بھیجے گئے کیریئر یا ان کو چیک کر سکیں۔

امریکی امداد کا بہت بڑا حصہ منشیات کی فروخت سے حاصل شدہ رقم پر مشتمل تھا جو افغانستان کی مقدس جنگ پر استعمال ہو رہا تھا اور امریکہ اپنے ان ایجنٹوں کو جو پاکستان میں منشیات کے فروغ کی سرگرمیوں میں مصروف تھے اس فنڈ کی ادائیگی کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ امریکیوں نے اس سرگرمی کی آڑ میں پاکستان کے کونے کونے میں ہیروئن پھیلانے کے لئے جو مذموم کارروائی کی وہ بجائے خود امریکہ کی پاکستان کے ساتھ ''دیرینہ دوستی'' اور پاکستان کے عوام کے ساتھ ''دلی ہمدردی'' کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

امریکہ نے منشیات کے کنٹرول کے لئے پاکستان کی امداد کا سلسلہ 80-1979ء میں شروع کیا جب پوست کی کاشت انتہائی محدود پیمانے پر ہوتی تھی اور غریب کاشتکار محض اپنی علاقائی ضرورت کے مطابق یہ پودا کاشت کرتا تھا مگر اس امداد کی آڑ میں امریکہ نے بیورو آف انٹرنیشنل نارکوٹکس کے ذریعے ان کاشتکاروں کو پوست کی کاشت کے لئے خفیہ طریقوں سے اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے جدید ترین تکنیکی سہولتیں، ادویات، عالمی منڈیاں، محفوظ راستے اور سب سے بڑھ کر ان کے لئے براؤن اور سفید ''سونے'' کی انتہائی دلکش اور شاندار قیمتیں فراہم کیں۔ امریکہ کی ان کرم فرمائیوں کی بدولت اس وقت تقریباً چھ ہزار ہیکٹر اراضی پر پوست کاشت ہوتی ہے۔ انتہائی غیر ترقی یافتہ اور دور دراز علاقوں میں ہیروئن تیار کرنے کے 100 کے قریب کارخانے کام کر رہے ہیں۔ مقامی اور عالمی مارکیٹ میں اس وقت ہیروئن کی تجارت کے ''معزز پیشے'' سے ہزاروں کی تعداد میں ''شرفاء'' منسلک ہیں اور پاکستان میں ہیروئن کے عادی افراد کی تعداد تیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ افیون تباہی اور بربادی کے بجائے دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اسے ''ایٹم برائے سکون'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس بات کا بھی افسوس ہے کہ امریکی منصوبہ بندی اور ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کی منفی پالیسیوں اور منفی کردار کی

وجہ سے ہم قدرت کے اس عطیے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ حالانکہ یہی وہ پودا ہے جس سے ہیروئن حاصل کرنے کے بجائے مارفین، کوڈین اور تھیبائین جیسے مفید اور کارآمد عناصر حاصل کئے جا سکتے ہیں جو زندگی بچانے والے اور درد سے نجات حاصل کرنے والی ادویات کا ایک لازمی جزو ہیں۔ اگر ہم پوست کے پودے سے یہ عناصر حاصل کر کے عالمی منڈی میں بین الاقوامی دوا ساز اداروں کو برآمد کر رہے ہوتے تو پاکستان ہر سال لاکھوں ڈالرز کا زرمبادلہ کما سکتا تھا۔ ہمیں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے بھاری قرضے لینے نہ پڑتے۔ پاکستان کے کروڑوں عوام کی خوشحالی اور ترقی کا خواب ان بیرونی اور اندرونی ''خیر خواہوں'' کی وجہ سے ہی کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گا۔ بہرحال بوب کے بارے میں ان اطلاعات کے بعد ہم نے اسے مستقل نگرانی میں لے لیا مگر ہمارے کارکن ساتھی ان کے گھر آنے جانے والی گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں اور بوب کی آمد و رفت کے علاوہ اور کوئی مفید معلومات حاصل نہ کر سکے۔ ہم نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ بوب کے گھر میں جاسوسی کرنے والے خفیہ آلات نصب کر دیئے جائیں تاکہ مہمانوں کے ساتھ اس کی گفتگو سنی جا سکے۔ یہ فیصلہ بڑا نازک تھا مگر اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس کے نتائج ہمیں کسی مصیبت میں بھی گرفتار کروا سکتے ہیں۔ ہم یہ رسک لینے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک دن جب بوب دفتر میں تھا۔ ہمارا ایک آدمی نہایت ہوشیاری سے اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بوب کے بیڈ روم اور سائیڈ روم کی الماریوں میں انتہائی قیمتی اور جدید ترین رائفلیں، پستول، بندوقیں اور کیمرے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ایک باتھ روم میں چالو حالت میں ایک وائرلیس سیٹ بھی تھا۔ اسے بوب کے تکیے کے نیچے سے اس کا بٹوہ بھی ملا جو وہ شاید جانے کی جلدی میں بھول گیا تھا۔ اس بٹوے میں اس کا سی آئی اے کا شناختی کارڈ تھا۔ ہمارے آدمی نے سارے گھر کی تصاویر بنائیں، کارڈ کی تصویر بھی بنا کر اسے واپس اپنی جگہ رکھ دیا گیا اور خفیہ آلات لگا کر واپس آ گیا۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ سارے ہتھیار انسداد منشیات کے حوالے سے جمع کئے گئے ہیں یا بوب خود ہتھیاروں کی تجارت میں ملوث تھا؟ ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب تو نہیں تھا مگر بوب یقیناً غیر قانونی دھندے میں ملوث تھا۔ ہم نے ایک تفصیلی رپورٹ تصاویر کے ساتھ جنرل ضیاء کو اپنی اس رائے کے ساتھ بھجوا دی کہ بوب کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر پاکستان سے نکل جانے کا حکم صادر فرمایا جائے۔

چند روز کے بعد ہمیں یہ جواب موصول ہوا کہ صدر پاکستان نے دفتر خارجہ سے اس معاملے میں مشورہ کیا ہے اور ہمارے دفتر خارجہ کا خیال ہے کہ ہمیں یہ سب بھول جانا چاہئے۔ اس وقت پاکستان میں اور بھی بہت سے ''بوب'' ہیں اور ہم سب کو دھکے دے کر ملک سے باہر نہیں نکال سکتے اور اس وقت امریکہ کو ناراض کرنا بھی مناسب نہیں۔ اس لئے آئی ایس آئی کو چاہئے کہ بوب پر اپنا وقت ضائع نہ کرے۔

ہمارے ڈی جی، جنرل اختر عبدالرحمٰن کا اس جواب پر ردعمل قابل ستائش تھا، وہ کسی صورت بھی دفتر خارجہ کے مشورے پر آنکھیں موند لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہم نے اس صورتحال کے بارے میں کئی روز تک تبادلہ خیالات کیا، بہت سے راستے تلاش کئے، بالآخر جنرل نے کہا کہ اس بات کو خفیہ رکھتے ہوئے کہ ہم اس سلسلے میں کارروائی کر رہے ہیں، آپ جو چاہیں کیجئے مگر اس بات کا خیال رہے کہ کسی بھی کارروائی میں پکڑے جانے کا کوئی احتمال نہ ہو۔

جنرل صاحب کے اس حکم کے بعد ہم نے ایک تفصیلی منصوبہ تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا، جس کی انہوں نے منظوری دے دی۔

یہ منصوبہ کچھ یوں تھا۔ بوب کے گھر کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا غیر آباد زمین کا ٹکڑا تھا جس میں خودرو پودوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اسلام آباد میں ایسے کئی پلاٹ موجود ہیں۔ ہم نے اپنے منصوبے کے مطابق اس زمین پر بوب کے گھر کی بیرونی دیوار سے ملتی ہوئی، ایک خندق کھودی اور اسے جھاڑیوں اور پودوں سے ڈھانپ دیا۔ ہم نے مقامی پولیس کو یہ ''اطلاع فراہم'' کی کہ ہم نے اسلام آباد کی سڑکوں پر رات کی تاریکی میں مشکوک لوگوں کو گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ دہشت گردوں کا کوئی گروہ کسی بڑی واردات کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ ہم نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ ہمیں شک ہے کہ مختلف وارداتوں میں استعمال کیا جانے والا اسلحہ بھی انہوں نے کسی جگہ چھپا رکھا ہے۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ مجسٹریٹ کی قیادت میں ایک چھاپہ مار ٹیم کو کارروائی کے لئے تیار کیا جائے۔ ہم نے وائرلیس سے مسلح آئی ایس آئی کے ایک کارکن کو پولیس کے ساتھ لگا دیا تاکہ جب ہم کہیں وہ پولیس کو موقع واردات تک لے جائے۔

اس دوران ہم بوب کی حرکات وسکنات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ پھر وہ اچانک چند دنوں کے لئے پاکستان سے باہر چلا گیا اور منصوبہ روک دیا گیا۔ جب بوب واپس آیا تو کارروائی کا پروگرام اور وقت طے کر لیا گیا۔ حتمی کارروائی کے روز نگران ٹیم کے ارکان کو منتخب جگہوں پر تعینات

کر دیا گیا۔ آئی ایس آئی کے کارکنوں نے ایک بار پھر خاموشی سے بوب کے گھر کے دروازے کھولے اور گھر کے اندر موجود سارا اسلحہ پہلے سے کھودی گئی خندق میں جمع کر دیا۔ بوب اپنے معمول کے مطابق دفتر سے نکلا اور گھر کی جانب روانہ ہوا۔ ہم نے پولیس کو کارروائی کرنے کا کوڈ دے دیا۔ آئی ایس آئی کا کارکن پولیس پارٹی کو لے کر جائے ''واردات'' پر پہنچ گیا۔ پولیس پارٹی جب خندق تک پہنچی تو ان کی گاڑیوں کے شور نے پورے علاقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسی اثناء میں بوب بھی پہنچ گیا اور اپنی گاڑی گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد شور سن کر باہر آ گیا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کے گھر کے عقب میں کیا معاملہ درپیش ہے؟ وہاں کا منظر اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ پولیس اس کے گھر کے پچھواڑے سے اسلحہ ''برآمد'' کر رہی تھی۔ ڈیوٹی مجسٹریٹ نے ہتھیاروں کی فہرست بھی بنانا شروع کر دی تھی، اپنے ہتھیار اور کیمرے دیکھ کر بوب کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے گھر کے اندر چلا گیا۔

امریکی سفارت خانے کے لئے اب اس سے بڑا اور کوئی ثبوت نہیں تھا۔ چنانچہ اگلے دو روز میں بوب پاکستان چھوڑ کر چلا گیا۔

ہمارا اگلا شکار امریکی انٹرنیشنل سکول اسلام آباد کا ایک استاد ریگن کلیگ تھا۔ وہ نہ صرف ہتھیاروں کی تجارت کرتا تھا بلکہ اس نے گھر میں ہتھیاروں کی ایک ورکشاپ بھی بنا رکھی تھی۔ کلیگ سے نمٹنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ ڈپلومیٹ نہیں تھا۔ ہم نے معمول کی منصوبہ بندی سے اسے بھی قابو کر لیا اور وہ بھی پاکستان کی سرزمین سے اپنا ناپاک دھندا سمیٹ کر واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ (ایفا صفحہ 62 تا 54)

O

1998ء میں لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے ایک افسر لوئیس البنجر (Lewis Elbinger) نے اپنے ہم خیال پاکستانی ''دوستوں'' میں ایک پرچہ تقسیم کیا جس کا نام تھا (VISION) یعنی ''خیال''۔ اس پرچہ میں اس نے وہ باتیں تحریر کی ہیں جو کہ امریکہ کا پاکستان کے متعلق تازہ ترین ایجنڈا ہے، اس نے لکھا:۔

''پاکستان ایک ٹوٹا ہوا بازو دکھائی دیتا ہے، پاکستان کی سوسائٹی بے کار ہے، جس میں سے ابھی تک انگریز کی غلامی کی بدبو آتی ہے۔ ہر طرف بے ایمانی کا دور دورہ ہے۔ صوبائیت کے

تعصب میں پھنسے ہوئے لوگ صرف ایک مذہب پر اکٹھے ہیں، عام آدمی بہت غیر مطمئن ہے ہر آدمی دوسرے ملک کی شہریت لینے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔"

اُن دنوں آئی ایس آئی کے لئے یہ چونکا دینے والی بات رہی ہوگی لیکن اس کے سے سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ اب وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ امریکی سفارتکاروں کی ر پاکستانی ہر طبقہ زندگی کی اہم شخصیت کے گھر تک ہوگئی ہے۔ نائن الیون کے بعد بیشتر پاکستانی آئی پیز امریکی قونصلیٹ کے کسی بھی کلرک سے تعلقات کو اپنے لئے اعزاز جاننے لگے ہیں آج 2009ء میں جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں پاکستانی اخبارات میں کالمسٹوں اور Called صحافیوں کی ایک فوج ظفر موج امریکی پالیسی کے مطابق پاکستان پر دشنام طرازی غلیظ الزامات لگانا، پاکستان کو ناکام ریاست ثابت کرنا اور ہر معاملے میں امریکہ کو اپنا مائی ماننے کے مشن پر گامزن ہے اور پاکستان کے حوالے سے کوئی بھی اچھی بات کہنے والے کو ر پسند اور آئی ایس آئی کا ٹاؤٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔ بدقسمتی کی انتہا تو یہ ہے کہ ہمارے انگر اخبارات سے منسلک کالم نگار ہر روز پاکستان کے خلاف نئی ہرزہ سرائی دریافت کرتے اور ڈنکا بجاتے ہیں۔ 1998ء کے اس پمفلٹ میں لکھا تھا۔ "پاکستان میں مذہب کے نام پر دوسرے کو قتل کیا جا رہا ہے، فرقہ واریت حد کو پہنچ گئی ہے اور پاکستان کے مسلمان ایک دوسرے کر کے اسی میں جنت کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ شاید جانور بھی اس طرح ایک دوسرے کا خون بہاتے۔"

اپنے پراپیگنڈے میں البنجر نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ پاکستان میں فرقہ وار قضیہ صرف چند سر پھرے اور ان پڑھ، مجرمانہ ذہنیت والے، دہشت گردوں تک محدود ہے، بھارت کی خفیہ ایجنسی "را" اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسی "موساد" پیسے دے کر یہ جرم کرنے کے پاکستان بھیجتی ہے۔ ورنہ پاکستان میں تو مکمل فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

البنجر امریکہ کی اس پود سے تعلق رکھتا ہے جس نے شروع ہی سے پاکستان کے نہ مانا اور جو خاص طور سے یہ اعتراض کرتے رہے کہ یہ کیسا ملک ہے جس کے مشرقی اور مغر کے بیچ 1000 میل کا فاصلہ ہے، نہ جانے امریکی مشرقی اور مغربی پاکستان کی بات کرتے یہ کیوں بھول جاتے تھے کہ الاسکا امریکہ سے ہزاروں میل دور ہے اور امریکہ نے اسے 67 میں روس سے 7200000 ڈالر کے عوض خریدا تھا، اور اسی طرح ہوائی بھی امریکہ سے بہ

ہے اور وہاں بسنے والے امریکیوں نے ایسی چالیں چلیں کہ حکومت کو نکال باہر کیا اور اپنا قبضہ جما لیا۔

البنجر امریکی فارمولا پیش کرتا ہے کہ دو قومی نظریہ سراسر غلط ہے اور ہندوستان تقسیم نہیں ہونا چاہئے تھا، اب ہونا یہ چاہئے کہ پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، مالدیپ اور سری لنکا بھارت میں ضم ہو جائیں تاکہ خطہ میں ایک مضبوط ملک بن جائے اور اس طرح کشمیر کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

البنجر آگے چل کر کہتا ہے کہ اسلام تو عرب کے فاقہ کش بدوؤں اور ہندوستان کے خوشحال کاشتکاروں کا ٹکراؤ ہے، اور سکھ مذہب ان دونوں عقیدوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے متحدہ ہندوستان کا مذہب بھی ایک ہونا چاہئے، سکھوں کو اپنے علیحدہ وطنیت کے لئے لڑنا نہیں چاہئے چونکہ یہ بابا گورونانک کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

جب البنجر سے سوال کیا گیا کہ اس وقت بھارت کی چودہ ریاستوں میں علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں، بھارت میں ذات پات کا جھگڑا اتنا پرانا اور طویل ہے کہ اب نچلی ذاتوں والے برہمن سے طاقت کے زور پر اپنا حق مانگ رہے ہیں، بھارت کے اخبارات لکھتے ہیں کہ بھارت میں سیاست دہشت گردوں اور غنڈوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، کئی وزیروں کے خلاف مقدمات چل رہے ہیں، رشوت، اقربا پروری، میں کئی ایک وزیر بھی شامل ہیں اور بہت سوں پر تو قتل اور اس قسم کے گھناؤنے جرائم کے الزام پر مقدمے بھی چل رہے ہیں، بھارت خود ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے، وہاں قیادت کا فقدان ہی نہیں، بھوک، ننگ اور جسم فروشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ان حالات میں اس سارے خطے کا ایک ملک میں ضم ہو جانا کیسے ممکن ہے؟ تو اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا، وہ صرف اپنے آقا (His Mastrs Voice) کی بتائی ہوئی بات کی رٹ لگاتا رہا اور کامیابی سے پاکستان کو دیوار کے ساتھ لگانے کی مہم پر گامزن ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بھارت کو پاکستان میں اپنے بغیر تنخواہ صرف وہسکی کی بوتل اور امرتسر یا پھر کسی اور بھارتی شہر میں عیاشی اور کنجر خانے کی معمولی پیشکش پر صحافیوں، دانشوروں، ہیومن رائٹس کے کرتا دھرتا اور کالمسٹوں کی ایک فوج میسر ہے۔

O

سی آئی اے کی پاکستان میں مداخلف؟

نائن الیون کے بعد سے دنیا کا منظر نامہ اتنی تیزی سے بدلا ہے کہ کل کے دشمن آ
دوست اور کل کے دوست آج کے دشمن بن گئے امریکہ اور بھارت جس طرح ایک دوسر
پوبنے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ماضی میں شاید ان میں اتنی قربت نہیں تھی لیکن یہ بات وہ لوگ کہ
جن کا مطالعہ بالکل ہی سطحی ہوتا ہے اور جو اخبارات کی خبروں یا پھر ٹی وی چینلز کے پروگرا
پڑھنے اور دیکھنے کے بعد خود کو سیاست اور تزویراتی غلام کے پاٹے خان سمجھنے لگتے ہیں۔
اطلاع کے لئے عرض ہے کہ بھارت اور امریکہ یعنی سی آئی اے اور ''را'' کی دوستی بہت قد
جس کا باقاعدہ آغاز 1962ء میں ہوگیا تھا۔

بنگالی مصنف مسعود الحق کی کتاب (RAW and CIA) 1990 میں منظر
آئی۔ یہ کتاب مصنف نے بنگالی زبان میں لکھی تھی۔ مسعود الحق متحدہ پاکستان کے بنگا
کریٹ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے خاصے معروف رہے ہیں۔ انہیں خصوص
سازشوں اور ''سی آئی اے'' کی پاکستان کے خلاف سرگرمیوں کو نزدیک سے دیکھنے کا
ہے۔ مسعود الحق کی اس بنگالی کتاب کا ترجمہ میزان علی نے کیا تھا جو یہ بتاتی ہے قیام پاکستا
فوراً ہی بعد پاکستان کے خلاف بھارت اور سی آئی اے نے مل کر سازشوں کا لامتناہی سلسلا
کر دیا جس میں تیزی 1962ء کی بھارت چین جنگ میں اس وقت آئی جب صدر جنرل
خان نے امریکہ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ چین کے مقابلے میں بھارت کی مدد کر
جنرل ایوب سی آئی اے کے ذریعے ہی برسر اقتدار آئے تھے۔ مسعود الحق کی کتاب کے د
باب کا عنوان ''چین بھارت سرحدی تنازعہ، سی آئی اے اور بھارتی خفیہ ادارہ'' ہے۔
فرمائیں:

1962ء میں بھارت اور چین کا سرحدی تنازعہ برصغیر کی سیاست میں ایک ڈرامائی تبدیلی لایا تھا۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ایوب خان کو ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور سی آئی اے کو اس کا منصوبہ بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دوسری طرف بھارت کی پاکستان کو توڑنے کی منصوبہ بندی اور مشرقی پاکستان کو ایک آزاد ملک قرار دینا جس کی ذمہ داری بھارتی انٹیلی جینس کو سونپی گئی۔ پہلے ہم سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایوب خان کو ہٹانے کے منصوبے کو دیکھتے ہیں لیکن اس موضوع کی طرف جانے سے پہلے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ایوب خان کے اختلافات پر بحث کریں گے۔ ایوب خان نے اکتوبر 1958ء کو امریکہ کی پشت پناہی سے پاکستان کا اقتدار سنبھالا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ نظر آیا کہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس سے منہ موڑ لیا ہے۔ ایوب خان امریکی پشت پناہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تبدیلی چین اور بھارت کے سرحدی تنازعہ کی لائی ہوئی تھی۔ دوسری طرف جس بھارت کو سامراجی طاقت کے خلاف تحریک کا ہراول دستہ ہونے کا دعویدار سمجھا جاتا تھا وہی امریکہ کی گود میں چلا گیا۔ بھارت کے بارے میں امریکی پالیسیوں میں تبدیلیاں آ گئیں۔ چین اور بھارت کی جنگ کے بعد کسی حد تک یہ تبدیلیاں آئیں اس کا اندازہ صدر کینیڈی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے اپنے خاص ایلچی ایوال ہیریمن کے ساتھ جانے والی گفتگو کے دوران دیا تھا۔

1963ء کے آغاز میں صدر جان ایف کینیڈی نے ہیریمن کو پنڈت جواہر لال نہرو کی اشتراکیت کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے بھارت بھیجا۔ دلی میں کچھ روز گزارنے کے بعد واشنگٹن روانگی کے لئے جس وقت وہ پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا کہ نہرو کا سوشلزم کمیونزم کے فروغ کو روکنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس نے نہرو کے سوشلزم کے لئے امریکی حمایت کا اظہار کیا۔ چین بھارت سرحدی تنازعہ کا آغاز اس وقت ہوا جب 13 راکتوبر 1962ء کو چین نے بھارت کو متنازعہ میک موہن لائن پر جموں کشمیر ریاست کے لداخ بارڈر سے اپنی فوج ہٹانے کے لئے کہا۔ بھارت کی طرف سے چین کے اس مطالبہ کو رد کرنے کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد 20 راکتوبر کو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ 20 رنومبر تک لداخ علاقے کے دو ہزار مربع میل علاقے پر چین نے قبضہ کر لیا۔ 21 رنومبر کو چین نے خود ہی جنگ بندی کا اعلان کر دیا اور قبضے میں لئے علاقوں سے اپنی افواج میک موہن لائن تک واپس بلا لیں۔ جنگ کے دوران 28 راکتوبر کو امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے بذریعہ خط صدر ایوب کو

چین کو روکنے کے لئے بھارت کی مدد کرنے کے لئے کہا۔ خط میں کینیڈی نے مسئلہ کشمیر کو علاقائی تنازعہ قرار دیا اور یقین دہانی کروائی کہ وہ اس مسئلہ کی سنجیدگی سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ لیکن اس وقت اوّلیت چینی جارحیت کو روکنے کو دی جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بھارت کو باہر سے امداد بھی بھیجی جاسکتی ہے لیکن علاقائی تعاون سب سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں صدر کینیڈی نے اس خط کے ذریعہ بھارت کے ساتھ ایک امن معاہدہ، جو ایک دفاعی معاہدے سے مماثلت رکھتا ہو، کرنے کو کہا۔ ایوب خان نے اس تجویز کو رد کر دیا جس سے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ناراض ہوگیا۔ اس واقعہ کے تین سال پہلے ایوب خان کی چین کے ساتھ تعلقات جوڑنے کی کوشش پر امریکہ نے سرد رویہ اپنایا تھا۔ ایوب خان نے 1959ء میں پاکستان اور چین کے درمیان سرحدیں طے کرنے کے ذریعے چین کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بدلے میں پاکستان نے اقوام متحدہ میں چین کی رکنیت کی تجویز کی حمایت کی۔ اقوام متحدہ کا دروازہ اس وقت بھی چین کے لئے بند تھا اور امریکہ کی خارجہ پالیسی کا اہم پہلو یہ تھا کہ چین کو اقوام متحدہ میں گھسنے نہ دیا جائے۔ چین کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے لئے ایوب خان کی کوشش پر امریکہ نے خاص کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ کیونکہ امریکہ کے دشمنوں کی فہرست میں ماؤزے تنگ کا نام سب سے اوپر تھا۔ چین کے ساتھ سرحدیں طے کرنے کے بعد پاکستان کے تعلقات دن بدن اچھے ہوتے رہے اور پاکستان چین کا سرفہرست دوست بن گیا۔ اس وقت امریکہ کا اوّلین کام یہ تھا کہ ہر صورت کمیونزم کو روکا جائے۔ وہ بڑے کمیونسٹ ملک، چین اور سوویت یونین کے اثر کو محدود رکھا جائے۔

سوویت یونین کے ساتھ امریکہ کے سفارتی تعلقات بہرحال موجود تھے لیکن چین کے ساتھ اس کے کسی قسم کے بھی تعلقات نہیں تھے۔ 1949ء کے ماؤزے تنگ کے کمیونسٹ انقلاب سے لے کر 1971ء کے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے چین کے سفر تک سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی نظر میں چین ممنوعہ علاقہ تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بڑھانے کی کوشش کو امریکہ نے اچھی نگاہ سے نہ دیکھا اور یہی لازم تھا کہ اس ملک کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنے والے لوگوں کو امریکہ بلیک لسٹ کر دے گا۔ چین کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی کوشش کے سلسلے میں ایوب خان کے سابقہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ناپسندیدہ شخص قرار پائے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ہٹانے کے لئے ایوب خان پر مسلسل امریکی دباؤ رہا۔ لیکن ایوب

ن نے سارے دباؤ کے باوجود بھٹو کو ان کے عہدہ پر برقرار رکھا۔ اس پر بھی ایوب خان خلاف فی رویہ میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف ملک سے سی آئی اے کا خفیہ اڈا ہٹا کر ایوب خان نے ویت یونین جو کہ امریکی دوستی کی وجہ سے پاکستان کا دشمن تھا، کے ساتھ دوستی کرنے کی سعی کی۔ 6 کی دہائی میں پاکستان اور سوویت یونین کے انقلاب ایک دوسرے پر بے اعتمادی اور تلخی پر بتل تھے۔ اس ہی دور میں پشاور کے بڈابیر علاقے میں سی آئی اے کا وہ خفیہ اڈا تھا۔ جس سے ی آئی اے U-2 جاسوسی طیارہ سوویت یونین پر جاسوسی پرواز کے لئے اڑاتا تھا۔ سوویت زائل نے U-2 جاسوسی طیارہ مار گرایا اور پائلٹ گیری پاور کو تحویل میں لے لیا۔ اس وقت کے ویت وزیراعظم نکیتا خروشیف نے یہ دھمکی دی کہ پشاور کا سی آئی اے کا خفیہ اڈا امریکیوں کی راضگی مول لے کر بند کرنا پڑا۔ اس واقع کے بعد سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ایوب خان کو ہٹانے کا ملہ کرلیا۔ ایوب خان کی خارجہ پالیسی میں سوویت یونین کے بارے میں تبدیلی ظاہر ہونا شروع ئی۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ جس امریکی مدد سے ایوب خان 1958ء میں سر اقتدار آئے، اسی ایوب خان نے اپنے تین سال کے اندر یعنی 1961ء میں اپنے خیر خواہوں کے ساتھ کیوں منہ موڑ لیا؟ 50 کی دہائی کے آخر میں پاکستان میں ایک نو دولت مند طبقے کا ابھار ا جو کہ سامراجی سرمایہ دارانہ اجارہ داری کی وجہ سے پھل پھول نہیں سکتا تھا۔ پاکستان میں ان کی رمایہ کاری ملک میں بھاری صنعتیں لگانے کے راستے میں ایک رکاوٹ بن گئی جو کہ ایک وسیع نعت کاری کے لئے خاص طور پر ضروری تھیں۔ چونکہ ایوب خان ابھرتے ہوئے کاروباری طبقہ ی نمائندگی کرتا تھا لہٰذا اس کے اپنے طبقاتی مفاد کی وجہ سے سامراجیوں کے ساتھ اس کا تضاد بننا زمی تھا۔ ایوب خان کے فرینڈز ناٹ ماسٹرز کے اپنے الفاظ ہیں:

''اگر ترقی یافتہ ملک ہمارے ساتھ تجارت کرنا ہی نہ چاہیں تو ہم کیا کریں؟ ہم اپنی رآمدات کی شکل میں ان کی اشیاء کو اپنے ملک میں کیسے کھپائیں جبکہ ہم ان کا قرض ہی نہیں اتار پا ہے اور ہم ان کے قرض پر چڑھنے والا صرف سود ہی کیسے اتاریں گے؟ ان متضاد مفادات کے تیجے میں کسی نہ کسی دن ایک بڑا تضاد ضرور ابھرے گا۔ میرے خیال میں اس تضاد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رمایہ دار ملک ایک نہ ایک دن منہ کی کھائیں گے۔ وہ لوگ ہمارے لئے اپنی منڈیاں نہیں کھولتے ر اپنا صنعتی ڈھانچہ نہیں بدلتے تاکہ چھوٹے ملکوں کو اپنی ضرورت کے مطابق مقابلتاً کم معیاری یزیں خود تیار کرنے میں آسانی ہو..... مثلاً سارے امریکیوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ

پاکستان سے سالانہ ڈھائی کروڑ گز کپڑا درآمد کریں گے۔ یہ مقدار مضحکہ خیز حد تک کم ہے۔ کپ
پاکستان کی ایک اہم برآمدی جنس ہے۔ دوسری برآمدی اجناس کی طرف بھی یہی رویہ ا
گیا..... کچھ سال پہلے تک برطانیہ کے ساتھ لین دین کے سلسلے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آ
تھی لیکن پاکستان سے درآمدی روئی پر کوٹہ لاگو کر دیا گیا۔ 1962ء میں برطانیہ کی دولت مشتر
کے سیکرٹری ڈنکن سینڈس سے بات چیت کرتے ہوئے میں نے یہ موضوع چھیڑا۔ اس نے بتا
پاکستانی کپڑا لینے سے مانچسٹر کی ٹیکسٹائل کی صنعت بُری طرح متاثر ہوتی ہے اور حکومت کو ما
کے لوگوں کے ووٹوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اسی موضوع پر وزیراعظم میک ملن
کہا۔ ''ہمیں اپنی تجارتی پالیسی اپنے ووٹروں کی رائے کو مدنظر رکھ کر بنانا پڑتی ہے اور ہم ان لو
کی رائے کو ٹھکرا نہیں سکتے''۔

..... ''تو پھر ہم صرف یورپ اور امریکہ کے ساتھ ہی اپنے تجارتی روابط کیوں رکھ
جس کے ساتھ بھی ممکن ہو ہم اپنے تجارتی روابط استوار کریں گے اور ایسی پالیسی اپنائیں گے
ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کی ضرورت کی مصنوعات بھی بنائیں''..... ''اسی بہت اہم موضو
میں نے افروایشیائی ملکوں کی دوسری سربراہ کانفرنس منعقد کروانے کے لئے اپنی پُرزور حما
اظہار کیا''۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹرز 184-185)

افروایشیائی ملکوں کی دوسری سربراہ کانفرنس ستمبر 1965ء میں منعقد ہونا تھ
سربراہ کانفرنس منسوخ کر دی گئی حالانکہ ایوب خان اس کے انعقاد کا پُرزور حامی تھا۔ اگر
کانفرنس منعقد ہوتی بھی، تو بھی اس میں شرکت کرنا ایوب خان کے لئے ایک ڈراؤنا خوا
گیا۔ سی آئی اے 6 ستمبر کو پہلے ہی اس پر دھاوا بول چکا تھا اور وہ سی آئی اے کی چال کا
کرنے کے لئے بھارت کے ساتھ جنگ کے محاذ پر تھا۔ دوسری افروایشیائی کانفرنس میں
شرکت کی وجہ سے ایوب خان کو معزول کرنے کے سوا سی آئی اے کے پاس اور کوئی چارہ کار
ایوب خان اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ اس نے سربراہ کانفرنس میں ملائیشیا کی شرکت کی مخا
جبکہ اس کے ہم عہدہ وزیراعظم جواہر لال نہرو بڑی شدومد کے ساتھ کانفرس میں اس کی شر
حمایت کر رہے تھے۔

تنکو عبدالرحمان کی قیادت کے تحت ملائیشیا کے وفاق میں کچھ متنازعہ جزیرے بھ
تھے۔ اسے 1964ء میں انڈونیشیا کی طرف سے اچانک شدید دشمنی کا سامنا کرنا پڑا

ینکارنو کے نزدیک ملائیشیا کا معرض وجود میں آنا اس علاقے کے لوگوں کے خلاف جدید سامراج
ا ایک سازش تھی۔ ''ملائیشیا کچل دو'' کے نام سے 21 ہزار مسلح افراد کی طاقت سے ایک پالیسی
ائی گئی جنہیں انڈونیشیا کے اس وقت کے وزیراعظم ڈاکٹر سوباندرو نے منظم کیا، دوسری طرف
ریکہ نے ملائیشیا کو سیکورٹی کونسل میں عارضی رکنیت لے دی۔ جس کے خلاف احتجاج کے طور پر
ینکارنو اقوام متحدہ سے نکل آئے۔ انہوں نے اقوام متحدہ کو سامراج کی شطرنج کا ایک مہرہ قرار دیا
رتیسری دنیا کے ممالک کو بھی اپنی اقوام متحدہ بنانے کی اپیل کی اور اسی نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے
ہوں نے دوسری افروایشیائی سربراہ کانفرنس منعقد کروانے کی تیاری خود اپنے ہاتھوں میں سنبھال
ا۔ 1965ء کی جولائی میں دوسری افروایشیائی کانفرنس منعقد کروانے کا فیصلہ کر لیا گیا جو کہ الجزائر
کے دارالحکومت الجیرز میں منعقد ہونا تھی لیکن کانفرنس منعقد ہونے س چند ہی مہینے پہلے مہوری
ومیدین کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں اٹل رہے اور یہ اسی سال جولائی کے بجائے ستمبر میں
نعقد کروانے کا اظہار کیا۔ ایوب خان کانفرنس میں سوویت یونین کی شرکت کی حمایت میں اور
لائیشیا کی شرکت کے خلاف اڑ گئے جبکہ بھارت کے وزیراعظم نہرو کا موقف ایوب خان کے بالکل
لٹ تھا۔ انہوں نے ملائیشیا کی شرکت کی حمایت میں نقطہ نظر اپنایا۔ اس کے بعد سیاسی شعور رکھنے
والے کسی شخص کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ ایوب خان سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی نظر سے کتنا
گر گئے۔ اس سلسلہ میں ہمیں جی۔ ڈبلیو چودھری کی کتاب ''متحدہ پاکستان کے آخری ایام'' سے
کچھ مدد ملتی ہے۔

1965ء میں اپریل کی تین تاریخ کو ایوب خان ماسکو کے دورے پر روانہ ہو گئے۔
ان کا وہاں سے براہ راست واشنگٹن جانے کا ارادہ تھا۔ ایوب خان کے اس دورے کا مقصد یہ تھا
کہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ان کا کوئی سمجھوتہ طے پا جائے۔ ان کے اس سفر کے منصوبے کو
سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بہت بُری طرح رد کر دیا۔ صدر لینڈن جانسن نے ایوب خان کو یہ بھی مطلع
کر دیا کہ واشنگٹن میں اسے خوش آمدید نہیں کیا جائے گا۔ اس سے عیاں ہے کہ واشنگٹن کے لئے
ایوب خان کی ضرورت کافی پہلے ہی ختم ہو گئی تھی اور جب سے ان کی ضرورت ختم ہو گئی تب سے ان
کی قیمت بھی طے ہو گئی۔ امریکی انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا کہ ایوب خان کو جانا چاہئے اور اس فیصلہ
کے مطابق سی آئی اے نے اپنی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ جس میں ما یک طرف ملٹری دباؤ ڈالنا
اور دوسری طرف سیاسی دباؤ ڈالنا شامل تھا۔ سیاسی دباؤ ملٹری دباؤ کا نعم البدل تھا جو کہ اوّل الذکر

کی ناکامی کی صورت میں بروئے کار لایا جانا تھا۔ امریکہ کا فوجی دباؤ 1965ء کی پاک بھار
جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا اور 1966ء کی پانچ اور چھ فروری کو لاہور میں ملک کی پانچ دا
بازو کی پارٹیوں کے منعقد ہونے والے کنونشن میں آل پاکستان عوامی لیگ کی مشرقی پاکست
صوبائی کمیٹی کے سیکرٹری شیخ مجیب الرحمٰن کا مجوزہ چھ نکاتی پروگرام حقیقتاً مذکورہ سیاسی دباؤ تھا۔

ایوب خان سی آئی اے کی طرف سے ڈالے گئے دباؤ میں آ رہے تھے۔ اس
بارے میں پاکستانی انٹیلی جینس اس وقت باخبر ہوئی جس وقت ایوب خان بیرونی فوجی دبا
سامنا کرنے کے لئے پہلے ہی جنگ کے محاذ پر تھے۔ پاکستانی انٹیلی جینس کو اس کا انکشاف
میں مقیم اپنے ایک قابل اعتماد ذریعے سے ہوا۔ یہ باخبر ذریعہ ہالینڈ میں مقیم پاکستان کا سفیر ہی
یہ شخص مرکزی حکومت میں سیکرٹری تعلیم تھا۔ اسے چین کا خاص حامی ہونے کے ناطے امریکہ
کے تحت ایوب خان نے اس کے عہدے سے ہٹا کر ہالینڈ میں سفیر مقرر کر دیا تھا۔ اس کی دوس
کے ایک اعلیٰ افسر سے تھی جس کا عہدہ جنرل کے مساوی تھا۔ نیٹو کا وہ جنرل دلندیزی تھا۔

اس جنرل نے مذکورہ سفیر پر انکشاف کیا کہ ستمبر 1965ء میں دو ایشیائی ر
پاکستان اور انڈونیشیا سی آئی اے کے وار کے نیچے آئیں گی۔ اسے ایوب خان کو ہٹانے کے
حکومت پر ڈالے جانے والے صرف بیرونی فوجی دباؤ کے بارے میں ہی علم تھا۔ اس
انکشاف کیا کہ فوجی دباؤ کی ناکامی کی صورت میں ایک نعم البدل کے طور پر سیاسی دباؤ کی
دوسری سکیم پر عمل درآمد کیا جائے گا اور مزید یہ کہ اس چال کے لئے مشرقی پاکستان غالباً
کارآمد رہے گا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ اسی فوجی دباؤ
تھی اور چھ نکاتی پروگرام کا مقصد ایک اندرونی سیاسی دباؤ بڑھانا تھا۔

O

سی آئی اے کی بھارتی پشت پناہی

1962ء کے چین بھارت سرحدی تنازعہ کے دوران ایوب خان کے کردار کی وجہ سے پاکستان کی طرف بھارتی رویہ میں ڈرامائی تبدیلی آئی۔ اس نے پاکستان کے مشرقی زون میں ایک نئی ریاست کے قیام کے ذریعے اسے کمزور کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی منصوبہ بندی بھارتی انٹیلی جینس ادارہ کو سونپی گئی۔

1962ء میں اس وقت کی ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جینس بیورو (D.I.B) کو یہ معلومت حاصل ہوئیں کہ کلکتہ کے بھابھانی پور علاقہ کے ایک گھر میں قائم کئے گئے بھارتی انٹیلی جینس کے آپریشنل ہیڈ کوارٹر میں سواد ہین بانگلہ ہیپلو بی پوری شود (آزاد بنگال انقلابی کونسل) (ایس بی بی پی) نام سے ایک خفیہ تنظیم کا مرکز تھا۔ چتر نجن سوتر (1) اور کالی داس ودیا (2) نامی دو پاکستانیوں کے اس خفیہ تنظیم کے ساتھ قریبی روابط استوار تھے جس کے بارے میں ڈی آئی بی نے معلومات حاصل کیں۔ ڈی آئی بی انہیں ''را'' کے ایجنٹوں کے طور پر جانتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ سواد ہین بانگلہ ہیپلو بی پوری شود نے اپنی کارروائیاں اقلیتی علاقوں خاص کر فرید پور پر مرکوز کر رکھی ہیں۔

''را'' پہلے ہی طلباء میں سرائیت کر چکی تھی اور ڈی آئی بی کو اس کا کچھ علم نہیں تھا۔ ''را'' نے اپنی خفیہ تنظیم ایس بی بی پی کے ذریعے لیف لٹس تقسیم کئے جن میں بنگلہ دیش کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس وقت کے سٹوڈنٹ لیگ کے لیڈر اور بعد کے مجیب باہنی کے ایک اہم منتظم عبدالرزاق نے میرے ساتھ ایک انٹرویو میں دعویٰ کیا تھا کہ اس نے 1962ء میں ایسے لیف لٹس وصول کئے تھے جن میں آزاد بنگلہ دیش کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس وقت کے بی ایم کالج بریسال کے

سٹوڈنٹ لیگ کے لیڈر اور بعد کے مجیب باہنی کے ایک منتظم طفیل احمد نے بھی میرے ساتھ ا
انٹرویو میں انکشاف کیا تھا کہ اس نے 1962ء میں آزاد بنگلہ دیش کے مطالبے والے لیف
وصول کئے تھے۔ وہی لیف لٹس کھلنا کے مختلف علاقوں میں بھی دیکھے گئے تھے۔ یہ لیف لٹس
سے آرہے ہیں، اس کا کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ کھلنا کے پکچر پیلس سنیما ہال سے بھی کچھ لیف لٹس
تھے۔ فلم کا شو شروع ہونے سے کچھ لمحے پہلے اچانک بتی بجھ گئی اور اسی وقت لوگوں میں لیف
چھوڑے گئے تھے۔ 1969ء میں بھارتی انٹیلی جینس ایجنسی کو دوبارہ منظم کیا گیا اور اس
ریسرچ اینڈ انیلسز ونگ جس کا مخفف ''را'' تھا، رکھا گیا۔ ''را'' بننے کے بعد سابقہ بھارتی
جینس ایجنسی کا بنایا ہوا ادارہ طلبہ میں بہت متحرک ہوگیا۔

1965ء کی جنگ کے دوران پاکستان کے مرکزی وزیر خزانہ شعیب نے ایک ا
سفارت کار سے ملاقات کی۔ اگلے روز ڈی آئی بی کے اس وقت کے چیف اے بی اعوا
شعیب کے ساتھ ملاقات کی اور ان سے دریافت کیا کہ امریکی سفارتکار کے ساتھ انہوں۔
موضوع پر بات چیت کی ہے۔ شعیب، انٹیلی جینس چیف کے اس سوال پر غصہ کھا گئے۔
نے پوچھا کہ آپ نے کس حیثیت سے یہ حماقت کی ہے۔ انٹیلی جینس چیف کی طرف سے ش
صدر کا خفیہ حکم دکھاتے ہی وہ نرم پڑ گئے اور امریکی سفارت کار کے ساتھ ہونے والی اپ
چیت کی تفصیل پیش کی۔ جنگ کے بعد ایوب نے شعیب کو برطرف کر دیا۔

مغربی پاکستان کے گورنر نواب امیر محمد خان کالا باغ کے بارے میں ڈی آ
شکوک وشبہات تھے۔ جنگ کے دوران ان کے لاہور سے کراچی اچانک دورے پر ڈی آ
حرکت اور بھی تیز ہوگئی۔ کالا باغ اس وقت بھی صدر کے خفیہ حکم کے بارے لاعلم تھے اور حتیٰ
خزانہ سے کی گئی پوچھ گچھ کے بارے میں بھی انہیں کوئی علم نہیں تھا۔ امیر محمد خان کالا باغ کرا
مغربی پاکستان ہاؤس میں ٹھہرے۔ آدھی رات کے وقت نظر آیا کہ کالا باغ کی گاڑ
پاکستان ہاؤس سے نکل رہی ہے جس میں سواریاں صرف دو تھیں جن میں سے ایک وہ خود
ان کا ڈرائیور تھا۔ دوسری طرف امریکی سفیر میگ نوگی کی رہائش گاہ سخت نگرانی میں تھی او
ذمہ داری ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جینس بیورو کے ایک اعلیٰ افسر پر تھی جو ایک بنگالی تھ
فون پر اطلاع دی گئی کہ گورنر کی گاڑی مغربی پاکستان ہاؤس سے نکل چکی ہے جس پر وہ مز
ہوگئے۔ باز کی طرح انہوں نے اپنی آنکھیں میک نوگی کے گھر پر جما دیں۔ کچھ دیر بعد نہ

گورنر کی گاڑی سفیر کی رہائش گاہ کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ جتنی دیر تک گورنر واپس نہ آئے
نی دیر تک وہ نگرانی کرتے رہے۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد امیر محمد خان میک نوگی کے گھر سے نکل آئے۔

انٹیلی جینس افسر نے رات ہی کو غیر معمولی ٹاپ سیکرٹ نشان دے کر اس اطلاع کو
پنے چیف ای بی اعوان کو بھیج دیا۔ اگلے روز صبح کو اے بی اعوان نے یہ اطلاع صدر تک پہنچا دی۔
یوب خان نے اگلے دن امیر محمد خان کالا باغ کو راولپنڈی طلب کیا۔ ایوب خان کے ساتھ ان کی
کیا بات چیت ہوئی یہ معلوم نہ ہو سکا لیکن جنگ ختم ہونے کے تین ماہ بعد کالا باغ جیسے مضبوط آدمی
کو قتل کر دیا گیا۔

سی آئی اے نے یہ بھی حساب لگایا ہوا تھا کہ وہ پڑوسی ملک پاکستان اور ہندوستان کی
جنگ کے دوران ماسکو کا کیا کردار ہو سکتا ہے۔ سی آئی اے کے حساب کے مطابق جنگ چھڑنے
کے نتیجے میں پاکستان پیکنگ کی امداد پر شدید انحصار کرے گا، جس میں ماسکو خاموش مبصر کا کردار ادا
کرے گا اور اسی باعث سی آئی اے کو اپنے منصوبہ پر عملدرآمد کرنے میں آسانیاں پیدا ہوں گی
لیکن ایوب خان کی اپیل پر روسی قیادت کے جواب سے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ حیران ہوگیا۔ ماسکو
آخری لمحے میں یہ منصوبہ اس طرح ناکام کر دے گا یہ سی آئی اے کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔
روسی وزیراعظم الیکسی کوسیگن کی براہ راست مداخلت سے 17 ستمبر کو برسر پیکار دونوں دھڑوں نے
جنگ بندی کا اعلان کیا اور جنوری 1966ء کو پاک بھارت سربراہ ملاقات میں ایوب خان اور
بھارت کے وزیراعظم لال بہادر شاستری کا تاشقند میں آمنا سامنا ہوا۔ کوسیگن کی کوشش کی وجہ
سے یہ سربراہ ملاقات ناکام ہوتے ہوتے بچ گئی اور دونوں راہنماؤں نے ایک امن سمجھوتہ پہ دستخط
کئے۔ جنگ بندی اور تاشقند معاہدہ نے ایوب خان کی شخصیت کو نہ صرف فوج میں ٹھیس پہنچائی بلکہ
پورے پاکستان بھر میں ان کے خلاف آہستہ آہستہ مظاہروں نے جڑ پکڑنا شروع کی۔ اس کا اظہار
راولپنڈی کے طلباء کے احتجاجی مظاہروں سے ہوتا ہے۔ اس مظاہرہ میں پولیس نے گولی چلا دی
جس کے نتیجے میں پورا مغربی پاکستان ایوب کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری طرف 1965ء کی
جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا۔ مغربی پاکستان پر بھارتی حملہ کے
دوران مشرقی پاکستان کے عوام نے اپنے آپ کو بہت ہی غیر محفوظ تصور کیا۔ ''مشرقی پاکستان کے
دفاع کا انحصار مغربی پاکستان کی فوجی طاقت پر ہے۔'' انہوں نے محسوس کیا کہ پاکستانی جرنیل کی
یہ دفاعی حکمت عملی محض ایک دھوکہ ہے۔ پاکستانی سرکار کی طرف سے بنگالیوں کو خود دفاع سے محروم

کرنے کی ایک اور مثال 1965ء کی جنگ میں سامنے آئی جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان لوگوں نے ردعمل ظاہر کیا۔ جنگ کے دوران روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں بڑھتی گئیں؛ سے لوگ بہت تنگ آ گئے تھے۔ لہٰذا ماسکو کی مداخلت کی وجہ سے ایوب کو ہٹانے کا منصوبہ کامیا نہ ہوا لیکن اب جنگ کے بعد عوامی ردعمل کو استعمال کرنے کا موقع سی آئی اے ڈھونڈ رہا تھا آئی اے اب سیاسی دباؤ کے دوسرے منصوبہ کو لے کر میدان میں آ گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ چھ نکات ہی سی آئی اے کا دوسرا سیاسی دباؤ کا منصوبہ تھا۔

O

گھناؤنے کھیل کا آغاز

ہماری من حیث القوم کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم اچھا کام بُری نیت سے شروع کرتے ہیں اور اس کا انجام قانون فطرت کے منافی پازیٹو چاہتے ہیں۔ جہاد افغانستان کا یہی المیہ ہے۔ لاکھوں انسانوں نے اپنی جانیں کمیونسٹ لامذہب اور اسلام دشمن روس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے قربان کیں لیکن ان لاکھوں میں سے بمشکل چند درجن ایسے ہوں گے جو اس کی اصلیت سے آگاہ تھے؟ مجھے 2005ء میں جارج کرائیل George Crile کی افغان جہاد پر لکھی کتاب پڑھنے کا موقعہ ملا، کتاب کا نام ہی ہمارے ان عقل کے اندھوں کے چودہ طبق روشن کرنے کے لئے کافی ہے جو محض اپنی انا کی تسکین کے لئے اس ''جہاد'' کی اصلیت پر پردہ ڈال کر دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو الو بناتے رہے۔ کتاب کا نام ہے:

CHARLIE WILSON'S WAR

The Extraordinary Story of the Largest Covert Operation in History

چارلی ولسن ایک امریکی کانگریس مین کا نام ہے جو جنگ ویت نام کا زخم خوردہ فوجی تھا اور جس کے دل میں یہ خواہش ہمیشہ موجود رہی کہ وہ ویت نام میں اپنے ساتھیوں کی موت، ذلت آمیز پسپائی اور امریکیوں کے بزدلانہ فرار کا بدلہ روس سے لے۔ سی آئی اے سے اپنے خصوصی تعلقات کی بنیاد پر اس نے ''جہاد افغانستان'' کا جہادی آپریشن ترتیب دیا۔

کتاب کے آغاز میں ''عرض مصنف'' کے عنوان سے لکھے دیباچے کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔ جارج کرائیل لکھتا ہے:

''افغانستان سی آئی اے کی شاندار خفیہ جنگ تھی جو اس نے کانگریس میں بحث اور گلیوں بازاروں میں جلسے جلوسوں کا دردسر مول لئے بغیر لڑی اور جیت گئی۔ یہ نہ صرف سی آئی اے

کا ایک بڑا آپریشن تھا بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ کافی حد تک امریکیوں کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی گئی۔ جب نائن الیون کے تناظر میں اس کی گونج امریکی کانوں تک پہنچی تو ماضی میں اتنے بڑے پیمانے پر مسلم انتہا پسندوں کی بڑی فوج کو امریکی امداد پر تنقید ہونے لگی اور اسے غیر ضروری خیال کیا جانے لگا۔ دس سالہ دور جنگ میں سی آئی اے نے کروڑوں کی تعداد میں گولیاں اور گولے ہزاروں کی تعداد میں مختلف نوعیت کے انتہائی خطرناک ہتھیار بین الاقوامی سرحد کے آر پار خچروں، اونٹوں اور گدھوں پر سمگل کر کے افغانستان پہنچائے۔ ایک ایسا دور بھی آیا جب تین لاکھ مسلم ''فنڈامنٹلسٹ'' سی آئی اے کے فراہم کردہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر افغانستان میں موجود تھے۔ ان میں سے ہزاروں کو امریکنوں نے گوریلا جنگ کی جدید ترین تربیت دی تھی اور سی آئی اے کے تربیت یافتہ ان انتہا پسند مسلمانوں نے 28 ہزار روسی فوجیوں کو قتل کیا۔

15 رفروری 1989ء کو جب آخری روسی سپاہی نے افغان سرحد سے قدم باہر رکھے سی آئی اے نے فتح کا جشن منایا۔ اس روز اسلام آباد میں سی آئی اے کے ذیلی ہیڈکوارٹر سے کیبل پیغام آن ایئر گیا وہ تھا "WE WON" (ہم جیت گئے)۔

مصنف اس بات پر شاکی دکھائی دیتا ہے کہ روس کی شکست دریخت کا کریڈٹ مسلمان صرف ''اللہ'' کو کیوں دیتے ہیں؟ جبکہ اس جنگ کی فتح میں مرکزی کردار سی آئی اے اور امریکی ڈالروں نے ادا کیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس ''جہاد'' کی کامیابی میں امریکہ کے مرکزی کردار کو نظر انداز کرنا زیادتی ہے اور اس نے یہ کتاب دراصل اسی لئے لکھی ہے کہ اس بنیادی غلطی کی اصلاح ممکن ہو کہ اس جہاد کی فتح میں سب سے اہم کردار ''سی آئی اے'' نے ادا کیا تھا۔

کتاب کا آغاز "ntroduction: A Strange Awart at Langley" کے عنوان سے ہوتا ہے جس میں مصنف نے چارلی ولسن کا تعارف کروایا ہے۔ جارج کرائیل لکھتا ہے ''جون 1993ء کے ایک گرم دن جارج واشنگٹن میموریل پارک جو دریائے پوٹامک اور وائیٹ ہاؤس سے دس منٹ کی دوری پر واقع ہے کہ دروازے سے ایک ایئر کنڈیشنڈ آرام دہ بس داخل ہو رہی تھی۔ ''لینگلے ہیڈکوارٹر سی آئی اے'' کی پارکنگ مڈولی میڈلین بولیوارڈ کے پاس بس رکی جہاں سامنے گھاس سے لہلہاتی گراونڈ کے ایک کونے میں پھولوں کی ٹوکریاں ایک چھوٹی سی یادگار کے سامنے دھری تھیں۔ یہ ان دو امریکی سی آئی اے آفیسرز کی یادگار تھی جو تین ماہ پہلے اسی جگہ ایک پاکستانی سی آئی اے ایجنٹ کے ہاتھوں اے کے 47 کی گولیوں سے مارے

گئے تھے۔ سی آئی اے کے آفس میں داخلہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن اس بس کو سیکورٹی چیک کے مراحل سے بھی نہیں گزرنا پڑا کیونکہ اس میں وہ شخص سوار تھا جس نے سی آئی اے کی 46 سالہ سرد جنگ یعنی کولڈ وار Cold War کے خاتمے میں سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ آخری چیک پوسٹ پر بس رکی تو سی آئی اے سیکورٹی افسر آگے بڑھا جسے دیکھ کر ایک شخص باہر آیا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا.....

''میں کانگریس مین چارلی ولسن ہوں اور میرے ساتھ بس میں وہ لوگ سوار ہیں جو اس تقریب میں شرکت کرنے آئے ہیں''۔

سیکورٹی چیف نے ریاست ٹیکساس کے اس لمبے تڑنگے کانگریس مین کے حاکمانہ انداز گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے تعظیم دی اور ڈائریکٹر انٹیلی جینس کو اس کے مہمانوں کی آمد سے باخبر کرتے ہوئے بس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

یہ 9 رجون 1993ء کا دن ہے جب چارلی ولسن کی عمر سات دن کم 60 سال ہو گئی ہے۔ لکڑی کے فرش سے بنے ایک خوبصورت ہال میں سی آئی اے کی اہم شخصیات اور امریکہ کے چنیدہ مہمانوں کے ساتھ یہ لوگ یہاں جشن فتح منانے اور اس فتح میں چارلی ولسن کی عظیم خدمات کو نذرانہ عقیدت گزارنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ مہمانوں کی تواضع دنیا کی قیمتی شراب اور شباب سے کی گئی جس کے بعد سی آئی اے ہیڈکوارٹر کے ایک آڈیٹوریم میں سب کو جمع کیا گیا جہاں ان سب کو یہ بتانے کے لئے کہ انہیں یہاں کیوں زحمت دی گئی ہے ایک بڑی سکرین لگائی گئی تھی جس پر لکھا تھا.....

"CHARLIE DID IT"

President Zia-ul-Haq of Pakistan explaining the defeat of the Russia in Afghanistan.

جی ہاں! جسے ہم جذبہ جہاد، لاکھوں جان و مال کی قربانی، قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسا جذبہ وغیرہ وغیرہ کا مرہون منت جانتے رہے، اسے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق جو اس جنگ میں ''گاڈ فادر'' کی حیثیت رکھتے ہیں، نے صرف تین الفاظ میں سمجھا دیا کہ یہ جنگ ''چارلی نے جیتی تھی'' (Charlie did it) کتاب کا پہلا باب "A HOT TUB IN LASVEGAS" بتاتا ہے کہ شراب اور عورتوں کے رسیا چھ فٹ چار انچ لمبے چارلی ولسن نامی کاؤ

بوائے ٹائپ ٹیکساس کے کانگریس مین نے ''لاس ویگاس'' کے اس جوئے خانے میں شراب و
شباب کی خصوصی محفل 27 رجون 1980ء کو سی آئی اے کی کچھ اہم شخصیات اور امریکی حکومت پر
اثر انداز ہونے والی اہم شخصیات کے لئے سجا کر اس ''جہاد'' کی بنیاد رکھی تھی۔ چارلی ولسن نے
اپنے اثر و رسوخ سے امریکی حکومت کو آمادہ کیا کہ وہ اس ''خفیہ آپریشن'' کو بقول صدر ضیاء الحق
''مونگ پھلی کے دانوں'' سے چلانے کے بجائے پوری قوت سے چلائے اور ویت نام کا قرض
بمعہ سود وصول کرے۔ چارلی ولسن کی کوششوں کی کہانی اس کتاب کے تمام ابواب پر پھیلی ہوئی
ہے۔ کچھ منتخب ابواب کا ترجمہ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ لگایا
سکتا ہے کہ امریکہ کے اندر خصوصاً سی آئی اے اور دیگر امریکی اداروں میں ایسے لوگ موجود تھے
امریکہ کو اس جنگ میں کھل کر حصہ لینے سے روک رہے تھے۔ ان کے خیال سے اس طرح عا
جنگ کے خطرات بڑھ جاتے۔ دوسرے گروپ میں وہ لوگ شامل تھے جو چاہتے تھے کہ روس
افغانستان میں سبق ضرور سکھایا جائے، اس کے لئے بڑا محتاط انداز اختیار کیا جائے اور اس آپریشن
کو اس انداز میں چلایا جائے جس انداز میں اب تک سی آئی اے روس کے خلاف ''سرد جنگ
لڑتی آ رہی تھی۔

تیسرا گروپ جس کی سربراہی کانگریس مین چارلی ولسن کر رہا تھا ان پرجوش امریکیو
پر مشتمل تھا جس کی خواہش تھی کہ امریکی حکومت تمام پابندیاں ہٹا کر سی آئی اے کو کھلی چھوٹ د
اور وہ افغانستان میں روس کے خلاف برسرپیکار مجاہدین کی ہر ممکن مدد کریں۔ اس جنگ کا با
حصہ بنیں اور روس کو توڑنے اور ویت نام کا بدلہ چکانے کا یہ تاریخی موقعہ ہرگز ہاتھ سے نہ جا
دیں۔ اس گروپ نے کس انداز سے اپنی حکومت کے اندر ایک لمبی لڑائی لڑی اور کس کس انداز
پاکستان کی مدد سے سی آئی اے کے اس ''خفیہ آپریشن'' کو کامیابی سے دوچار کیا اس کی کچھ
اگلے ابواب میں دکھائی دے گی جو ''چارلی ولسن وار'' سے لئے گئے ہیں۔

چارلی ولسن پُراسرار کردار

ٹیکساس سے تعلق رکھنے والا عیاش طبیعت کا مالک کانگریس مین چارلی ولسن ویک اینڈ
پر لاس ویگاس پہنچا تو اس کے ذہن میں کوئی کنفیوژن نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اس نے
شراب اور شباب کے لئے سیز رپیلس کا انتخاب کیا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہوا تو اسے ملازموں کے
لباس سے اندازہ ہو گیا وہ بالکل صحیح جگہ پر آیا ہے۔ کاؤ بوائے بوٹ پہنے، چھ فٹ سات انچ قد
چارلی ولسن وجیہہ نظر آ رہا تھا۔ اسے اس پر مطلق ندامت نہیں تھی کہ جوئے کے مرکز پر وہ کیا کر رہا
ہے۔ مرکزی سٹیج کی طرف جاتے ہوئے وہ اونچی آواز میں نغمہ سرا تھا، لابی میں موجود اس کی اس
حرکت پر تمام لوگ اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ دیکھنے میں وہ ارب پتی لگ رہا تھا۔ حقیقت میں
ٹیکساس کے قانون ساز کے پاس دکھانے کو کچھ نہیں تھا۔ حکومت کی طرف سے دی جانے والی
70 ہزار ڈالر سالانہ تنخواہ اس کے لائف سٹائل کے مطابق کم تھی۔ چارلی ولسن کے کالج کے ساتھی
ممتاز پروفیسر چارلس سمپسن نے اسے پہلی مرتبہ کانگریس کا رکن منتخب ہونے پر مشورہ دیا کہ وہ اب
تمام تر توجہ اپنی نئی ذمہ داری پر مرکوز کر دے۔ سمپسن کہتا ہے کہ چارلی انتہائی ذہین ہے۔ اس میں
ایک پُراسرار خداداد صلاحیت ہے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ ایشو بڑی آسانی سے حل کر لیتا ہے۔ اس کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی مسئلہ اس کے سامنے آئے اور وہ اس کا حل نہ نکال سکے۔ اس کا اصل
ٹارگٹ وزیر دفاع بننا تھا۔ اس کا سینٹ جانے کا بھی ارادہ بنا تھا۔

امریکہ اپنے 52 شہریوں کو تہران سے رہا نہ کروا سکا اور جب ایسا کرنے کی کوشش کی تو
صحرا کی ریت نے پائلٹ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا کر دیا، نہ صرف امریکہ کا اپنے شہریوں کی
رہائی کا مشن ناکام ہو گیا بلکہ اس کا ایک ہیلی کاپٹر تباہ ہوا اور اس کے آٹھ فوجی مارے بھی گئے۔
ایک جہاز بھی امریکہ کو وہیں صحرا میں لینڈنگ سٹرپ پر چھوڑنا پڑا تھا۔ بار بار یہ کہا جا رہا تھا ویت نام

میں جو کچھ ہوا اس نے امریکہ کی روح کو گھائل کر دیا۔ 1980ء کے موسم گرما میں رونالڈ ریگن
زیر قیادت کنزرویٹو پارٹی نے روس کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں خبردار کرنا شروع کر دیا
کہا جا رہا تھا کہ روس ایٹمی پروگرام کے حوالے سے برتری حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ
دوسری آوازوں نے بھی بے چینی پیدا کی کہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ روس کے جی بی مغربی انٹیلی جنس
سروسز میں سرایت کر گئی ہے اور وہ تباہ کن ڈس انفارمیشن پھیلا رہی ہے۔ اس وقت امریکہ کے صد
جمی کارٹر کے ذہن پر بھی عیسائیت کے مقابلے میں کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات نے خوف
طاری کر رکھا تھا۔ جارجیا سے تعلق رکھنے والے مونگ پھلی کے کاشتکار جمی کارٹر کو خارجہ امور کا تج
نہیں تھا لیکن انہوں نے لوگوں کو ویت نام اور واٹر گیٹ کے حوالے سے قائل کر کے انتخابات
کامیابی حاصل کر لی تھی۔

1970ء کی دہائی کے آخر میں منظر عام پر آنے والے سے انٹیلی جینس سکینڈلز
تناظر میں کہا جاتا تھا کہ سی آئی اے کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔ اس نے حکومت کے ا
حکومت قائم کر لی ہے۔ کارٹر نے عہد کیا کہ وہ سی آئی اے کی گندی چالیں ختم کر دے گا۔ صدر
نے سی آئی اے میں ڈسپلن قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ تجویز تقریباً حتمی شکل اختیار کر گئی کہ
وقت آ گیا ہے ایجنسی اپنے خفیہ آپریشن بند کر دے۔ صدر کے مقرر کردہ ایجنسی کے چیف ایڈ
سٹیفن فیلڈ ٹرنر نے ان سے دو قدم آگے جاتے ہوئے کہا کہ ایجنسی کو بدمعاشانہ آپریشنز سے
ہونا چاہئے۔ 1979ء کے آخر تک صدر نے ایجنسی کیلئے نئے ضوابط بنا دیئے۔

قوانین کی تبدیلی میں کانگریس کو بھی کافی وقت لگا تھا۔ ایجنسی کے بہادر اہلکار
قوانین بننے پر اپنے متوقع مخدوش مستقبل سے خوف زدہ تھے۔ 1979ء کے آخر میں سی آئی
کے ڈائریکٹر نے گندی چالوں سے باہر رہنے کے لئے خود کو رضا کارانہ طور پر سی آئی اے سے
کر دیا۔

کرسمس کے قریب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو یہ جمی کارٹر کے لئے حیرانگی کا با
تھا۔ اس پر وہ مشتعل بھی ہوا۔ اس نے فوری طور پر یقین کر لیا کہ سوویت یونین واقعی ایک برا
اور اس کے ساتھ نپٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ طاقت استعمال کی جائے۔ اس کے
واٹر مونڈیل نے یہ کہہ کر طاقت استعمال کرنے کی تجویز مسترد کر دی کہ ''میں نہیں جانتا کہ را
اس کارروائی پر ہمارا ردعمل ''خوف'' لفظ سے واضح ہو سکتا ہے''۔

روس کی افغانستان کے حوالے سے پالیسی امریکہ کے لئے دوسری جنگ عظیم کے بعد
دردسر بنی ہوئی تھی۔ امریکی صدر نے روس کی افغانستان پر جارحیت کو اپنی فارن پالیسی کا بہت بڑا
بحران قرار دیا اور کارٹر نے ماسکو میں ہونے والی اولمپکس کھیلوں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ روس
کو گندم کی فروخت بند کر دی، وسیع پیمانے پر دفاعی اقدامات کا کہہ دیا اور فوری طور پر تعینات کی
جانے والی فوج کی تیاری کا بھی حکم دے دیا۔ اسے روس کی طرف سے مزید جارحیت کا بھی خدشہ
تھا۔ ''کارٹر اصول'' کے مطابق مڈل ایسٹ کے تیل کے ذخائر کو محفوظ بنانا تھا۔ صدر کارٹر نے بہت
سی خفیہ قانونی دستاویزات پر بھی دستخط کئے اور سی آئی اے کو ریڈ آرمی کے خلاف کارروائی کا حکم
دیا۔

سی آئی اے نے اسلحہ کی افغانستان میں باغیوں کے لئے جو کھیپ بھیجی وہ ملک بھر میں
پھیلے ہوئے صرف ایک ہزار مجاہدین کو مسلح کرنے کے لئے تھی۔ یہ روس کے بنے ہوئے ہتھیار تھے
جو سی آئی اے نے ایسی ہی کسی کارروائی کے لئے جمع کر رکھے تھے۔ روسی جارحیت کے ابتدائی
دنوں میں ہی سان انٹونیو سے اسلحہ سے بھرے جہاز آ کر اسلام آباد اترتے تھے۔ یہاں سے یہ
اسلحہ افغان مجاہدین میں تقسیم کرنے کے لئے ضیاء الحق کی سیکرٹ سروس کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

جمی کارٹر کے لئے جنرل ضیاء الحق کا تعاون حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ کارٹر نے انسانی
حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے جنرل محمد ضیاء الحق کو بھی نکاراگوا کے صدر تا کوسموزا کے
ساتھ ٹارگٹ بنا رکھا تھا۔ اس نے پاکستان کے ساتھ فوجی تعاون بھی ختم کر دیا تھا۔ اب صدر کارٹر کو
روس کی افغانستان میں بڑھتی ہوئی جارحیت روکنے کے لئے پاکستان کا تعاون درکار تھا۔ اس موقع
پر کارٹر کو پاکستان کے حوالے سے پالیسی پر 180 زاویے کا ٹرن لینا پڑا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے
تعاون کے لئے کڑی شرط رکھ دی۔

''سی آئی اے مجاہدین کو ہتھیار سپلائی کر سکتی ہے لیکن مجاہدین میں تقسیم کے لئے یہ اسلحہ
پاکستانی سیکرٹ ایجنسی کے حوالے کرنا ہوگا۔ امریکی ایجنسی افغانستان میں جو کچھ بھی کرنا چاہتی
ہے وہ پاکستانیوں کے ذریعے کرنا ہوگا''۔

اسلحہ کی پہلی کھیپ کے ساتھ ہی افغانیوں کو مصر، سعودی عرب اور دیگر اسلامی ممالک کی
طرف سے ہتھیار اور مالی امداد ملنا شروع ہو گئی۔ پہلے پہل چپل پہنے قبائلیوں کو جن کی کوئی مخصوص
یونیفارم نہیں تھی، عام سے ہتھیار دیئے گئے تھے۔ ان لوگوں کی جنگ کے حوالے سے کوئی تربیت

بھی نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی دنوں میں سی آئی اے کو مجاہدین کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا جن کے مقابلے میں سوویت یونین کی مسلح چالیسویں آرمی تھی۔ جس کو بعد میں مجاہدین نے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ روس کے بھاری بھرکم 76-II ٹرانسپورٹ طیارے افغانستان میں یکے بعد دیگر اترتے رہتے تھے۔ یہ اپنے فوجیوں کے لئے ٹینک خوراک کا سامان بھی لاتے تھے۔ شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں ٹینک گشت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگی فائٹر طیارے اور ہیلی کاپٹر آسمان پر چھائے رہتے تھے۔

افغانستان میں مجاہدین کی مدد کرنے کی امریکہ کے پاس کئی دیگر وجوہات بھی تھیں۔ مجاہدین کو اسلحہ ملنے سے روس بھی چوکنا ہو گیا اور اس نے خلیج فارس اور پاکستان کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس جنگ میں چونکہ بنیاد پرست اسلامی لوگ شامل ہو گئے تھے جس سے امریکہ کو بہترین موقع مل گیا کہ وہ اسلامی ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکے۔ جو اسرائیل اور شاہ ایران کے ساتھ امریکہ کی دوستی کی وجہ سے دور ہٹ گئے تھے۔ روسی فوج نے افغانستان میں تباہی مچا رکھی تھی۔ دیہاتوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا رہا تھا اس صورت میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ سرحد عبور کر کے پاکستان جا رہے تھے۔ مجاہدین جس تیزی سے روسی فوج کو قتل کر رہے تھے۔ اس کے ردعمل میں وہ بھی کارروائیاں تیز تر کر دیتے تھے۔ اس کا بھی امریکہ نے فائدہ اٹھایا اور روس کو دنیا بھر میں بدنام کر کے رکھ دیا۔ اس حوالے سے میڈیا کو استعمال کیا گیا۔ دنیا بھر کے اخبارات اور جرائد میں روسی ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف مضامین شائع کرائے گئے۔ یہ سب سی آئی اے کر رہی تھی، کئی ممالک میں کتابیں بھی لکھوائی گئیں۔

روسی فوجی قبائلیوں سے بہت زیادہ خوف زدہ رہتے تھے۔ یہاں تعینات روسی فوجی نئے آنے والے اپنے ساتھیوں کو مختلف کہانیاں سنا کر مزید خوف زدہ کر دیتے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھی "افغانستان میں داخلے کے بعد بگرام ایئربیس پر دوسرے روز روسی فوجی نے رن وے کی ایک طرف پانچ بیگ پڑے دیکھے۔ پہلے تو اس نے کوئی نوٹس نہ لیا تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی گن سنگین اس میں گھسیڑی تو زمین پر خون بہنے لگا۔ ماہرین کو بلا کر تمام بیگ کھولے گئے تو ہر ایک روسی فوجی بند تھا۔ قبائلیوں نے ان کے پیٹ سے چمڑی کاٹ لی تاہم وہ زندہ تھے۔ ان کے گرد نوں کے ساتھ باندھے گئے تھے۔ یہ روسی حکمرانوں کے لئے ایسا ہی پیغام تھا جو 143 سال قبل 1842ء میں افغان قبائلی چیف نے برطانوی جنرل کو دیا تھا۔ اس وقت برطانوی جنرل

افغانستان سے اپنی فوج کے انخلاء کی شرائط قبائلی کمانڈر کے سامنے رکھیں ابھی جنرل کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کمانڈر نے قہقہہ لگا دیا۔ برطانوی جنرل نے ششدر ہوتے ہوئے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو اس کا جواب تھا "مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ افغانستان سے کیسے نکل سکیں گے کیونکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا یہاں آنا کتنا آسان تھا اور لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ یہاں سے نکل کیسے سکیں گے؟" 138 سال بعد ملاؤں نے پھر جہاد کا اعلان کیا تھا۔ اسے مقدس جنگ کا نام دیا تھا۔ یہ نگارا گوا میں سی آئی اے کی جنگ کی قسم کی جنگ نہ تھی۔ یہاں سے لوگ میامی فرار ہوتے وقت سرحد پر اسلحہ جمع کرا دیتے تھے۔ افغانستان میں ملاؤں کے جہاد کے اعلان پر پوری مسلم دنیا نے خوش آمدید کہا۔ افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے کے ایک ماہ بعد ہی قبائلیوں اور باغیوں سے باور کرانے کا فیصلہ کر لیا کہ حقیقت میں سپر پاور صرف ایک ہی ہے۔

کابل کے ایک ہوٹل میں موجود روسی صحافی گنیڈی بچاروف بتاتا ہے "ہوٹل کے ارد گرد پگڑیاں باندھے افراد اور نقاب اوڑھے ہوئے عورتیں مردہ باد، مردہ باد، روس مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں بھاگ کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ یہاں روسی سفارتکار اور کابل میں تعینات فوجی کمانڈر موجود تھے۔ اس وقت تمام فون کاٹ دیئے گئے تھے"۔ وہ کہتا ہے کہ ہم تمام لوگ موت کے خوف سے کانپ رہے تھے۔ اس موقع پر یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ اب ہوٹل میں موجود ہر آدمی کے ٹکڑے کر دیں گے۔ کان اور جسم کے دیگر اعضا کاٹ دیئے جائیں گے۔ یہ جان کر ہم پر کپکپی طاری تھی اور خود پر قابو پانا بلکہ اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونا ممکن نہ تھا۔ ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے روسی فوجی دستہ وہاں پہنچ گیا جس سے سب کی جان بچ گئی۔

روسی فوج نے افغانستان میں تباہی مچا رکھی تھی۔ روسی جہاز بمباری کر کے دیہات کو ملیا میٹ کر رہے تھے۔ لاکھوں افراد اپنے گھر چھوڑ کر پاکستان اور ایران میں پناہ لینے کے لئے آ رہے تھے۔ مجاہدین بندوقوں اور گرینیڈوں کے ساتھ روس کے ٹینکوں اور بمبار جہازوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ (صفحہ 1 تا 20 کی تلخیص Charlie Wilson's War written by Georgecrile)

O

جارج کرائیل نے جن مجاہدین کا ذکر کیا ہے۔ حال ہی میں ان کا ذکر امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ ہیلری کلنٹن نے بھی کیا لیکن ان کا انداز مختلف تھا۔ انہوں نے اسے امریکہ کا جرم قرار دیا کہ جس نے ساری دنیا سے مجاہدین اکٹھے کئے ان سے روس کی شکست و ریخت کروائی اور پھر

انہیں پاکستان کے لئے ایک عذاب بنا کر چھوڑ گئے۔

آج باجوڑ سے سوات تک جو نام نہاد عسکریت پسند، شدت پسند طالبان، دہشت گرد، خودکش حملہ آور ہمیں دکھائی دے رہے ہیں یہ سی آئی اے کی سوغات ہے جس کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔ افسوس سی آئی اے پر نہیں اپنے ان شہ دماغوں پر ہے جن پر صحافیوں کو لاکھوں روپے دے کر کتابیں لکھوائی گئیں لیکن جو عقل سے اتنے پیدل تھے کہ طوفان کے بعد کی تباہ کاریوں کا ادراک ہی نہیں رکھتے تھے۔ کاش انہوں نے یہ سوچا ہوتا کہ روس کے افغانستان سے نکلنے کے بعد ان مجاہدین کا کیا مستقبل ہے؟ تو آج ہم اس خطرناک صورت حال سے دوچار نہ ہوتے۔

ٹکراؤ

آئی ایس آئی چیف جنرل اختر عبدالرحمٰن نے سات جماعتی اتحاد کے ذریعے جہاد کو منظم کیا جو کوئی ان سات میں سے کسی ایک جماعت میں شامل ہوتا اسے متعلقہ کمانڈر کے ذریعے اسلحہ مل جاتا بصورت دیگر کوئی اسلحہ نہیں ملتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ کوئی شخص اس کے زیر کمان لڑنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اس کی عزت اور ساکھ پر بھی حرف آتا۔ ظاہر ہے کہ کوئی افغان ان چیزوں سے محرومی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلحہ کا کوٹا مقرر کرتے وقت ہر جماعت کی گوریلا سرگرمیوں اور مختلف منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے سلسلے میں اس کی کارکردگی کو بنیاد بنایا جاتا۔ امریکہ اور سی آئی اے سمیت ہمارے اکثر نقادوں کے اس دعوے میں کوئی صداقت نہیں کہ اسلحہ کی تقسیم کے سلسلے میں ''بنیاد پرست مسلمانوں'' کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جنرل اختر نے ایک واضح پالیسی مرتب کر رکھی تھی سختی سے اس پر کاربند رہتے تھے۔ ہر پارٹی کو صرف اور صرف اپنی فوجی کارکردگی کی بنیاد پر اسلحہ ملتا تھا اسلحے کی تقسیم کا کسی پارٹی کے مذہبی جوش یا پارٹی کے چھوٹا بڑا ہونے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کیا کسی جماعت کے پاس اسلحہ کی تقسیم کا موثر داخلی نظام موجود ہے؟ کیا اس کے کمانڈرز میدان جنگ میں دوسروں سے تعاون کرتے ہیں یا ان کے درمیان لڑائی جھگڑوں کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں؟ کیا اس پارٹی کے مجاہدین اہم فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں یا وہ نسبتاً کم اہمیت والے علاقوں تک محدود ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور فوجی اہمیت کی حامل تنصیبات کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں؟ یہ وہ بنیادی سوالات تھے جو جنرل اختر یا آئی ایس آئی کا سٹاف ہمیشہ پیش نظر رکھتا تھا۔

جنرل اختر کی مستقل ہدایت یہ تھی کہ ہر ہفتے کسی ایک پارٹی لیڈر سے ان کی ملاقات اور کم از کم مہینے میں ایک بار ساتوں جماعتوں کے لیڈروں سے ان کی کانفرنس کا اہتمام ہونا چاہئے۔

وہ بجا طور پر اسے میدان جنگ میں حربی کامیابی سے کہیں زیادہ اہم اور جہاد کا فیصلہ کن عامل خیال کرتے تھے وہ سیاسی لیڈروں کے درمیان باہمی اتفاق کو ''تزویراتی یکجہتی strategic (Unity اور کمانڈروں کے اتحاد کو ''تدبیراتی یکجہتی (Tactical Unity) کا نام دیا کرتے تھے۔ حکمت عملی کی یکجہتی کو وہ کاملا'' اپنی ذمہ داری خیال کرتے تھے جبکہ جنگی منصوبوں کی یکجہتی ذمہ داری متعلقہ آرمی کمانڈرز پر تھی۔ لیڈروں کے ساتھ انفرادی ملاقاتوں میں جنرل ا افغانستان کی فوجی صورت حال اور نقل وحمل کے مسائل پر گفتگو کرتے۔ وہ بڑی توجہ اور انہما سے مجاہدین کے خیالات سنتے جو اکثر پاکستان کی پولیس، صوبائی حکومت یا افغان مہاجرین کمشنری کے خلاف سنگین شکایات میں تبدیل ہو جاتے۔ جنرل اختر انہیں ہمیشہ اشتراک وتعا کی ضرورت اور ''کابل'' کی اہمیت کا احساس دلاتے۔ اس طرح کے اجلاس بڑے دوستانہ ما اور بے تکلفی کی فضا میں ہوتے اور جنرل اختر افغان لیڈروں کو بھرپور عزت واحترام دیتے۔

اگرچہ جنرل اختر نے افغان راہنماؤں کے بارے میں کبھی اپنی ذاتی پسندیدگی یا تر کو ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عبدالرب رسول سیاف، یونس خالص، گل بدین اور پیر آفندی کے بارے میں زیادہ نرم گوشہ رکھتے تھے۔ یونس خالص حاضر جواب، بذلہ اور خوش مزاج تھے اور ان کے ساتھ جنرل کی گفتگو کے دوران بڑے مزیدار لطائف کا تبادلہ تھا۔ افغان راہنماؤں کی طرف سے جو حساس مسائل اٹھائے جاتے تھے ان میں مہاجرین کیمپوں میں کرپشن اور اسلحہ کی فروخت کے معاملات سرفہرست ہوتے۔ جنرل اختر ان کی ہر دلجوئی کا اہتمام کرتے لیکن انہوں نے کبھی اپنے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔

سی آئی اے نے جنرل اختر کی پالیسیوں کی وجہ سے آئی ایس آئی کو اپنا رقیب شروع کر دیا تھا۔ ان کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا کہ انہیں قریباً دیوار سے لگا دیا گیا تھا اور فر پر آئی ایس آئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی یوں تو اور بھی وجوہات ہوں گی لیکن میرے خیال سے وجہ سی آئی اے اور ''را'' کے ماضی کے تعلقات بھی تھے۔

جنرل اختر نے پیشہ ورانہ فرائض کے سلسلے میں نہایت ہی اونچا معیار قائم کر رکھا اس لئے اکثر وہ خود اپنی کارکردگی سے بھی مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ انہیں اکثر احساس رہتا ان کے کام میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ رہ جائے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے ہی قائم کردہ م

پورے نہ اتر سکیں۔ مسلسل آٹھ سال تک انہیں میدان جنگ میں زبردست فوجی مزاحمت اور اندرون وطن سیاسی اور ذاتی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخری کامیابی انہی کے ہاتھ رہی۔ انہوں نے اپنے تمام مقاصد حاصل کر لئے سوائے ایک بڑے مقصد کے اور وہ تھا۔ ''اسلامی جمہوریہ افغانستان'' کا قیام جو پاکستان کی ڈیفنس DEPTH بنے۔

جنرل اختر کی عظیم الشان کامیابیوں کا اعتراف ان کی زندگی میں نہ کیا جا سکا۔ جب جہاد افغانستان کی کامیابی نوشہ دیوار کی طرح آنکھوں کے سامنے تھی، عین اس وقت جنرل اختر کی آئی ایس آئی سے علیحدگی کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ وہ فاتح کی حیثیت سے نام اور مقام نہ بنا سکے۔ بلاشبہ وہ زبردست انتظامی صلاحیتوں کا مالک جرنیل تھا۔ اس نے آئی ایس آئی کو جدید بنیادوں پر کھڑا کیا، اسے ایک انتہائی مستعد اور باصلاحیت انٹیلی جنس ادارے کی شکل دی جو آج دنیا کی چند نمایاں ترین خفیہ تنظیموں میں شمار ہوتی ہے۔

جب 1980ء میں جنرل اختر نے اپنے کام کا آغاز کیا تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا لیکن 1983ء میں آئی ایس آئی کا ادارہ نہ صرف ایک بھرپور جنگ کی سپلائی لائن قائم کر چکا تھا بلکہ مجاہدین کو ضروری ٹریننگ بھی دے رہا تھا، افغانستان کے اندر آئی ایس آئی کی مشاورتی ٹیمیں بھیج رہا تھا اور ایک تیزی سے پھیلتی ہوئی گوریلا جنگ کی عسکری حکمت عملی تیار کر چکا تھا۔ آئی ایس آئی کا ادارہ مسلسل پھیلتا رہا۔

1984ء میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی (William Casey) نے آئی ایس آئی کا دورہ کیا۔ انہوں نے مجاہدین کی کارکردگی، اسلحہ کی نقل وحمل اور افغان گوریلوں کے تربیتی نظام کو دیکھ کر جنرل اختر کو ذاتی طور پر مبارک باد پیش کی۔ مسٹر کیسی ہی کی رپورٹ پر 1985ء میں امریکہ نے افغان جہاد کے لئے مخصوص فوجی بجٹ میں دوگنا اضافہ کر دیا۔ جنرل اختر نے ثابت کر دیا کہ افغان مجاہدین نہ صرف اپنا دفاع کر سکتے ہیں بلکہ وہ تمام قیاس آرائیوں سے قطع نظر میدان جنگ میں دشمن کو شکست دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

جنرل اختر کی کارکردگی پر ستائش کا اظہار کرنے والے ولیم کیسی سے قطع نظر، جنرل کو امریکیوں اور سی آئی اے کی طرف سے کئی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ امریکی بجا طور پر یہ سوچتے تھے کہ جس جنگ کے لئے وہ رقم اور اسلحہ فراہم کر رہے ہیں، اس کے انتظام اور منصوبہ بندی میں بھی ان کا واضح عمل دخل ہونا چاہئے۔ سی آئی اے اور امریکی حکومت کے اعلیٰ افسران جنرل اختر

پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے کہ اسلحہ کن لوگوں کو ملے؟ کتنا ملے؟ مجاہدین کن ٹارگٹس پر حملہ کریں اور امریکی انسٹرکٹرز مجاہدین کو ٹریننگ دیں۔ جب تک جنرل اختر آئی ایس آئی کے سربراہ رہے، امریکیوں کی کوئی خواہش بھی پوری نہ ہوسکی۔ انتہائی جدید ہتھیار، مثلاً طیارہ شکن سٹنگر میزائل، جو ہمیں 1986ء کے اواخر میں ملے، کو چلانے کے لئے امریکیوں نے پاکستانی نسٹرکٹرز کو تربیت دی لیکن انہیں براہ راست مجاہدین کو تربیت دینے کی اجازت نہ مل سکی۔ جنرل اختر نے کبھی بھی امریکیوں کو جہاد کی سرگرمیوں میں شرکت کی اجازت نہ دی۔ جس کی دو وجوہات تھیں۔

1) انہیں اجازت دینے کا مطلب روسیوں کے اس پراپیگنڈے کو سچ ثابت کرنا تھا کہ افغانستان کی جنگ، جہاد نہیں بلکہ امریکہ کی توسیع پسندانہ خارجہ پالیسی کا نتیجہ ہے اور یہ کہ افغان عوام دو عالمی طاقتوں کے آلہ کار بن کر باہمی قتل و غارت گری میں مصروف ہیں۔ مجاہدین کے درمیان اتحاد قائم رکھنے کے لئے ہماری سب سے بڑی قوت ''جہاد'' ہی تھی۔ اس نظریے کو پس پشت ڈال دینا اتحاد کو تباہ کر دینے کے مترادف ہوتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ میدان جنگ میں ہماری کارروائیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں۔ اگر امریکہ اقتصادی اور فوجی امداد کی حدوں سے آگے بڑھ کر کچھ کرتا یا جنگ کا واضح فریق بن کر پاکستان کے اندر اپنے آپ کو ملوث کر لیتا تو یقیناً اتحاد میں رخنہ پڑ جاتا اور یہ بات واضح ہے کہ اتحاد کے بغیر ہم کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ جنرل اختر نے اس نکتے کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور انتہائی بے لچک رویہ اپناتے ہوئے امریکیوں کی جنگ میں براہ راست مداخلت کی بار بار کی خواہش کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

2) امریکیوں کو باہر رکھنے کی دوسری وجہ سی آئی اے تھی جو ہماری دی ہوئی تربیت، قیام رسد کے معاملات اور عسکری حکمت عملی کو تلپٹ کر کے رکھ دیتی۔ اسے ان چیزوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ آئی ایس آئی کے ماہرین اندازہ لگا چکے تھے کہ سی آئی اے کا عملہ سوائے درمیانے درجے کے تربیتی سٹاف کے جو کہ سابقہ فوجی تھے، اس طرح کی گوریلا جنگ لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ کے گوریلا حربے بھونڈے، غیر حقیقت پسندانہ اور بالکل غیر پیشہ ورانہ تھے۔ یہ کوئی زیادہ حیران کر بات نہ تھی کیونکہ انہیں گوریلا جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ (سوائے ویت نام میں ان کی شکست کے اور ان سب باتوں سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ افغانیوں کے مزاج اور فطرت کو نہیں سمجھتے تھے۔ مخف یہ کہ امریکیوں کو عملی لڑائی میں شریک کر لینے کا مطلب اتحاد کا خاتمہ ہوتا اور ان کی افغان گور

جنگ سے ناواقفیت کے باعث ہمیں زبردست سانحے کا سامنا کرنا پڑتا۔

امریکی دوستوں کو میدان جنگ سے دور رکھنا، جہاد افغانستان کی کامیابی کے سلسلے میں جنرل اختر کا اہم کارنامہ تھا۔ صدر مملکت بھی کسی حد تک دباؤ کی وجہ سے اس معاملے میں امریکیوں کو رعایت دینے پر آمادہ تھے لیکن یہ صرف جنرل اختر کے کردار کی مضبوطی تھی کہ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ ایک اور بات جس کی وجہ سے جنرل اختر اور آئی ایس آئی امریکیوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے، ان کی یہ بدگمانی تھی کہ ہم ''بنیاد پرستوں'' کو دوسروں کی نسبت زیادہ اسلحہ دیتے ہیں۔ اختر ہر حال میں جنگ جیتنا چاہتے تھے تاکہ وہ کمیونسٹ حکومت کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرا سکیں لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میدان جنگ میں کامیابی کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کی کامیابی حاصل کرنے کے لئے اہم تعصبات کے خلاف موثر اور لگاتار عسکری کارروائی کی ضرورت تھی اور ان سب سے بڑھ کر ایک مشترکہ حکمت عملی جس میں کمانڈروں کا اپنے سیاسی نظریات سے قطع نظر ایک دوسرے سے تعاون ضروری تھا۔

جنرل اختر نے اس بنیادی حقیقت سے کبھی نظریں نہ چرائیں کہ کابل میں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے عسکری کامیابی حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اعلیٰ تجربہ کار اور پیشہ ور سپاہی کی حیثیت سے انہوں نے ان جماعتوں یا کمانڈروں کو زیادہ ہتھیار، اسلحہ اور سامان رسد دیا جنہوں نے میدان جنگ میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

مجاہدین کے مسائل کے بارے میں ان کا رویہ ہمیشہ ہمدردانہ ہوتا تھا۔ وہ افغان مجاہدین کو ناراض کئے بغیر ان کے پیچیدہ اور جذباتی مسائل پر دلائل میں پہروں صرف کرتے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ مجاہدین کے آپس کے تعلقات میں کبھی رخنہ پیدا نہ ہو اور نہ ہی وہ اپنی رائے پر کوئی سمجھوتہ کرتے۔ یہ ان کا بہت بڑا سرمایہ تھا اور کوئی بھی اس میں ان کا ثانی نہ تھا۔ افغانیوں سے زیادہ کوئی بھی تذلیل یا توہین کے بارے میں حساس نہیں ہوسکتا۔ سی آئی اے کے لئے یہ بڑی مشکل تھی کہ وہ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور والہانہ لگاؤ میں کوئی نقص یا خامی نکالتا۔ پاکستان اور امریکہ میں اختر اور کیسی جو اپنے اپنے ملکوں کی خفیہ تنظیموں کے ڈائریکٹر تھے، کے بارے میں چند لوگ ہی جانتے ہوں گے کہ ان کے درمیان کتنے قریبی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ وہ مل جل کر اور باہمی اعتماد کی فضا میں کام کرتے تھے۔

جنرل اختر نے کانفرنسوں میں ایک دو بار ایک خاص قسم کے ہتھیار کے لئے کیسی کے

سامنے معاملہ پیش کیا، کیسی کے ایک سٹاف ممبر نے دلائل کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ کیسی نے یہ کہتے ہوئے اس ممبر کی رائے کو مسترد کر دیا کہ اختر مکمل طور پر اس جنگ میں شریک ہے اور وہ یقیناً اپنی ضروریات کے بارے میں دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔ ہم نے صرف اس کی مدد کرنا ہے۔ کیسی کی موت بلاشبہ افغان جہاد کے لئے ایک ضرب کاری ثابت ہوئی۔

سازش کے خاموش کردار

یہ ایک افسوسناک اور تلخ حقیقت ہے کہ ''مجاہدین نے واضح فتح کو شکست میں بدل ڈالا'' جیتی ہوئی بازی کو شکست میں تبدیل کرنے کے اس عمل کا آغاز صدر ضیاء کی طرف سے جنرل اختر کو فور سٹار جنرل کے طور پر ترقی دینے اور انہیں جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین مقرر کرنے سے ہوا۔ مارچ 1987ء میں افغانستان میں جہاد کی لہر آہستگی سے مگر منطقی انداز میں گوریلا کامیابی کی طرف بڑھ رہی تھے۔ روسیوں کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میدان جنگ میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ گورباچوف اپنی فوجی شکست کو ماسکو میں اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی کامیابی کا روپ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ افغانستان سے سرخ فوج کا انخلاء حتمی انداز میں مگر خفیہ طور پر کریملن کے ایجنڈے پر تھا۔ عین اس نازک لمحے پر اس شخص کو ترقی دے کر آئی ایس آئی سے الگ کر دیا گیا جو روس کی تذلیل کا ذمہ دار تھا، جس نے دنیا کی دوسری بڑی سپر پاور کے خلاف آٹھ سالوں تک ایک لامحدود گوریلا جنگ منظم کی۔ یہ ترقی خود جنرل اختر کے لئے بھی دھچکے سے کم نہ تھی۔ تقریباً ایک ہفتہ انہوں نے رسمی طور پر اپنے جانشین کو چارج دینے سے گریز کیا۔ انہوں نے اس موہوم امید پر جنرل حمید گل کو چارج دے دیا کہ شاید وہ خود جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے جہاد افغانستان پر کنٹرول رکھ سکیں۔ ایسا نہ ہو سکا۔ ان کا نیا عہدہ کسی اختیار کے بغیر محض ایک آرائشی منصب تھا۔ یہ کسی کمان، اثر و رسوخ اور حقیقی قوت سے محروم عہدہ تھا کیونکہ چیف آف دی آرمی سٹاف کے منصب پر بیٹھا شخص ملک کا صدر بھی تھا۔

''مجھے پختہ یقین ہے کہ جنرل ضیاء نے بنیادی طور پر امریکیوں کی خوشنودی کی خاطر جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے الگ کیا۔ جہاد کے اس فیصلہ کن مراحلے میں ترقی کے بہانے جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے الگ کیا۔ آئی ایس آئی سے علیحدگی سے یقینی طور پر صدر ضیاء کو ذاتی فائدہ

پہنچ رہا تھا کیونکہ افغان جہاد میں متوقع کامیابی کا سہرا ان کے سر رہتا۔'' (خاموش مجاہد... بریگیڈیئر محمد یوسف۔ صفحہ 110)

یہ جنرل اختر ہی تھے جنہوں نے امریکیوں کی طرف سے مجاہدین کو ٹریننگ دینے ہتھیاروں کا کوٹہ مقرر کرنے میں ان کے عمل دخل اور اسلحہ کی تقسیم میں سیاسی جماعتوں کو نظرانداز کرنے کے بارے میں ان کی خواہش کو کبھی پروان نہ چڑھنے دیا۔ بہت سے امریکیوں کا خیال کہ جنرل اختر کی افادیت 1987ء کے اوائل میں ہی ختم ہوگئی تھی۔ امریکی اس بات کو تسلیم کر تھے کہ وہ افغان جہاد کی فتح کا معمار ہے لیکن جب اس فتح کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگ انہوں نے اسے اس اعزاز سے محروم کرنا ضروری سمجھا۔

امریکیوں کو یقین تھا کہ اختر کابل میں مسلمان ''بنیاد پرستوں'' کی حکومت قائم کر شدید اور کٹر حامی ہے۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ اختر نے محض مذہبی بنیادوں پر سالہا سال پرستوں کو امریکی ساز و سامان فراہم کرنے میں ترجیحی سلوک کیا ہے۔ امریکیوں کو خبر تھی کہ سقوط کابل کی بنیاد پر ایک سیدھی سادی عسکری فتح چاہتا ہے۔ امریکی ایسا نہیں چاہتے تھے افغانستان سے روسیوں کے انخلاء کی خواہش تو ضرور رکھتے تھے لیکن کابل پر ''بنیاد پرستوں' حکمرانی بھی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ایران کی طرح ایک ٹھوس اسلامی ریاست میں آ جائے گی۔ اس سلسلے میں امریکیوں اور روسیوں کی سوچ میں بڑی یکسانیت تھی۔ روسی افغانستان پر کٹر اسلامی حکومت سے خوف زدہ تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اس سے سرحد کے اس پار روسی زیر تسلط ریاستوں میں قومیت اور مذہبی جذبات کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ گویا ایک دوسرے برسر پیکار دونوں سپر پاورز افغانستان میں کم و بیش ایک ہی مقصد رکھتی تھیں اور وہ تھا ''تعطل'' یعنی ''حالات کو جوں کا توں چھوڑ دینا''۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ نے پہلے قدم طور پر جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے الگ کر کے جہاد سے دور کر دیا۔ امریکی دباؤ کے ساتھ ضیا الحق کی یہ آرزو بھی شامل ہوگئی کہ وہ افغانستان میں جہاد کی کامیابی کا پھل اپنی جھولی میں ڈال لیں۔ صدر ضیاء الحق اس اقدام سے کثیر تعداد میں موجود جنرل اختر کے مخالفین کی اشک شوئی چاہتے تھے جن میں اس وقت کے وزیر اعظم بھی شامل تھے۔

بہت سے لوگ ضیاء کو ایک کٹر مذہبی انتہا پسند خیال کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک دیندار مسلمان تھے لیکن وہ بنیادی طور پر ایک سیاستدان تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ضیاء

غیر افغان جہاد کو کامیابی سے جاری رکھنا ناممکن تھا۔ لیکن وہ ایک سیاستدان کی حیثیت سے اپنے ہر اقدام میں ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کی حکمت عملی میں اپنی ذات، ہمیشہ بنیادی مقام رکھتی تھی اور اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ مجاہدین کا کوئی لیڈر ان کے لئے مشکلات پیدا کر رہا ہے تو وہ فوراً مداخلت کرتے اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ گل بدین ایک کٹر مذہبی بنیاد پرست افغان لیڈر تھا۔ جب گل بدین نے اقوام متحدہ کے دورے میں امریکی صدر ریگن سے ملنے سے انکار کر دیا تو اسے امریکیوں کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ شخص کی حیثیت حاصل ہوئی۔ صدر ضیاء کو بھی حکمت یار کا یہ فیصلہ پسند نہ آیا اور وہ شجر ممنوعہ قرار پایا۔ کم از کم دوبارہ میری موجودگی میں صدر ضیاء نے جنرل اختر سے کہا کہ حکمت یار کو سختی سے تنبیہ کر دو اور اسے صاف صاف بتا دو کہ اسے پاکستان نے افغان لیڈر بنایا ہے اور اگر اس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو پاکستان اسے سبق بھی سکھا سکتا ہے۔ اختر نے بڑی نرمی سے یہ پیغام پہنچا تو دیا لیکن اس کا رتی برابر بھی اثر نہ ہوا۔ گل بدین ایک بار جو فیصلہ کر لیتا تھا، کوئی طاقت اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ میرے خیال میں وہ فطری طور پر ایک عام افغان سے دوگنا زیادہ سرکش تھا۔ جہاد کو دوسرا دھچکہ اپریل 1988ء میں لگا جب راولپنڈی کے اوجڑی کیمپ میں ذخیرہ کئے گئے دس ہزار ٹن اسلحہ اور گولہ بارود کو ایک قیامت خیز دھماکے کے ساتھ آگ لگ گئی۔ شہریوں نے فضاؤں میں ہتھیاروں کی مہلک اور تباہ کن بارش کا مظاہرہ دیکھا۔ مجاہدین کے لئے جنگی ساز و سامان فضاؤں میں تنکوں کی طرح بکھر گیا اور اس کے ساتھ روسیوں کے انخلاء کے دوران ان کے خلاف فیصلہ کن معرکہ لڑنے کا خواب بھی پریشان ہوگیا۔ راولپنڈی کے شہریوں پر راکٹوں کی برستی بارش کی طرح الزامات اور جوابی الزامات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بے شمار سوالات سر اٹھانے لگے۔ اتنے گنجان آباد علاقے میں اس قدر گولہ بارود اور اسلحہ کیوں ذخیرہ کیا گیا؟ اس حادثے کا ذمہ دار کون ہے؟'' (ایضاً صفحہ 128)

دراصل اوجڑی کیمپ کو افغان جہاد کی سپلائی لائن میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ ہوائی اڈے سے انتہائی قریب، گھنے درختوں میں گھرے اس ڈپو میں اسلحے کی محدود مقدار صرف وقتی طور پر رکھی جاتی اور موقع ملتے ہی اسے آگے روانہ کر دیا جاتا۔ اوجڑی کیمپ کو جہاد افغانستان کے لئے عارضی اسلحہ خانہ کی حیثیت حاصل تھی۔ صدر اور وزیر اعظم اس کے بارے میں پوری طرح باخبر تھے۔ وہ اس ڈپو کا معائنہ بھی کر چکے تھے اور انہوں نے کسی مرحلے پر بھی اس کی موجودگی یا محل وقوع پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ مسلسل آٹھ سال یہ ڈپو انتہائی رازداری اور کامیابی سے کام کرتا رہا۔ بدقسمتی

سے حادثے والے دن ڈپو میں معمول سے کہیں زیادہ اسلحے کا ذخیرہ جمع تھا۔

جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے الگ اور اوجڑی کیمپ سے لاتعلق ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن وزیراعظم نے انہی کو ہدف بنالیا۔ صدر ضیاء نے جنرل اختر اور آئی ایس آئی کے نئے ڈائریکٹر جنرل، حمید گل دونوں کا ساتھ دیا۔ حادثے کی تحقیقات پر مامور کورٹ آف انکوائری نے کسی فرد کو مورود الزام نہ ٹھہرایا تاہم کچھ ہی عرصہ بعد کسی فوجی جرنیل کے بجائے وزیر اعظم کو ان کے عہدے سے ہٹادیا گیا۔

17 راگست 1988ء کو صدر ضیا، جنرل اختر، پاکستان میں امریکی سفیر رافیل، امریکی فوجی اتاشی بریگیڈیئر واسم، آٹھ دوسرے پاکستانی جنرل، ان کا سٹاف اور جہاز کا عملہ، مجموعی طور پر 31 افراد ایک ہوائی حادثہ میں لقمہ اجل بن گئے۔ حادثے کا شکار ہونے والا طیارہ صدر کا تھا اور مصدقہ ذرائع کے مطابق یہ سبوتاژ کی کارروائی تھی۔ ایک ہی ضرب میں پاکستان کی فوجی حکومت کا صفایا کر دیا گیا۔ یہ تمام اہم شخصیتیں بہاول پور کی چھوٹی سی چھاؤنی میں امریکن M-1 ٹینک کا مظاہرہ دیکھنے جمع ہوئی تھیں کیونکہ پاکستانی فوج یہ ٹینک خریدنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ صدر ضیاء اور جنرل اختر میں سے کسی کو بھی یہاں نہیں آنا تھا۔ دونوں کو ان کی مرضی کے خلاف یہ مظاہرہ دیکھنے پر آمادہ کیا گیا۔ یہ کوئی ایسی تقریب نہیں تھی جہاں ان کی موجودگی ضروری ہوتی۔ اس طرح کے عام سے مظاہرے کے لئے چیف آف جنرل سٹاف ہی کافی تھا۔ صدر ضیاء کی موجودگی تو قطعی غیر ضروری تھی۔ اسی طرح جنرل اختر کا بھی یہاں آنا بے معنی تھا کیونکہ ان کے نئے عہدے کی ذمہ داریوں کا اس مظاہرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

حادثے کے بعد سرکاری تفتیش سے انکشاف ہوا کہ اس سانحے کا واحد سبب تخریب کاری کی کارروائی ہے۔ یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا کہ کوئی زود اثر زہریلی گیس استعمال کی گئی جس نے کاک پٹ میں موجود عملے کے اعصاب بیک وقت اور فوری طور پر معطل کر دیئے۔ مجرموں کا کوئی سراغ نہ لگایا جا سکا۔ کیونکہ پاکستان اور امریکہ دونوں یہی چاہتے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ امریکی سفیر اور ان کا فوجی اتاشی اس حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے امریکہ نے جان بوجھ کر حادثے کے اسباب اور مجرمین کی پردہ پوشی کی۔ ایف بی آئی کی جو تحقیقاتی ٹیم اسلام آباد جانے کے لئے پر تول رہی تھی اسے ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ ماضی قریب میں امریکہ نے ایک قانون (Long Arm Law) کے نام سے پاس کیا تھا۔ جس کے تحت ایف بی آئی کو یہ اختیا

مل ہے کہ اگر دنیا میں کہیں بھی دہشت گردی کی کسی کارروائی میں کوئی امریکی شہری ہلاک ہو ئے تو وہ اس کی تحقیق کر سکتی ہے۔ لیکن اس حادثے کے کئی ماہ بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا، تو ایف آئی کی ایک ٹیم پاکستان بھیجنے کی اجازت دی گئی۔ اس وقت بھی یوں دکھائی دیتا تھا کہ انہیں زیادہ ن میخ نہ نکالنے اور گہرائی میں نہ جانے کے احکامات مل چکے ہیں۔ ان کی تحقیقات مشکوک حد تک، ا پوتی کے سوا کچھ نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکیوں کو ضیاء اور اختر کی موت کا کوئی رنج نہ تھا۔ ریکہ کی وزارت خارجہ بھڑوں کے کسی چھتے میں ہاتھ ڈالنے پر آمادہ نہ تھی کیونکہ اس سے کے جی ، خاد اور "را" کے ملوث ہونے کا اشارہ مل سکتا تھا۔ اس سے امریکہ اور روس کے درمیان دیتانت" کی پالیسی متاثر ہو سکتی تھی جو روسی فوجوں کے انخلاء پر منفی اثر ڈال سکتی تھی اور چونکہ اس ادثے میں دو اعلیٰ امریکی شہری ہلاک ہو گئے تھے اس لئے امریکی عوام کی طرف سے بدلہ لینے کا طالبہ شدت پکڑ سکتا تھا۔ امریکیوں کی طرف سے اس عظیم سانحے کی اہمیت صرف اس قدر تھی کہ ں میں دو امریکی اپنی جانیں گنوا بیٹھے تھے لیکن یہ بھی محض سوئے اتفاق تھا کیونکہ صدر ضیاء نے ن آخری لمحے اپنے طیارے پر سوار ہوتے وقت انہیں اپنے ساتھ بٹھالیا تھا۔

یوں آئی ایس آئی سے علیحدگی کے کوئی اٹھارہ ماہ بعد جنرل اختر شہید ہو گئے۔ ان کی ہادت کے بعد جہاد افغانستان پر آخری کاری ضرب لگائی گئی۔ امریکہ پہلے ہی اسلحہ کی سپلائی بڑی دتک کم کر چکا تھا تا کہ روسی امن وامان سے نکل جائیں اور افغانستان میں ایک بار پھر پہلے کی سی بریقینی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ادھر حکومت پاکستان نے گوریلا حکمت عملی سے انحراف کرتے وئے اچانک دو بدو رسمی جنگ کا راستہ اپنا لیا اور جلال آباد پر چڑھائی کر دی۔ جنرل اختر کی لیحدگی، اوجڑی کیمپ میں اسلحے کا ضیاع، اور صدر ضیاء اور جنرل اختر کی شہادت کے بعد پیش آنے الے ان واقعات نے اس جہاد کو مفلوج کر کے رکھ دیا جسے مجاہدین اور جنرل اختر تقریباً جیت چکے تھے۔ (خاموش مجاہد..... مصنف بریگیڈیئر محمد یوسف صفحہ 110 تا 114)

O

دہشت گرد کون ہے؟

امریکہ کے نزدیک دنیا کا ہر وہ ملک اور انسان دہشت گرد ہے جو اس کے کسی بھی غیر انسانی، غیر اخلاقی، غیر آئینی عمل کی مخالفت کرے کیونکہ دنیا کی واحد بڑی طاقت (یونی لٹرل پاور) ہونے کے ناطے وہ دنیا کو اپنی مرضی سے چلانے پر بضد ہے۔ آیئے اس مہذب ملک کے ماضی کے کارناموں کا مختصر جائزہ لیں۔

6/اگست اور 7/اگست 1945ء کو جاپان کے دو شہروں پر امریکہ نے ایٹم بم گرا کر دو لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ متاثرہ شہر ہیروشیما اور ناگاساکی تھے، جہاں کوئی فوجی تنصیبات نہیں تھیں۔ یہ شہری بستیاں تھیں۔ امریکہ کے کئی جنرل اس حملے کے مخالف تھے، کیونکہ یوں بھی چند ہفتوں میں جاپان کو شکست ہونے والی تھی لیکن اس وقت کے امریکی صدر ٹرومین نے عسکری ماہرین کی آراء کو مسترد کرتے ہوئے ان نسل کش ہتھیاروں کا تجربے کے طور پر استعمال ضروری سمجھا اور امریکہ کو زرد فام نسل سے بہتر قربانی کے بکرے کہاں مل سکتے تھے؟ اس اقدام کے محرک امریکہ کا نسلی تعصب تھا، جس کا مظاہرہ امریکہ میں سفید فارم قزاقوں کی آمد کے وقت دیکھنے میں آیا کہ کس طرح فرزندان زمین کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ ان کی آبادیوں کو نذر آتش کر دیا گیا ان کے تیل کے کنوؤں، کھیتوں، کھلیانوں اور مویشیوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا۔ نسل کشی کے اس منصوبے کے نتیجے میں امریکہ کے حقیقی باشندوں کی آبادی، جو کولمبس کی آمد پر ایک کروڑ سے زائد تھی۔ چھ صدیوں میں گھٹ کر 9 لاکھ رہ گئی جبکہ یورپ سے آنے والے مسیحی آبادکاروں کی تعداد بائیس کروڑ ہو گئی۔ کیا ایسی نسل کشی کی مثال تاریخ عالم میں ملتی ہے؟ پھر بنی نوع انسان کے لئے سب سے بڑا خطرہ کون ہے۔ امریکہ یا پاکستان؟

کیا فاٹا کے قبائلیوں نے پندرہویں صدی میں امریکہ پر حملہ کر کے ریڈ انڈین کسانوں

اور گلہ بانوں کا قتل عام کیا تھا؟ یہ رچرڈ ہولبروک کے ہی آباؤ اجداد تھے جنہوں نے انسانیت کے خلاف تاریخ کا سب سے گھناؤنا جرم کیا تھا۔

کس نے سمندر میں لنگر انداز اپنے ہی جہاز MAINE میں اپنے ایجنٹوں سے بم دھماکہ کرا کر اس کا الزام ہسپانیہ کے مقبوضہ جزیرے کیوبا کے باشندوں پر تھوپ کر ہسپانیہ کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور اسے شکست دے کر کیوبا اور فلپائن پر قبضہ کر لیا۔ یہ اوچھا ہتھکنڈا امریکہ کے سیکرٹری برائے بحریہ تھیوڈور روز ویلٹ نے استعمال کیا تھا۔ بعد ازاں یہ قزاق امریکہ کا صدر منتخب ہو گیا اور لاطینی امریکہ کی کمزور حکومتوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا رہا اور ان کے قدرتی وسائل کو لوٹتا کھسوٹتا رہا۔ یہ تھیوڈور روز ویلٹ تھا جس نے ''گاجر اور ڈنڈے'' کی اصطلاح وضع کی تھی جو آج بھی رائج ہے MAINE میں تخریب کاری کس نے کی تھی۔

1915ء میں بحیرہ کیریبین کی دو غریب ریاستوں ہیٹی (Haiati) اور ڈومینکن ریپبلک (Dominican Republic) پر کس نے بحری حملہ کیا تھا؟ امریکہ نے یا پاکستان نے؟ اگست 1953ء میں کس نے ایف بی آئی اور سی آئی اے کے ایجنٹوں Kermit Norman Schwarkofp Velt (نارمن شوارکاف) کو دس لاکھ ڈالروں سے بھرے بریف کیس کے ساتھ ایران بھیجا تھا، جنہوں نے فوج کے وطن فروش جنرلوں کو رشوت دے کر ایران کی منتخب حکومت کا تختہ الٹوایا؟ انہی دو امریکی تخریب کاروں نے تہران کے رسوائے زمانہ غنڈے شعبان بے مغز کے کرائے کے قاتلوں سے مصدق حکومت کی کابینہ کے وزراء کا قتل اور سرکاری عمارات و دفاتر پر حملے کرائے اور امریکی پٹھو اور منشیات کے عادی جنرل فضل اللہ زاہدی کو ایران کا وزیر اعظم بنوا کر ایران کے تیل پر امریکی تیل کمپنیوں کی اجارہ داری قائم کرا دی۔

1954ء میں کس نے امریکی United Fruit کمپنی کے قومیائے جانے پر Jose Arbenz کی حکومت کا تختہ الٹوایا تھا؟ امریکہ کے سیکرٹری وزارت خارجہ جان فوسٹر ڈلیس John Foster Dulles اور اس کے بھائی اور سی آئی اے کے ڈائریکٹر ایلن ڈلیس نے۔

کس نے 1973ء میں چلی کی منتخب حکومت کے سربراہ Alliende کا تختہ الٹوا کر انہیں اور لاطینی امریکہ کے شہرہ آفاق قومی شاعر پبلا نیرودا (Pebula Neruda) کو بے دردی سے قتل کرایا اور پنوشے (Pinoche) نامی جلاد کو چلی کا صدر بنوایا۔

کس نے کانگو کے علیحدگی پسند صوبے کٹنگا کے باغی موازی شابے کو رقوم اور اسلحہ فراہم کیا اور جب اس کے خلاف اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل واگ ہیر شولڈ نے منشور کے تحت فوجی کارروائی کرائی تو سفید فام نسل پرست جنوبی رہوڈیشیا کے سربراہ آیان اسمتھ Ian Smith سے ان کے جہاز پر دوران پرواز حملے کرا کر انہیں ہلاک کر دیا؟

کس نے 1950ء تا 1953ء شمالی کوریا پر حملہ کیا اور کون کوریائی اور چینی جنگی قیدیوں کو ہوائی جہاز پر لے جا کر انتہائی بلندی سے انہیں نیچے دھکیل دیتا تھا؟

دس لاکھ کوریائی باشندوں کو کس نے ہلاک کیا، طالبان نے؟ کون کوریائی اور چینی جنگی قیدیوں کا سر کاٹ کر ان کا کاسۂ سر تراشنے کے بعد انہیں امریکی فوجی میس (Mess) میں بطور Ashtray استعمال کرتا تھا۔

کس نے ویتنام کی شہری آبادی اور جنگلات پر نیپام، کیمیاوی اور حیاتیاتی بم پھینکے جن کے متاثرین جو زندہ رہ گئے ریڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، پھر لاؤس اور کمبوڈیا کی غیر جانبدار ریاستوں کو ویٹ کانگ چھاپہ ماروں کی گزرگاہ قرار دے کر ان پر کس نے بمباری کی؟ ویتنام میں بیس لاکھ اور لاؤس اور کمبوڈیا میں دس لاکھ انسانوں کو کس نے جان سے مار دیا؟

ویتنام کے گاؤں می لائی (Mili) میں 9 سالہ بچی کی عصمت دری کر کے کس نے ہلاک کیا تھا؟ 1961ء میں کیوبا پر کس نے حملہ کیا تھا؟ وسطی امریکی ریاست ایل سیلوریڈور اور گوئے مالا میں ان ممالک کی امریکہ نواز فوج نے، جبکہ نکاراگوا میں امریکہ کی سرپرستی میں حکومت مخالف باغیوں نے، جنہیں امریکہ کی ریگن انتظامیہ نے اسلحہ اور رقم فراہم کی تھی۔ اسی طرح انگولا اور موزمبیق کے باغیوں نے امریکی اسلحہ سے لیس اس کے کرائے کے سپاہیوں کی طرح وہاں کی حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لئے غارت گری کا بازار گرم کئے رکھا۔

سوڈان میں عیسائی ملیشیا Gorge Garring آنجہانی کی قیادت میں امریکہ کی بھرپور سفارتی اور سیاسی حمایت سے ریاست کو توڑنے کے لئے کشت وخون اور تخریب کاری کا ارتکاب کیا۔ امریکہ سی آئی اے اس لٹیرے ملیشیا کو اسلحہ اور رقم فراہم کرتی تھی۔ یہ سوڈان کی سالمیت پر امریکہ کا حملہ تھا۔ افغانستان جیسے پس ماندہ اور نہتے ملک پر کس نے یلغار کر کے مساجد، مدارس، خانقاہوں، ہسپتالوں، آبی ذخائر پر ڈیزی کٹر بموں سے حملہ کر کے جیتی جاگتی بستیوں کو قبرستان میں تبدیل کر دیا؟ کس نے عراق پر مہلک ہتھیاروں کے خاتمے کے بہانے وحشیانہ حملہ

کر کے 15 لاکھ انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا؟ اور کون جنوبی، شمالی وزیرستان اور کرزئی اور کرم ایجنسیوں اور بنوں پر جاسوس طیاروں سے قبائلی اور شہری آبادیوں پر حملے کر رہا ہے؟

یہ ہے امریکہ کا وہ چہرہ جسے وہ کبھی درخور اعتناء نہیں جانتا اور دنیا میں امن قائم کرنے پر تلا ہے۔

O

امریکن ہم سے کیا چاہتے ہیں؟

رچرڈ این ہاس امریکہ کی بین الاقوامی تعلقات کی کونسل کے صدر ہیں۔انہوں نے حال ہی میں "War of Nessity War of Choice" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کے کچھ نکات پر لاس اینجلس ٹائم اور واشنگٹن پوسٹ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔رچرڈ ہاس کا خیال ہے کہ کسی بھی جنگ کے مقاصد کا صحیح تعین کرنا بہت ضروری ہوتا ہے اور یہ فیصلے کرتے وقت یہ سوچنا بھی کہ کم سے کم وقت میں اور کم سے کم قیمت پر صرف انتہائی ضروری جنگی مقاصد کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔1950ء میں شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کیا اور جنوبی کوریا کی افواج کو جنوبی بندرگاہ پوسان تک دھکیل کر لے جایا گیا تو امریکہ فوراً جنوبی کوریا کی مدد کے لئے جنگ میں کود پڑا۔صرف اس محدود جنگی مقصد کے ساتھ کہ شمالی کوریا سے جنوبی کوریا کے علاقے خالی کروانے ہیں۔اس مقصد کے حصول کے لئے امریکی جنرل میکارتھر نے اپنی افواج کو Inchon بندرگاہ پر بہت پیشہ ورانہ طریقے سے اتار کر شمالی کوریا کو حیران کر دیا۔نتیجتاً شمالی کوریا کو جنوبی کوریا کے مفتوحہ علاقے خالی کرنا پڑے لیکن اس کے بعد جنرل میکارتھر کے کہنے پر امریکی صدر ٹرومین نے جب امریکی حملوں کو شمالی کوریا کے اندر لے جانے کا غلط فیصلہ کیا تو پھر شمالی کوریا، روس اور چین کی مشترکہ کوششوں سے امریکہ اپنے 30000 فوجی مروا کر دوبارہ 38th Parallel تک پسپائی پر مجبور ہو گیا۔

پہلی خلیجی جنگ میں بھی عقلمند سینئر بش کا War Aim صرف کویت سے عراقی افواج کا انخلا تھا اس نے کہا تھا امریکہ کا مقصد ہے Reversing Iraq's invasion of Kuwait" سینئر بش کو پتہ تھا کہ عراق کے اندر داخل ہونے کی اتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے جس کو امریکہ کی پشتیں بھی نہیں چکا سکیں گی لیکن بش جونیئر اتنا عقلمند نہ تھا وہ عراق پر یہ سمجھتے ہو

چڑھ دوڑا کہ صرف صدام کو ختم کرنے سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔مشرف نے بھی CNN کو دیئے گئے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا ہے کہ عراق کا Centre of gravity (طاقت کا مرکزی نقطہ) صدام کی شخصیت تھی۔بڑی جنگ چھیڑنے سے زیادہ بہتر ہوتا کہ صرف صدام کو پکڑ لیا جاتا اور مطلوبہ نتائج حاصل ہو جاتے۔میں نہایت انکساری سے کہوں گا کہ عراق کا Centre of Gravity صدام حسین نہیں بلکہ عراق کی مسلح افواج اور قوم کی Will to Fight تھی۔16 رمئی کے گلف نیوز نے بھی لکھا ہے:

"Bush succeeded in ousting Saddam Hussain but at a high cost.... and the expected benefits and not materialise in Iraq or the region" (گلف نیوز۔ 16 رمئی 2009)

صدام کو قتل کرنے کے بعد بھی امریکی افواج اس وقت تک عراق پر غلبہ نہیں پا سکتی تھی جب تک کہ عراق کی وار مشین کو تباہ نہ کر دیا جاتا اور قوم کی Will to Fight نہ توڑ دی جاتی۔ بش کے الوداعی دورے پر بھی جوتے کھانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عراق فوج تو تباہ ہو گئی لیکن قوم کی Will of Fight ابھی بھی قائم ہے۔یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے پاکستان کا Centre of Gravity جنرل مشرف میں تھا، نہ آج جنرل کیانی میں ہے بلکہ پاکستان کا Centre of Gravity پاکستان کے مضبوط ترین ادارے افواج پاکستان اور افواج میں بھی اس کی ایٹمی صلاحیت میں ہے۔اس لئے ہمارے دشمن افواج پاکستان اور ہماری ایٹمی صلاحیت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔

اخبار لکھتا ہے کہ ''اب امریکی صدر اوباما کو بھی اپنے جنگی مقاصد کا تعین کرنا ہوگا۔کیا وہ القاعدہ کو ختم کرنا چاہتا ہے یا طالبان کو شکست دینا چاہتا ہے یا ڈرگ کی پیداوار کو ختم کرنا چاہتا ہے یا افغانستان میں جمہوریت لانا چاہتا ہے؟'' اخبار کے مطابق ''ان میں سے کم سے کم مقاصد بھی افغانستان جیسے ملک میں حاصل کرنا بہت مشکل ہوگا۔چونکہ افغانستان ایک ایسا ملک ہے جس کو "Grave of Empires" کہا جاتا ہے۔'' اخبار کے مطابق ''اوباما نے افغانستان میں اب جو اپنے جنگی مقاصد رکھے ہیں ان میں القاعدہ کو ٹارگٹ کرنا، طالبان کو کمزور کرنا اور افغانستان کی مرکزی حکومت کو مضبوط کرنا ہے۔'' اخبار لکھتا ہے کہ ''اوباما کو ہماری نصیحت یہ ہوگی کہ اگر یہ مقاصد بھی پورے نہیں ہو سکتے تو پھر بھی وہاں فوج کی تعداد کو بڑھانا بہت بڑی غلطی ہوگی اور زیادہ

عقلمندی یہ ہوگی کہ جنگی مقاصد کو کم کر کے اس حد تک لے جایا جائے جو attainable ہوں،
امریکہ اور ہنود و یہود لابی کی یہ خواہش ہے کہ پاکستان کا ایٹمی جبڑا نکال کر اس
پلاسٹک کے مصنوعی دانت لگا دیئے جائیں تا کہ اسلامی پاکستان اگر اپنے دفاع کے لئے کسی ج
آور کو کاٹے بھی تو جارح کے جسم پر دانتوں کے نشان تک نہ پڑیں اس لئے اوباما کہتے ہیں
پاکستانی ایٹمی ہتھیاروں کا کنٹرول سنبھالنے کے ہمارے پاس آپشنز موجود ہیں۔ دوسری بات
ہے کہ امریکہ کے حکومت پاکستان، افواج پاکستان، آئی ایس آئی اور پاکستان کے ایٹمی پروگر
کے خلاف غلط وقت پر غلط بیانات کی وجہ سے امریکہ کو پاکستان اور افغانستان میں منفی پریس کو
ملتی ہے جس کا اگلے دن ہیلری کلنٹن نے اعتراف بھی کیا ہے۔ اسی منافقانہ پالیسی
گوانتاناموبے اور ابوغریب جیلوں میں بش انتظامیہ کے مسلمانوں کے خلاف انسانیت سوز مز
نے بھی دہشت گردوں کے حق میں ہمدردیاں پیدا کیں اور حکومت پاکستان کے اپنے ملک
باغیوں کے خلاف پُرعزم اور فیصلہ کن جنگ لڑنے کے راستے میں مانع رہے۔ پاکستانی عوام کا ا
امریکی قیادت کو یہ پیغام ہے کہ پاک سرزمین پر قدم نہ رکھنا، یہ بہت مہنگا سودا ہوگا۔ حقیقت یہ
کہ امریکہ عراق یا افغانستان میں امن لانے میں تو بالکل ناکام ہو گیا ہے اور اب اپنی اس نا
سے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لئے منصوبے کے تحت پاکستان پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہا۔
امریکہ افغانستان میں رہنے کے لئے آیا ہے جس کے لئے اس کو کوئی بہانہ چاہئے۔ حالا
مقابلہ کرنے کے لئے میرے خیال میں مندرجہ ذیل حقائق کا سمجھنا بڑا ضروری ہے۔

امریکہ افغانستان میں طالبان کو شکست دینے نہیں آیا نہ وہ ایسا کر سکتا ہے طالبا
شکست ایک ظاہری Mission ہے جس کا پس چلمن مقصد افغانستان میں اپنی مستقل ses
رکھنا ہے جو امریکہ نے بنالی ہیں لیکن امریکہ تاریخ کا یہ سبق سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ یہ لڑائی
وقت تک جاری رہے گی جب تک امریکہ افغانستان سے اپنی افواج کا انخلا نہیں کر لیتا۔

پاکستان کی قومی سلامتی کو اصل خطرہ بیرونی دشمنوں کے ناپاک عزائم سے کم اور ہما
کمزور سیاسی ڈھانچے سے زیادہ ہے۔ ایسا کمزور ڈھانچہ جس میں کمزور حکمرانی، معاشی نا نصہ
نااہلی، کنبہ پروری اور بدترین کرپشن کی اتنی گہری دڑاڑیں پڑ چکی ہیں جن کو بھرنے کی طرف
بدقسمتی سے دھیان بھی نہیں دے رہے۔ شام ڈھلے مدہوش ہو جانے والے اور رنڈیوں کے کوٹ
پر رقم لٹانے والے سیاسی و غیر سیاسی قائدین اگر پیشہ ورانہ حکمت و بصیرت سے عاری ہوں

ساٹھ سالہ تجربہ بتاتا ہے تو پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حفاظت کون کرے گا۔

کل جماعتی کانفرنس کے اختتام پر صرف یہ کہہ دینا کہ سب دہشت گردی کا صفایا کرنے
پر متفق ہیں اصل حقائق سے پہلوتہی ہے۔ پوری قوت کے ساتھ دہشت گردی کا صفایا تو ملک کا بچہ
بچہ چاہتا ہے لیکن وہ موثر State Apparatus کدھر ہے جو ایسا کر سکے گا۔ کل جماعتی
کانفرنس میں شاید ہی کسی سیاسی قائد نے یہ سوال اٹھایا ہو کہ اپنے گھر کی طہارت اور ملک میں
حکمرانی کو مضبوط کرنے کے لئے 88 وزراء کی فوج کو جس میں بہت سے نااہل، بدعنوان، کرپٹ
اور راشی لوگ بھی شامل ہیں کو کب توڑ کر صرف 15 یا 20 ایماندار وزراء کی کابینہ بنائی جائے گی
جن قائدین نے خود اپنی جماعتوں کے لئے ایسی وزارتیں سیاسی تعاون دینے کے بدلے بطور
رشوت حاصل کی ہوں وہ ایسا مطالبہ کیوں کریں گے؟

دنیا کو دہشت گردی کی آگ کا ایندھن بنانے والے اس امریکہ سے متعلق کئے گئے
انکشافات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس حوالے سے گزشتہ تین سال سے بلیک واٹر ایجنسی کا نام
سامنے آیا ہے۔

بلیک واٹر ایجنسی کی آمد

افغانستان اور اس کے بعد عراق میں امریکی جارحیت کے بعد ایسے ایسے موضوعات کھل کر سامنے آئے ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا اب مشکل نہیں رہا کہ امریکہ جسے دنیا ایک ملک سمجھتی ہے کسی قسم کے نظام کے تحت کام کر رہا ہے۔ دراصل امریکہ نہ تو ایک ملک کی طرح تھا اور نہ ہی یہاں ایک قوم بستی ہے اسے مختلف قوموں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے جہاں پر دنیا بھر کے سرمایہ دار اور عالمی صیہونیت کے کرتا دھرتا پناہ لئے ہوئے ہیں اور یہیں سے وہ تمام دنیا کی اقوام اور ان کے فکری، اقتصادی اور سیاسی معاملات میں تباہ کن دخل اندازی کرتے ہیں۔

امریکہ کے کارپوریٹڈ معاشرے میں ہر چیز طاقت اور سرمائے کی بنیاد پر چلائی جاتی ہے افغانستان اور عراق پر امریکی جارحیت کے بعد دنیا کو پہلی مرتبہ اس حقیقت کا بھی علم ہوا کہ اس معاشرے میں باقاعدہ نجی اداروں نے فوجیں بھی تشکیل دے رکھیں ہیں جو باہر کی دنیا میں امریکی جارحیت کے دوران عسکری خدمات انجام دے کر اپنا مال غنیمت سمیٹتی ہیں۔ ان نجی اداروں میں ایک ادارہ ''بلیک واٹر'' Black Water نامی کمپنی بھی ہے جس کے کرائے کے فوجی افغانستان اور عراق میں بھی بھاری سرمائے کی بنیاد پر مغربی استعماریت کے مقاصد پورے کر رہے ہیں۔ 2007ء ہی میں پاکستان آنے والے امریکی نائب وزیر خارجہ جان نیگروپونٹے اور زلمے خلیل زادہ کی حفاظت کے لئے امریکی حکومت نے دیگر عسکری خدمات کے علاوہ بلیک واٹر کمپنی کو باقاعدہ ''ٹھیکہ'' دیا ہے۔

بلیک واٹر کمپنی کو 1996ء میں مشی گن سے تعلق رکھنے والے انتہائی دولت مند خاندان کے فرد اریک پرنس Erik Prince نے قائم کیا تھا اریک پرنس ماضی میں امریکی بحریہ میں بھی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ اس کا شمار اس وقت ''نیوکان'' یعنی حالیہ بنیاد پرست امریکی انتظامیہ

کے بڑے پشتی بانوں میں ہوتا ہے۔ ذرائع کے مطابق جس وقت 1994ء میں امریکہ میں سلمانوں کے خلاف دہشت گردانہ صلیبی جنگیں شروع کرنے کے لئے امریکہ بھر میں مذہب کے نام پر مہم کا آغاز کیا گیا تھا اس وقت اریک پرنس کے خاندان کا سرمایہ بھی اس مہم میں خرچ کیا جا ہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کیرولینا ریاست کے شمال میں 5000 ایکڑ کا علاقہ باقاعدہ ایک فوجی ے کے لئے تشکیل دیا گیا تاکہ مستقبل قریب میں اسلامی دنیا کے خلاف امریکہ کی صلیبی جنگوں کے حوالے سے اس کی عسکری ضروریات پوری کر کے کثیر سرمایہ کمایا جا سکے اس اڈے پر امریکی جوانوں کو مذہب کی بنیاد پر پرائیویٹ فوجی کے طور پر بھرتی کیا جاتا تھا اور یہیں پر انہیں عسکری تربیت بھی دی جاتی تھی۔ اس کمپنی کے قیام کے بعد اریک اور اس کے خاندان نے سیاسی حلیفوں کے ساتھ مل کر ری پبلیکن پارٹی کی انتخابی مہم کا آغاز کیا تاکہ ری پبلیکن پارٹی کو کانگریس میں اکثریت دلا کر بش کے لئے وائٹ ہاؤس کا راستہ ہموار کیا جا سکے۔ بلیک واٹر کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بل کلنٹن کے دور میں اس کمپنی نے انہیں بھی ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ کے لئے اکسایا تھا مگر اس وقت کے حالات کے مطابق امریکی حکومت اسے عملی جامہ پہنانے کی قوت نہیں رکھتی تھی کیونکہ اس جنگ کے لئے ایک بڑے جواز کی ضرورت تھی اسی لئے یہ جواز بش کی آمد پر نائن الیون کی شکل میں پیدا کیا گیا۔ فرانسیسی مصنف ٹیری میسان نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''بڑا دھوکہ'' میں دعوی کیا تھا کہ یہ تمام کارروائی امریکی فوج کی ہی کارستانی ہے..... اس کتاب نے اس وقت خاصی شہرت حاصل کی اور اس کے کئی زبانوں میں تراجم بھی شائع ہوئے مگر آہستہ آہستہ سے منظر سے غائب کر دیا گیا۔ اس وقت لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ امریکی فوج کا اگر یہ کارنامہ ہے تو یہ بات پھیلی کیوں نہیں؟ یا ان عناصر کے خلاف کارروائی کیوں نہ کی گئی؟ مگر اب یہ بات کچھ کچھ اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ امریکہ جس قسم کے نظام کے تحت کام کرتا ہے اس میں زیادہ تر حصہ کارپوریٹڈ ہے اس کے عسکری معاملات کا بڑا حصہ کرائے پر حاصل شدہ ہے اس لئے اگر ایسی کوئی کارروائی کسی ایسے ادارے کی جانب سے کی گئی ہو جو ''کرایا'' وصول کر کے عسکری خدمات انجام دیتا ہے..... تو پھر کس کے خلاف تحقیقات ہوتی تھیں؟ اس سلسلے میں امریکیوں کو اس بات کا اندازہ تھا کہ امریکہ اسلامی دنیا کے وسائل لوٹنے کے لئے جس قسم کی جنگ کا آغاز کرنے والا ہے اس میں اس کا جانی نقصان بھی سب سے زیادہ ہوگا اور ویت نام کی جنگ کی طرح امریکی خاندان امریکی حکومت کی جان کو آ جائیں گے۔ اس لئے اس جنگ سے پہلے ہی اس بات کا فیصلہ

کرلیا گیا تھا کہ اس جنگ کے خطرناک حصے نجی عسکری اداروں کے ذریعے لڑے جائیں گے تاکہ امریکیوں کی ہلاکتیں ریکارڈ پر ہی نہ آسکیں۔

بہرحال بلیک واٹر کا کاروبار نائن الیون کے واقعے کے صرف دو ہفتے بعد خوب چمکا.....اور امریکہ کی جانب سے شروع کی جانے والی ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ میں ادارہ اہم کردار ادا کرنے والوں میں شامل ہوگیا۔ ایک مرتبہ کمپنی بلیک واٹر کے صدر ایرک پرنس نے امریکی نیوز چینل فاکس نیوز کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا کہ اپنی کمپنی کو امریکی مقاصد کے شانہ بشانہ لانے کے لئے انہوں نے چار برس تک ''تربیت'' حاصل کی۔ امریکہ افغانستان کے خلاف جارحیت کے دوران ہی بلیک واٹر کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس حوالے سے یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ادارے کی حد تک جو ادارہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سے زیادہ مالی فواد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے اس میں بلیک واٹر سرفہرست ہے اس سلسلے میں اس کمپنی نے امریکی حکومت سے ایک بلین ڈالر کا خفیہ معاہدہ کیا تھا اس کے بعد اس کمپنی اتنے مالی فوائد حاصل کئے کہ اب بلیک واٹر کے صدر ایرک پرنس نے اپنے عسکری اڈے کو 100 ہیکٹر کے رقبے پر پھیلا لیا ہے۔ اسے دنیا کا سب سے بڑا فوجی اڈہ بھی کہا جاسکتا ہے!

اس وقت بلیک واٹر کمپنی میں 2300 کے قریب فوجی ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں کام کررہے ہیں اس کے علاوہ ایک طیارہ بردار بحری بیڑا ہے جس پر 20 جنگی طیاروں کے ساتھ بہت سے جنگی ہیلی کاپٹر اور انٹیلی جنس نگرانی کی سہولتیں موجود ہیں۔

2005ء میں جس وقت امریکہ کی ریاست نیو اورلنز میں ''کترینا طوفان'' آیا تھا وقت انسانی جانوں کے بچاؤ کے لئے بلیک واٹر نے اپنے ہر کارکن کی قیمت 950 ڈالر امریکہ حکومت سے وصول کی تھی۔ اس طرح مجموعی طور پر جو بل امریکی حکومت کو اس کمپنی کی جا سے موصول ہوا وہ 2400000 ڈالر یومیہ کا تھا کمپنی کے 600 کارکن ٹیکساس سے المسیسی تک خدمات انجام دے رہے تھے اس سلسلے میں بلیک واٹر نامی کمپنی نے مشہور سابق اداکار ارنلڈ شوارزینیگر کی خدمات بھی حاصل کی تھیں اس کے بعد امریکہ میں داخلی طور کمپنی کا دائرہ کار کیلی فورنیا تک جا پہنچا۔

عراق میں کام کرنے والے امریکی سفارت کاروں اور دیگر حکومتی اہلکاروں کی حفا کا ٹھیکہ بھی اس کمپنی بلیک واٹر کے حوالے کیا گیا تھا اسے موجودہ دور میں امریکہ کا سب سے

معاہدہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی ابتدا 2003ء میں ہوئی تھی جس کی لاگت کا تخمینہ 21 ملین ڈالر لگایا جاتا ہے۔ اس میں عراق پر مسلط کردہ ناظم الامور پال بریمر Paul Bremer کے لئے سب سے پہلے حفاظتی گارڈ تعینات کئے گئے تھے اس کے بعد جان نیگروپونٹے اور زلمے خلیل زاد کے ساتھ ساتھ دیگر امریکی سفارت کاروں کی حفاظت کا ٹھیکہ بھی اسی کمپنی کو سونپا گیا۔ جبکہ 90 کانگریس ارکان جو عراق کا دورہ کرتے رہے بشمول سینٹ کی چیئر مین نینسی پلوسی بھی اس کمپنی کی حفاظت میں عراق تک پہنچیں۔

عرب صحافتی ذرائع کے مطابق اس وقت بہت سی لابیاں جنوبی سوڈان میں دارفور کے علاقے میں خدمات کا ٹھیکہ حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہیں جو تقریباً 750 ملین ڈالر کا ہوگا۔ اس سلسلے میں امریکی صدر کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ان کی خواہش ہے کہ یہ ٹھیکہ بھی بلیک واٹر کو ہی ملے! کیونکہ اس کمپنی کے عسکری ماہرین جنوبی سوڈان میں علیحدگی پسند عیسائیوں کو عسکری تربیت دیتے رہے ہیں۔ اسی بنیاد پر کہا جارہا ہے کہ جلد ہی بلیک واٹر دوبارہ جنوبی سوڈان میں عسکری کارروائیوں کے لئے وہاں اپنے فوجی روانہ کردے گی۔

نائن الیون کے بعد بلیک واٹر کمپنی نے اپنے متعدد آدمی امریکی انتظامیہ میں تعینات کروائے ہیں ان میں ایک شخص جے کوفر بلیک J. Cofer Black ہے جسے بش انتظامیہ میں سی آئی اے کے اندر ''انسداد دہشت گردی'' کے شعبے کا سربراہ بنایا گیا۔ یہی وہ ادارہ ہے جو نائن الیون کے بعد اسامہ بن لادن کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا ذمہ دار تھا! اسی طرح جوزف شمیٹز Josepoh Schmitz ہے جسے بلیک واٹر کمپنی نے امریکی محکمہ دفاع پینٹاگان میں عسکری ادارے میں افرادی قوت کی بھرتی کا کام سونپا تھا لیکن جلد ہی اس پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ اپنی خدمات ٹھیک انداز میں پوری نہیں کررہا۔ یوں بعد میں اسے اپنے عہدے سے مستعفی ہوکر دوبارہ بلیک واٹر کمپنی میں شمولیت اختیار کرنا پڑی۔

دنیا ابھی تک نجی عسکری اداروں کی عراق میں موجودگی سے ناواقف تھی کہ 31/مارچ 2004ء کو فلوجا کے مقام پر چار امریکی فوجی مارے گئے۔ مشتعل ہجوم نے ان فوجیوں کی لاشیں جلا کر سرعام اس کی نمائش کی اور امریکہ کے خلاف نعرے بازی کی اس کے بعد دریائے فرات کے کنارے دو امریکی فوجیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ یہ فوجی دراصل بلیک واٹر کمپنی کے ہی تھے۔ اس واقعے کے بعد امریکی فوج نے اس علاقے یعنی فلوجا کا محاصرہ کرلیا اور بے رحمی کے ساتھ نہتے

شہروں کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا جس سے کئی سو عورتیں، بچے اور بوڑھے شہید ہو گئے اور ہزاروں عراقیوں کو اس علاقے سے ہجرت کرنا پڑی۔ امریکہ کی اس بربریت کا ہی نتیجہ تھا کہ عراق میں امریکہ کے خلاف تیزی کے ساتھ مزاحمت منظم ہو گئی اور اب اس مزاحمت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے عملاً امریکہ عراق میں شکست کھا چکا ہے اور یہاں سے نکلنے اور یہاں کے تیل سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے اب ایران کے ساتھ مذاکرات کر کے عراق کی دولت یعنی تیل سے اس کی قیمت ایران کو ادا کرنا چاہتا ہے۔ دبئی سے شائع ہونے والے عربی اخبار الاتحاد کی ایک رپورٹ کے مطابق ایران اور امریکہ کسی حد تک عراقی تیل کی بندر بانٹ پر متفق ہو چکے ہیں!!

جہاں تک بااثر امریکیوں کا تعلق ہے تو انہیں اس حوالے سے پہلی مرتبہ خصوصی فوج Private Soldiers کا نام سننے کو ملا ہے۔ اس سلسلے میں ریاست کیرولینا سے ڈیموکریٹک رکن کانگریس ڈیوڈ پرائس David Price نے کہا ہے کہ پرائیویٹ فوجیوں کا تصور عام امریکیوں کے لئے نیا ہے۔ جن دنوں فالوجا کا مسئلہ زوروں پر تھا اور ہر طرف امریکہ کر شکست کی باتیں ہو رہی تھیں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ واشنگٹن میں ایک بااثر گروپ الیگزنڈر سٹریٹجی گروپ Alexander Strategy Group نے بلیک واٹر میں بھاری سرمایہ کاری کا منصوبہ وضع کیا تھا یہ گروپ واشنگٹن میں پریشر گروپ کے طور پر جانا جاتا ہے جس میں ٹوم ڈیلے Tom Delay نمایاں نام ہے۔ اس کے بعد بلیک واٹر کے سربراہ ایرک پرنس نے حکومتی پارٹی کی دفاعی کمیٹی برائے امریکن سینٹ کے چار اہم ارکان جن میں جان وارنر John Warner، ریک سینٹورم Rick Santorum، ٹیڈ سٹیون Ted Steven اور جارج ایلن George Allen شامل تھے، سے ملاقات کی، اس کے بعد اس قسم کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ری پبلیکن پارٹی کے اہم ارکان جن میں ڈی لے Delay، پورٹر گوس Porter Goss، ڈونکن ہنٹر Duncon Hunter، اور بل ینگ Bill Young شامل ہوتے تھے۔ ان ملاقاتوں کے ٹھیک ایک ماہ بعد امریکی حکومت نے بلیک واٹر کمپنی سے تین سو ملین ڈالر کا ایک اور معاہدہ کر لیا!!

اس مختصر صورت حال کو سامنے رکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کو امریکی اب کس ڈھنگ میں چلانا چاہتے ہیں، انہوں نے دنیاوی معاملات کو ایک بڑے جنرل سٹور کی

شکل دے دی ہے۔ جو چیز درکار ہو اس کی قیمت ادا کی جائے اور مقاصد حاصل کئے جائیں، اسی طرز عمل کی روشنی میں وہ اپنی نام نہاد ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' بھی لڑ رہے ہیں۔ اپنے حلیفوں کو انہوں نے کرائے کا آلہ سمجھ لیا ہے ہر سال اس کی بڑی قیمت ادا کرتے ہیں اور انہی کو انہی کے بھائیوں سے لڑاتے ہیں۔

بے نظیر کو کس نے شہید کیا؟

امریکہ کے شہرہ آفاق، بے باک اور حق گو دانشور اور صحافی سیمور ہرش (Seymour Hersh) جو امریکہ کے مستند جریدے نیویارک ٹائمز اور دوسرے اخبارات میں لکھتے ہیں، نے بڑے سنسنی خیز انکشافات کئے ہیں، مثلاً پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو بش انتظامیہ کے دور میں نائب صدر ڈک چینی نے قتل کرایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ محترمہ نے 2 نومبر 2007ء کو الجزیرہ ٹی وی پر یہ کہا تھا کہ اسامہ بن لادن اب زندہ نہیں ہیں کیونکہ انہیں القاعدہ کے ایک فعال رکن عمر سعید شیخ (جو امریکی صحافی ڈینیل پرل کے قتل کے الزام میں پاکستان میں زیر حراست ہے) نے قتل کیا تھا، لیکن ان کا انٹرویو لینے والی صحافی ڈیوڈ فراسٹ David Frost نے اسے حذف کر دیا جس کی وجہ سے یہ نشر نہیں ہو سکا۔ جناب ہرش نے 12 مئی 2009ء کو گلف نیوز کو بتایا کہ ڈک چینی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسامہ بن لادن کی موت کی خبر دنیا کو معلوم ہو، کیونکہ اس صورت میں امریکہ کو افغانستان میں طالبان سے جنگ کرنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہے گا۔

Pultizer Prize پیولٹزر انعام یافتہ صحافی نے مزید انکشاف کیا کہ ڈک چینی نے سربراہوں کے قتل کے لئے ایک خفیہ تنظیم بنائی ہوئی تھے جس کا کام ہی اہم شخصیات کو قتل کرنا تھا۔ چنانچہ پیشہ ور قاتلوں کا یہ ٹولہ قتل کرنے کے بعد اس کی اطلاع براہ راست نائب صدر ڈک چینی کو دیتا ہے چنانچہ اسی قاتل ٹولے نے ڈک چینی کے حکم پر لبنان کے وزیر اعظم رفیق حریری اور اس کی فوج کے سربراہ کو قتل کیا۔ اس سازش میں ایک اور قاتل ایریل شرون بھی شامل تھا، جسے دنیا بیروت کے قصائی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ لبنانی رہنما اور فوج کے سپہ سالار اعلیٰ کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں لبنان میں امریکہ کو فوجی اڈے دینے پر راضی نہیں تھے۔ (19 مئی 2009ء)

جن دنوں رفیق حریری کا قتل ہوا تھا تو ایک طے شدہ منصوبے کے تحت مغربی ذرائع غ نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ قتل شام کی خفیہ ایجنسی نے کرایا ہے۔ مقتول کے بزادے سعد حریری آج تک برادر عرب ملک پر شبہ کرتے ہیں اور انہوں نے اندرون ملک م اور حزب اللہ کے خلاف محاذ آرائی کر رکھی ہے جس سے لبنان میں کسی بھی وقت خانہ جنگی ل سکتی ہے۔

پاکستان کے بیشتر ذرائع ابلاغ جو مغربی میڈیا کی خوشہ چینی کرتے ہیں۔ اس خبر کو لے ے کہ ہو نہ ہو یہ کام شام کی فوجی ایجنسیوں کا ہے جبکہ امریکہ کی رکھیل سلامتی کونسل جو نستان، عراق، غزہ کشمیر میں مسلمانوں کے قتل عام پر چپ سادھے رہتی ہے، فوراً حرکت میں آ اور کسی بے ایمان اور راشی تھانیدار کی طرح حکومت شام کے خلاف ایف آئی آر کاٹ کر تفتیش ع کر دی اور اپنے گماشتے دمشق بھیج دیئے جبکہ شام کا نوجوان صدر یہ سن کر سکتے میں آ گیا کہ کے قریب ترین اعلیٰ حکام اس گھناؤنی سازش میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ باور رہے کہ حزب اللہ ایک رہنما کو اس وقت گاڑی میں دھماکہ کر کے قتل کر دیا گیا جب وہ شام کے دورے پر گئے ئے تھے۔ یہ کام بھی اسی قاتل ٹولے کا معلوم ہوتا ہے۔

سمپور ہرش نے اپنی تصنیف Price of Power میں 1973ء میں چلی کی منتخب ت کا تختہ الٹنے اور اس کے وزیر اعظم Allende کے قتل کی تفصیل لکھی ہے جسے آج تک کسی چیلنج نہیں کیا۔ بیچارے ایلندے کا یہ قصور تھا کہ اس نے ٹرانسپورٹ اور اندرون ملک معدنیات ریکی کمپنیوں کی اجارہ داری توڑنے کے لئے انہیں قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ بین الاقوامی ن کی رو سے یہ اقدام حکومت چلی کے دائرہ اختیار میں کیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس سے استحصالی مر پر ضرب پڑتی تھی۔ اس لئے صدر نکسن نے سی آئی اے کو حکم دیا کہ وہ چلی کی حکومت کا تختہ دے ہر چند کہ اس ملک میں مامور امریکی سفیر نے اسے اس مجرمانہ فعل سے باز رکھنے کی بہت ش کی لیکن صدر نکسن پر تو خون سوار تھا، چنانچہ قاتلوں کے ٹولے سی آئی اے نے چلی فوج کے براہ جنرل پنوشے کو رشوت دے کر اسے اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب پر آمادہ کر لیا۔ چلی کی ب حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور وزیر اعظم Allende کو قتل کر دیا گیا، ساتھ ہی ان کے تمام ب وطن ساتھیوں کو چن چن کر مار ڈالا گیا۔ ان کرائے کے قاتلوں نے تو لاطینی امریکہ کے قومی ر پبلا نیروا کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا۔ پھر چلی پر امریکی سرپرستی میں جنرل پنوشے دو

عشرے تک حکومت کرتا رہا اور اس سیارہ دور میں ہزاروں شہری اغواء اور قتل کر دیئے گئے۔

یہ قتل کی کھلی واردات تھی جس کا مجرم امریکی صدر رچرڈ نکسن تھا۔ یہ بات امریکہ میں سب جانتے تھے لیکن کسی نے اس کا مواخذہ نہیں کیا، ہاں جب ڈیموکریٹ پارٹی کے دفتر میں جاسوسی آلات کی تنصیب کا سراغ لگا تو امریکی ذرائع ابلاغ نے آسمان سر پر اٹھالیا، جیسے اس سے بڑا مجرم تو امریکہ کی تاریخ میں پیدا ہی نہیں ہو۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ نکسن نے ٹیکس بچانے کے لئے اپنی وکالت کی کمائی امریکہ کی Internal Revenue Service (IRS) سے چھپائی تھی۔ واہ رے امریکی انصاف قتل جیسے سنگین جرم پر چشم پوشی اور ٹیکس چوری پر معزولی!!

امریکی صدر کو ملک کا قانون یہ اختیار دیتا ہے کہ اگر وہ اپنی صوابدید کے مطابق یہ سمجھتا ہے کہ کسی غیر ملک کا حکمران امریکی وفاق کو نقصان عظیم پہنچا سکتا ہے تو وہ بے شک اپنی ایجنسی کو اس کے قتل کا حکم دے سکتا ہے۔ یہ قانون کالعدم نہیں ہوا بلکہ اب تو بہت فعال ہو گیا ہے۔ آخر آئے دن بلا الزام ثابت ہوئے، امریکی انتظامیہ مشتبہ غیر ملکیوں کے سر کی قیمت مقررہ کر دیتی ہے اور اس کے ایجنٹ تمام دنیا میں شکاری کتوں کی طرح ان کی بو سونگھتے پھرتے ہیں اور مقامی حکام کرائے کے قاتلوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اگر امریکہ اس روایت کو جائز تصور کرتا ہے کیوبا کے فیڈل کاسترو، جن پر امریکی صدر نے متعدد قاتلانہ حملے کرائے ہیں، وینزویلا کے ہیوگو شاویز، جنہیں جارج بش قتل کرانا چاہتا تھا اور بولیویا کے صدر EVO Morales جنہیں امریکی انتظامیہ نے قتل کرانے کی کوشش کی بھی امریکی صدور کے خلاف جوابی اور خود حفاظتی کارروائی کا پورا پورا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

اب یہ صدر زرداری کو سوچنا ہوگا جو بیرونی دوروں میں بیت اللہ محسور کو اپنی اہلیہ بے نظیر بھٹو کا قاتل گردانتے رہتے ہیں کہ انہیں ڈک چینی کے خلاف پاکستان میں ایف آئی آر کٹوانا چاہئے اور صدر اوباما سے اس کی تحویل کا مطالبہ کرنا چاہئے اگر حکومت پاکستان محض شبہ پر امریکہ کو مطلوب ڈاکٹر عافیہ صدیقی سمیت چھ سے زائد پاکستانی اس کے حوالے کر سکتی ہے تو کیا وہ ''خدمت'' کے عوض بی بی کے قاتل ڈک چینی کی تحویل کا مطالبہ نہیں کر سکتی؟

یوں تو یہ صدر محترم کی ادا ہے کہ ایک ہی سانس میں وہ متضاد باتیں کہہ ڈالتے ہیں لیکن ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات کہ اسامہ بن لادن ہلاک ہو چکے ہیں۔ ڈک چینی کو یقیناً ناگوار گزری ہوگی۔ لہٰذا وسیع تر قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ ان کے گرد حفاظتی انتظامات میں کوئی کوتاہی نہیں

چاہئے۔ سمپور ہرش نے الزام عائد کیا ہے کہ یہ ڈک چینی ہی تو تھا جس نے افغانستان اور عراق کے جنگی قیدیوں پر جسمانی اور جنسی تشدد کے احکامات دیئے اور اقبال جرم کرنے کے لئے انہیں شدید گرمی میں لوہے کی صندوقوں میں بند کرنے اور ان کے مذہب کی بے حرمتی کے احکامات دیئے۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اوباما نے جنرل میکرنن کی جگہ جس نئے جنرل میک کرسٹل کی تقرری کی ہے وہ افغانستان اور عراق کے عقوبت خانوں کے دورے پر امریکہ سے آتا رہتا ہے۔

پراجیکٹ 2025ء

پاکستان کی تباہی کا امریکی منصوبہ

امریکی تھنک ٹینک نے افغانستان سے روس کی پسپائی کے فوراً بعد اپنی حکومت کو یہ باور کروادیا تھا کہ اب ان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ''اسلام'' ہے اور امریکی جب اسلام کے حوالے سے سوچتے ہیں تو ان کے دل و دماغ میں دور دور تک اسلامی دنیا کے وہ 56 ممالک نہیں ہوتے جن کے سربراہ مسلمان ہیں بلکہ وہ صرف اور صرف افغانستان اور پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ یہ دونوں ممالک آج امریکیوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کیونکہ امریکی اشرافیہ کی یہ لگی بندھی رائے ہے کہ گزشتہ دہائی میں افغانستان اور وسطی ایشیا میں کامیاب رہنے والا پاکستان 2025ء تک اس پوزیشن میں آسکتا ہے کہ ایک طرف ماسکو اور دوسری جانب تل ابیب کی گردن میں ہاتھ ڈال دے۔ یہ سراسر مغربی مفادات کے خلاف ہوگا۔

ان خدشات کا اظہار سابقہ امریکی وزیر دفاع ولیم کوہن کی سربراہی میں قائم ہونے والی پندرہ رکنی ٹیم نے ایک رپورٹ میں کیا تھا جو وائٹ ہاؤس روانہ کی جاچکی ہے۔ اس خطرناک رپورٹ میں دو اسلامی ملک پاکستان اور انڈونیشیا کو 2025ء تک دنیا کے نقشے سے غائب کرنے کا منصوبہ درج کیا گیا ہے تاکہ ایشیا میں بھارت کے ذریعے امریکی بالادستی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ اس منصوبے میں فائدہ اور نقصان دونوں احتمالات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ولیم کوہن کی سربراہی میں قائم اس کمیٹی کے باقی ارکان سابق امریکی سیاستدان، سینیٹرز اور ایشیائی امور کے ماہرین پر مشتمل ہیں۔ امریکی انتخابات کے بعد امریکی انتظامیہ تبدیل ہوتی رہتی ہے مگر چونکہ

یورپ کے ساتھ ساتھ امریکہ میں شخصیات کی بجائے ادارے مضبوط ہوتے ہیں۔ اس لئے انتظامی تبدیلی سے پالیسیاں تبدیل نہیں ہوتی۔ اس لئے امریکی کمیٹی کی ان سفارشات سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں، مگر دوسری جانب امریکیوں کی قوت متخیلہ پر تعجب بھی ہوتا ہے

اس رپورٹ میں پاکستانیوں کے لئے جہاں تشویش کے بے شمار اسباب موجود ہیں تو دوسری جانب امریکیوں کی خیالی پلاؤ پکانے کی رفتار کا بھی علم ہوتا ہے۔ امریکی کمیٹی کی رپورٹ کی تفصیل میں جانے سے پہلے فرانس کے سابق صدر فرانسوا متراں کے الجزائر نژاد یہودی مشیر کی کتاب کا حوالہ دینا بھی ضروری ہے۔ Dictionary of 21st Century میں مصنف نے عرب اور دوسرے اسلامی ممالک کے خلاف خاصا زہر اگلنے کے بعد انہیں مغرب کے امن و امان کے لئے خطرناک قرار دیا ہے۔ اس خطرے سے نمٹنے کے لئے مصنف نے عالمی سطح پر جغرافیائی تبدیلیوں پر زور دیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کھچڑی صرف امریکہ ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں بھی پک رہی ہے۔

ایسے ہی معاملات امریکی کمیٹی کی سفارشات اور تجاویز کی شکل میں مرتب کئے گئے ہیں مگر ان کا دائرہ زیادہ تر پاکستان اور انڈونیشیا کے گرد گھومتا ہے۔ امریکی خدشات کے تحت چونکہ پاکستان اپنے فکری ڈھانچے اور عوام کی اسلام پسندی کی وجہ سے اسلامی دنیا میں بھرپور کردار ادا کرنے کی استطاعت میں اضافہ کر رہا ہے جو حکومتی سطح پر کم مگر عوامی سطح پر بہت زیادہ ہے۔ انہی خدشات کے پیش نظر Asia 2025 & Its Influence on American Security نامی رپورٹ میں پاکستان کو خاص طور پر دنیا کے نقشے سے غائب کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ ایسی رپورٹیں پہلے بھی مختلف شکلوں میں منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن اسلامی تحریکوں کو مستقبل میں خطرات سے تشبیہہ دیتے رہے ہیں۔ اس کے بعد ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' نامی کتاب میں اسلامی اور مغربی فکر کو آپس میں دست و گریبان دکھایا گیا تھا۔ اب متذکرہ رپورٹ میں واضح طور پر پاکستان کو ہدف کے طور پر پیش کر دیا گیا ہے جس میں اہل پاکستان کے لئے انتہائی تشویش ناک مواد شامل ہے۔

رپورٹ کے مطابق ''پاکستان اور بھارت کے درمیان کسی ایسے معاہدے کی توقع نہیں کی جاسکتی جس سے دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کو ٹالا جاسکے یا کم از کم تخفیف اسلحہ کا کوئی معاہدہ کرایا جاسکے، اس سلسلے میں دونوں ملک امریکہ، چین اور روس کے رویوں کو سامنے رکھ کر پالیسیاں

ترتیب دیتے ہیں۔تباہ کن اسلحہ کی پیداوار پاکستان بھارت کی وجہ سے بند نہیں کرسکتا، بھارت چین کی وجہ سے، چین روس کی وجہ سے اور روس امریکہ کی وجہ سے اس میدان میں پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔اسی رجحان نے جنوبی ایشیاء کو انتہائی خطرناک علاقہ بنادیا ہے۔انہی وجوہات کی بناء پر 1999ء میں کارگل کے محاذ پر پاکستان اور بھارت الجھ گئے تھے۔اس دوران کشمیر کے نام پر تمام علاقہ بڑی جنگ کی لپیٹ میں آسکتا تھا۔

سابق امریکی وزیر دفاع ولیم کوہن اس رپورٹ میں براہ راست اپنی رائے دیتے ہوئے اظہار خیال کرتے ہیں کہ ''مستقبل میں پاک بھارت جنگ کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اس میں افغانستان کی وجہ سے چین بھی شامل ہوسکتا ہے۔طالبان کا طرز حکومت، اسلحہ اور منشیات کی سمگلنگ، دہشت گردی کے امریکی دعوؤں کو زائل کرنے کے لئے نئی اصطلاحات وضع کرنا ایک طاقتور مزاحمت کی نشاندہی کرتا ہے۔''یعنی پاکستان کو اس جنگ میں افغانستان کی بھرپور حمایت حاصل ہوگی، افغانوں کی بڑی تعداد ذہنی طور پر اپنے آپ کو پاکستان سے الگ نہیں سمجھتی۔ اس لئے اسے وسطی ایشیا کی نسلی عصبیت کا شکار کرایا جائے گا۔رپورٹ کے مطابق ''بھارت کے ساتھ پاکستان کی کسی بھی آئندہ جنگ میں افغانی اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے اس کے تدارک کے لئے تاجکستان اور ازبکستان کا نسلی ہتھیار کام میں لایا جائے گا۔یہ دونوں عناصر افغانستان کے طول وعرض میں بھی پھیلے ہوئے ہیں ان کی بڑی تعداد افغانستان کے شمالی علاقوں اور کوہ ہندوکش میں آباد ہے''۔

رپورٹ کے اس حصے کا صاف اشارہ شمالی اتحاد کی جانب ہے۔یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں کہ شمالی اتحاد کو نہ صرف امریکہ اور روس کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے بلکہ بھارت کی زبردست عسکری امداد بھی اسے مل رہی ہے۔

پاکستان کے بارے میں اپنے خبث باطن کا اظہار کرتے ہوئے اس رپورٹ میں انتہائی شرانگیز اور شیطانیت سے بھرپور منصوبہ پیش کیا گیا کہ کس طرح خدانخواستہ پاکستان کے علاقوں کو ہمسایہ ممالک میں تقسیم کیا جائے گا اور اس مملکت خداداد کو توڑنے کے لئے اس کے داخلی حالات سے کیسے استفادہ کیا جائے گا۔''انسانی حقوق'' کی تلوار کہاں استعمال ہوگی اور نسل پرست لیڈروں کو کیسے استعمال کیا جائے گا مگر تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اس رپورٹ میں پاکستان کے ''خاتمے'' کی صورت میں اس کے ''ایٹمی ورثے'' کے بارے میں تشویش کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔

رٹ کے مطابق ''پاکستان کے ایٹمی ترکے پر ایران ہاتھ صاف کرسکتا ہے۔جس طرح سوویت ن کی تحلیل کے بعد بہت سے ناپسندیدہ عناصر نے اس کے ایٹمی ہتھیاروں پر ہاتھ صاف کرنے کوشش کی ہے۔پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر بنیاد پرست عناصر بھی قبضہ جماسکتے ہیں جس کی وجہ ے تمام دنیا ایک نئی مشکل کا سامنا کرسکتی ہے۔اس کا سب سے زیادہ نقصان امریکی مفادات کو ہو ا ہے اس خطرناک صورت حال کا تدارک کرنے کے لئے امریکہ بھارت کو آگے لائے گا''۔

رپورٹ کے مطابق امریکہ اور بھارت کے درمیان ایک مضبوط عسکری معاہدہ عمل الائے جانے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا، یہ معاہدہ دو نکات پر مبنی ہوسکتا ہے۔اوّل پاکستان ایٹمی تنصیبات تک ''انتہا پسندوں'' کی رسائی کو روکنا اور دوسرے ان کی تنصیبات کی مکمل ی..... بھارت اس منصوبے کے مطابق جس وقت پاکستان پر فیصلہ کن حملہ کرے گا تو ہوسکتا ہے اس کی ایٹمی تنصیبات کو عسکری لحاظ سے ختم کرنا ممکن نہ ہو، اس نازک مرحلے میں امریکی فضائیہ ستان کی ایٹمی تنصیبات پر فیصلہ کن ضرب لگائے گی۔(خدانخواستہ) یہ ضرب پاکستان کے وجود کو تشر کرنے میں کلیدی کردار ادا کرے گی جس سے چین کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بڑی غرافیائی طاقت دنیا کے نقشے پر ابھرے گی، اندرونی طور پر اقتصادی اور سیاسی حالات پہلے ہی اس صورت حال کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔سندھ، بلوچستان، اور صوبہ سرحد کے قوم ست لیڈر اس نئی صورت حال کو قبول کرلیں گے، کیونکہ پٹھان، بلوچ، سندھی اور مہاجرین کے میان پہلے ہی چپقلش کی صورت موجود ہے۔اس کے علاوہ سنی شیعہ تنازعات نے بھی پاکستان سنگین صورت اختیار کررکھی ہے جس کے ذریعے اس ملک کو حتمی طور پر بکھیرنے کے لئے فائدہ ایا جاسکتا ہے۔اس مقام پر امریکی منصوبہ پورا ہونے پر بھارت کی کوشش ہوگی کہ پاکستانی کشمیر سب سے پہلے اپنے اندر ضم کرے''۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ(خدانخواستہ) ''پاکستان کی تحلیل کی صورت میں مقامی طح پر سب سے زیادہ مقابلے کا رجحان بھارت اور ایران کے درمیان ہوگا۔دونوں ملکوں کی کوشش گی کہ پاکستان کے ترکے پر جغرافیائی اور مادی وسائل میں زیادہ سے زیادہ حصہ وصول کیا ائے۔یہ رسہ کشی زیادہ تر پنجاب، بلوچستان اور سندھ کے علاقوں میں ہوگی جبکہ صوبہ سرحد کا علاقہ فغانستان کی تقسیم کے تناظر میں قبائلی بنیاد کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔سندھ اور پنجاب کو بھارت ا ضم کردیا جائے گا جبکہ بلوچستان اور دوسرے مغربی علاقے ایران کے حصے میں آسکتے ہیں۔اس

قسم کی تقسیم سے علاقے میں ایک ایٹمی توازن بھی قائم کیا جا سکتا ہے کیونکہ پاکستان کی ''ایٹم
میراث'' میں سے حصہ پانے کے بعد ایران بھی ایٹمی کلب میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس سے وہ ا
''نئے پڑوسی'' بھارت کے سامنے ایسے حریف کے طور پر سامنے آئے گا جو ان علاقوں میں بھار
کا مقابلہ کر سکتا ہے جسے کبھی ''پاکستان'' کہا جاتا تھا''۔

امریکہ کے ایشیاء 2025ء نامی اس شیطانی منصوبے میں آئندہ پچیس سالوں
بھارت کے کردار کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ''آئندہ پچیس سالوں میں
بھارت کا کردار علاقے میں قائدانہ ہوگا کیونکہ اس دوران وہ دنیا کی ایک بڑی عسکری اور اقتصادی
قوت بن چکا ہوگا۔ اسٹریٹیجک اور آئیڈیالوجیکل میدان میں اسے امریکہ کا خاص قرب حاصل ہو
گا۔ اقتصادی میدان میں امریکہ اور بھارت کی شراکت داری چین کو اقتصادی میدان میں گھٹنے
ٹیکنے پر مجبور کرے گی۔ انسانی آبادی سے معمور بھارت امریکہ کی مدد سے اقتصادی میدان میں
حیران کن ترقی کر جائے گا''۔

رپورٹ میں بھارت کے علاوہ چند دوسرے ممالک کو بھی خاص اہمیت کا حامل دکھایا
ہے۔ ''اگلے پچیس سالوں کے دوران بھارت کے ساتھ ساتھ مصر، ترکی اور ایران اپنی اقتصا
کمپنیوں اور سرمایہ کاری کے ذریعے نئے اقتصادی نظام سے استفادہ کریں گے۔ اس کی سب
بڑی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں نئی ٹیکنالوجی سے استفادے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کے سا
چلنے کی بھرپور صلاحیت پائی جاتی ہے۔ شرق الاوسط میں بھی آئندہ پچیس سالوں کے دو
استقراری صورت حال میں بہتری آئے گی۔ اسرائیل، ترکی اور بھارت علاقے کی صورت
پر اثر انداز ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ اس علاقے میں آئندہ انہی ملکوں کے ذر
معاملات چلائے جائیں گے''۔

آئندہ پچیس سالوں میں بھارت اور چین کی قوت کا موازنہ کرتے ہوئے ر
میں کہا گیا ہے کہ ''بھارت کی آبادی اس دوران چین کے برابر ہو جائے گی بلکہ اس سے تجا
کر سکتی ہے۔ اس وقت اپنی آبادی کی وجہ سے بھارت کو اقتصادی مشکلات کا سامنا ضرور
پچیس سال کے دوران وہ تیزی کے ساتھ اقتصادی کامیابیاں حاصل کر کے ان مشکلات
لے گا، اس دوران اس کی آبادی میں اساتذہ اور پڑھے لکھے افراد میں کئی گنا اضافہ ہو جائے
دنیا میں اس صدی کے اختتام پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کا انقلاب پوری قوت

ظاہر ہوا ہے۔ انسانی عقل طاقت کا اصل محور تسلیم کی گئی ہے جو ''ادراک'' کی منزل تک انسان کی
رہنمائی کرتی ہے۔ اس انقلاب کے ساتھ ساتھ دنیا کے بہت سے تقاضے اور مصلحتوں میں فرق پڑا
ہے۔ ان مصلحتوں میں قومی، شخصی اور مشترکہ مصلحتیں شامل ہیں۔ مغربی نقطہ نظر سے اس انقلاب کی
وجہ سے اقتصادی ترقی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے، خاص طور پر ترقی پذیر ممالک اس انقلاب سے
زیادہ استفادہ کر رہے ہیں۔ امریکی رپورٹ کے مطابق ایشیاء میں بھارت اس انقلاب سے
مستفید ہونے والے ممالک میں سرفہرست ہے۔ رپورٹ کے مطابق ایشیائی معاشروں میں تعلیم
یافتہ طبقہ مڈل کلاس پر حکمرانی کرتا ہے۔ ان معاشروں میں طبقات کی پرانی روش آہستہ آہستہ ختم ہو
رہی ہے جس کی وجہ سے ان کے درمیان اعلیٰ سطحی جمہوریت کے رجحانات میں اضافہ ہو رہا ہے
جس کی وجہ سے اب یہاں ڈکٹیٹرشپ کے امکانات میں بھی واضح کمی آئی ہے۔ اس سلسلے میں
رپورٹ کے مطابق ''اب پاکستان کی طرح انڈونیشیا بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ
ملک آمریت اور نسلی تعصبات سے بھرپور ہے۔ ایشیا کے یہ دو ٹائیگر اقتصادی بحرانوں میں دب
چکے ہیں اور دونوں نسلی اور فروعی معاملات میں ایک جیسے حالات کا سامنا کر رہے ہیں''۔

اس رپورٹ کے تناظر میں اگر امریکہ کے گھناؤنے عزائم کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا
کہ امریکہ (خاکم بدہن) پاکستان کو ختم کرانے کے بعد ایران کو بھارت کے ذریعے زیر کرنے کی
کوشش کرے گا۔ خلیج کی جنگ کے بعد امریکہ عراق کو تقسیم کرنے کی پوزیشن میں تھا مگر اسے ان
تمام معاملات کے ساتھ ساتھ علاقے میں ایران کے خلاف ایک طاقتور حریف کی ضرورت تھی جو
یقینی سی بات ہے کہ صدام کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس کی تقسیم کا عمل موخر کیا
گیا مگر جیسے ہی بھارت کے ذریعے ایران کو قابو کیا جائے گا عراق کو فوراً تین حصوں میں تقسیم کر دیا
جائے گا۔ جس کے بعد انسانی حقوق کا نعرہ لگا کر چین کے خلاف محاذ گرم کیا جائے گا۔ اس کے
سامنے بھارت اپنی تمام تر قوت اور امریکی تائید کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ امریکیوں کے خیال میں جنوبی
ایشیاء ایٹمی دھماکوں کے بعد دنیا کے حساس ترین علاقوں میں شمار ہونے لگا ہے۔

امریکہ کو اسرائیل اور بھارت کی مدد سے ایشیاء میں چین پاکستان اتحاد کا سامنا کرنا
ہے، دوسری جانب انڈونیشیا اس کے لئے اقتصادی سطح پر خطرناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس
لئے ان دو اسلامی ممالک کر تحلیل امریکیوں کے لئے ضروری ہے۔ مسلمان آبادی کے لحاظ سے دنیا
کا سب سے بڑا ملک انڈونیشیا طاقتور اقتصادی ڈھانچہ رکھتا ہے جو مغرب کے نزدیک ''جارح''

اسلامی ممالک کے لئے تقویت کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی صورت حال نے امریکہ انڈونیشیا تعلقات کو جنگ کے دھانے پر پہنچا دیا ہے۔ امریکی بحریہ انڈونیشیا کے ساحلوں کے قریب جنگی مشقیں کرتی رہتی ہے جس سے دونوں ملکوں کے درمیان براہ راست تصادم کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ دوسری جانب پاکستان مسلم ممالک میں واحد ایٹمی قوت کا حامل ملک ہے۔ چین اور بھارت کے بعد دنیا کی بڑی آبادی کا حامل پاکستان مغرب کے لئے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کا بلاواسطہ محور بن چکا ہے۔ جس سے امریکہ اپنے وجود کے لئے سب سے زیادہ خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدحواسی میں اس کی تخیلاتی گھڑ دوڑ عجیب راستے اختیار کرتی ہے جو نظام فطرت کے بالکل برعکس اور شیطانی ہیں۔

اس شیطانی رپورٹ میں پاکستان اور انڈونیشیا کی تحلیل کے جو منصوبے ترتیب دیئے گئے ہیں اس کے لئے کچھ وجوہات کا بھی ذکر کیا گیا ہے مگر باریک بینی سے حقائق کا موازنہ کیا جائے تو یہ وجوہات پاکستان سے زیادہ بھارت اور خود امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ پاکستان کے زوال میں اگر نسلی عصبیت کا ہاتھ ہو سکتا ہے تو بھارت میں تو پاکستان کی نسبت ستر گنا زیادہ نسلوں کے انسان بستے ہیں جن کی نہ بولیاں آپس میں ملتی ہیں اور نہ مذہب۔ ان کے رہن سہن اور ثقافتیں بھی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اس کے علاوہ جتنی علیحدگی کی تحریکیں بھارت میں چل رہی ہیں اتنی کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتیں۔ مقبوضہ کشمیر سے لے کر جنوبی بھارت تک مسلح تنظیمیں ہندو استعمار کے خلاف صف آراء ہیں۔ یہ وہ صورت حال ہے جس کا عشر عشیر نہ پاکستان میں ملتا ہے اور نہ انڈونیشیا میں۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان اور انڈونیشیا جو دینی لحاظ سے ایک ملک ہیں ان وجوہات کی بنا پر تحلیل ہو جائیں جن کا وجود سب سے زیادہ بھارت میں پایا جاتا ہے۔ مگر چونکہ امریکہ کو اس کا وجود منظور ہے اس لئے مغربی میڈیا ان حقائق سے منہ چھپاتا ہے۔ خیالی پلاؤ پکانے کے ماہر امریکی باورچی بھارت کی اس تشویشناک صورت حال پر کوئی کمیشن نہیں بٹھاتے، نہ مغربی دانشوروں کو بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ ہونے والے مظالم نظر آتے ہیں۔ چونکہ چین کے خلاف مغرب میں ایک منظم میڈیا وار لڑی جا رہی ہے اس لئے مغربی میڈیا کو انسانی حقوق کے حوالے سے کمیونسٹ چینی عوام کا درد زیادہ محسوس ہوتا ہے مگر بھارت میں اگر عیسائی پادریوں کو ان کے گرجا گھروں سمیت جلا دیا جائے تو عیسائی مغرب کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

دوسری جانب امریکہ جسے ملٹی نیشنل ملک کہا جاتا ہے خود تحلیل کی بنیادی وجوہات سے

معمور ہے۔ انگریزی کے بعد یہاں سب سے زیادہ ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے۔ یورپی ممالک کی تقریباً ہر نسل کا باشندہ آج امریکی کہلاتا ہے۔ عام گفتگو کے دوران بار بار اپنی نسل اور قومیت کا حوالہ دینا یہاں کا معمول بن چکا ہے۔ ایک امریکی کی بات پر عموماً دوسرا امریکی کہتا ہے کہ "میرا اسکاٹ دادا ایسے ہی کہتا تھا" یا "میرا ڈچ خاندان ایسا ہی کیا کرتا تھا" وغیرہ۔ اقتصادی صورت حال یہ ہے کہ تمام تر سہولیات ہونے کے باوجود لوگوں میں دوسرے کا مال لوٹنے کی طمع باقی رہتی ہے۔ کیپیٹل ہل سے دو فرلانگ کے فاصلے پر کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کس وقت اور کس کے ہاتھوں لٹ جائے گا۔ امریکہ میں علیحدگی پسند تنظیموں کی مجموعی تعداد 163 کے قریب بتائی جاتی ہے جبکہ ان میں مسلح ملیشیات کی تعداد 124 کے قریب ہے۔ امریکی ماہرین کو سب سے پہلے اپنے ہاں مستقبل کی ٹوٹ پھوٹ کی جانب توجہ مبذول کرنی چاہئے اور اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ جب امریکہ کے کسی حواری ملک کی جانب سے کہیں زیادتی کا ارتکاب کیا جاتا ہے تو اس کا خمیازہ دنیا بھر میں امریکی سفارت خانوں اور معصوم امریکی عوام کو کیوں بھگتنا پڑتا ہے۔ اسرائیل کی ہر دہشت گردی کے پیچھے امریکی تائید لازمی ہوتی ہے جس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ امریکہ نہ صرف خود ایک دہشت گرد ملک ہے بلکہ دنیا بھر میں دہشت گردوں کی سرپرستی بھی کرتا ہے اور جب اس کی دہشت گردیوں کا جواب دیا جاتا ہے تو کمال ہوشیاری کے ساتھ وہ ردعمل ظاہر کرنے والوں کو اپنے طاقتور میڈیا کے ذریعے دہشت گرد ثابت کرنے لگتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی سطح پر امریکہ دہشت گردی کی شیطانی فکر سے نمودار ہوا۔ اس ملک کی نہ کوئی فکری اساس ہے اور نہ نظریہ۔ اس کی تمام تر اساس یہودی سرمایہ دارانہ نظام پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی نظریاتی جنگ میں اسے دوسروں کے کندھوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کمیونزم اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود بھی ایک نظریے کا حامل نظام تصور کیا جاتا تھا، اسی لئے اس نظریے سے مقابلے کے لئے اس نے افغانستان میں افغانوں کے کندھوں کو استعمال کیا۔ امریکہ اگر براہ راست خود اس جنگ میں سوویت یونین کا سامنا کرتا تو نعرے کے لئے کون سا نظریہ اختیار کرتا۔ ظاہری بات ہے کہ وہ سرمایہ داری نظام کا نعرہ لگا کر اس جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس جنگ کے لئے سب سے مضبوط اساس مسلمانوں کے پاس تھی جو ہر دنیاوی نظریے کے سامنے اسلام کی شکل میں ایک طاقتور آفاقی نظریہ رکھتے ہیں۔ مگر سوویت یونین کی تحلیل کے بعد امریکی مقاصد پورے ہوئے تو اس نے اسی اساس اور نظریے کو بنیاد پرستی سے تعبیر کر کے اسے

دہشت گردی سے موسوم کر دیا۔

ان ہی شیطانی منصوبوں کی بنا پر تاریخ انسانی میں جتنے دشمن امریکہ نے پیدا کئے ہیں اتنے شاید چنگیز خان بھی پیدا نہ کر سکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی امریکی مفاد پر کوئی ضرب لگتی ہے تو غیر ارادی طور پر دنیا میں خصوصاً ایشیا اور افریقہ میں اسے تحسین کی نگاہ سے سنا اور دیکھا جاتا ہے۔ کسی امریکی کی ہلاکت پر دل میں ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ کیا دھرا امریکی انتظامیہ کا ہے جس کا خمیازہ عموماً امریکی عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ پاکستان کے بارے میں امریکی منصوبے کہاں تک پورے ہوتے ہیں اس کا جواب تو مستقبل میں ہی مل سکتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور قائم رہے گا۔ (انشاءاللہ)

سوویت یونین بھی بڑے منصوبوں کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوا تھا مگر اس کا نتیجہ کچھ اور نکل آیا۔ آج امریکہ بھی اپنا اچھا سمجھ کر دنیا کا جغرافیہ بدلنے کا سوچ رہا ہے مگر اس کا یہ جغرافیہ اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ دنیا ایک گدھ کی مانند امریکہ کی اونگھ کا انتظار کر رہی ہے۔

امریکی میڈیا اپنے تعصب کے ہاتھوں اتنا مجبور ہے کہ ایک طرف تو امریکی حکومت پاکستان کو اپنا حلیف قرار دیتی ہے اور اس ضمن میں خاصا زبانی جمع خرچ بھی کرتی رہتی ہے لیکن امریکن شیطانی دماغ پاکستانی کی تباہی کے گھناؤنے منصوبے بھی سوچتے رہتے ہیں جو بین الاقوامی پریس میں شائع بھی ہوتے رہتے ہیں۔

O

ستمبر 2000ء کے Atlantic Monthly میں زابرٹ کا پلان کا مفصل مضمون The Lawless Frontiers میں بلوچستان، طالبان، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، کراچی، جنرل مشرف اور اٹک فورٹ کے عنوانات کے تحت یوگوسلاویہ کی طرح پاکستان کے منتشر ہو جانے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ اس مضمون میں دس دینی قوتوں اور اسامہ بن لادن کا ہوا مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جنرل مشرف اپنے تمام لبرلزم کے باوجود ان قوتوں کے اسیر بنا کر پیش کئے گئے۔ علاقائی اور لسانی قوتوں کے پنجاب کے خلاف صف آراء ہونے کی تصویر کشی کی گئی اور دریائے سندھ کو علاقے کے جغرافیہ ہی نہیں سیاسی نقشہ کا خالق بنا کر پیش کیا گیا اور تصور ہی تصور میں بھارت کو اس کے کناروں تک حکمران دکھایا گیا اور ساتھ ہی یہ "خدشہ" ظاہر کر دیا گیا کہ "توقع نہ کیجئے کہ پاکستان تاریخ کے صفحات سے خاموشی سے مٹ جائے گا"۔

اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ رنگ بدل بدل کر اور نقشے کھینچ کھینچ کر جاری ہے۔ مقصود تمام تحریروں کا احاطہ نہیں۔ ان چند تحریروں سے ان منصوبوں اور سازشوں کو سمجھنا ہے جو ملت اسلامیہ پاکستان کو سیاسی نقشے سے مٹانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ دشمنوں اور بدخواہوں کی ساری سازشوں اور کوششوں کے علی الرغم انشاءاللہ پاکستان قائم رہے گا اور یہ قوم اپنی منزل منزل کی طرف ضرور گامزن ہو گی لیکن یہ مقصد محض خواہشات سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے پہلی ضرورت خطرات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب حکمت عملی اور موثر اقدام کی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ایک طرف ہم اپنی منزل اور راہداف کا صحیح تعین کریں تو دوسری طرف اپنے اصل دوست اور دشمن میں تمیز کریں تاکہ کھلے دشمنوں سے بھی معاملہ کر سکیں اور دام ہم رنگ زمین سے بھی بچ سکیں۔

آستین کے سانپ

سب سے پہلی بات یہ سمجھنے کی ہے کہ دشمن جو سازشیں کر رہا ہے اور جال بن رہا ہے
اس کی بڑی وجہ ہماری اپنی کمزوری اور ملکی قیادتوں کی بے وفائی اور مفاد پرستی ہے۔ گزشتہ دس سا
پاکستان کی تاریخ کے بیشتر عرصے میں برسر اقتدار بڑی پارٹیوں کی قیادتوں نے ملک کو لوٹا
معاشی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی، تعلیمی غرض ہر اعتبار سے ملک کو کھوکھلا کیا اور کرپشن اور بدانتظامی
انتہا کر دی لیکن نیوکلیئر استعداد کی ترقی اور کشمیر کی تحریک جہاد کی تائید تاریک افق پر روشنی کی کر
ہیں۔ بلاشبہ پاکستان کی معیشت اپنی غلطیوں کی وجہ سے اس وقت بحران کا شکار ہے لیکن معا
استعداد اور مسائل کے اعتبار سے پاکستان ایک مضبوط اور نمو پذیر معیشت کا حامل ہے۔ نہ وسا
کی کمی ہمارا مسئلہ ہے اور نہ امکانات سے محرومی..... اصل مسئلہ غلط قیادت اور غلط تر پالیسیاں
جن کی وجہ اقتدار پر ایک ایسے گروہ کا قبضہ ہے جسے خدا کا خوف ہے نہ خلق کی شرم..... جس
سیاسی اور معاشی وسائل کو اپنی ذات اور اپنے گروہ کے فائدے کے لئے استعمال کیا ہے اور ملک
کے اداروں کو تباہ کر کے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کرنے کی مکروہ کوشش کی ہے۔ عوامی
احتساب اور عوام میں سے ایک ایمان دار اور باصلاحیت قیادت وقت کی سب سے بڑی ضرورت
ہے اور یہ نئی قیادت ملک کی پاکستان دوست قوتیں ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ
جماعتی اور گروہی سطح سے بلند ہو کر پوری قوم کو اعتماد میں لیں اور اس کے سارے اچھے عناصر کو ساتھ
لے کر چلیں، قوم کے سامنے اس کا حقیقی مشن رکھیں اور اس مشن کو حاصل کرنے کے لئے قیادت بھی
فراہم کریں۔ بیرونی قوتیں ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں، بشرطیکہ ہم جاگ رہے ہوں اور اپنی
قوتوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر دیں۔

جن حالات اور خطرات میں پاکستان اس وقت کھڑا ہوا ہے، اس میں قومی ایجنڈے

پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ اس ایجنڈے کے اہم نکات یہ ہیں۔

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔ اسلام اس کی بنیاد، اس قوم کی منزل اور اس کی قوت کا
ہے۔ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ایک مکمل نظام ہمیں دیتا ہے اور پوری انسانی زندگی کو
اپرستی، حسن اخلاق، خدمت خلق اور عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے تاکہ مسلمان
نے لئے اور پوری انسانیت کے لئے باعث رحمت بنیں۔ یہی ہماری منزل ہے اور اس سے سرمو
اف پاکستان کی کمزوری کا باعث ہوگا اور اللہ سے بے وفائی کا۔ یہ پہلی بنیاد ہے جس پر کوئی
جھوتہ یا کمزوری نہیں۔ پاکستان کسی فرد، گروہ یا طبقہ کی جاگیر نہیں، یہ ملک مسلمانان برعظیم کی عوامی
جمہوری تحریک کے نتیجے میں قائم ہوا ہے اور وہی اس ملک کے اصل امین اور محافظ ہیں۔ عوام کی
ادی، حقوق کی حفاظت، سیاسی نظام کو بنانے اور چلانے کے اختیار کی ضمانت ہی میں ہماری
تی کا راز ہے۔ 1973ء کا دستور انہی بنیادوں پر خلوص اور دیانت سے عمل ہی کے ذریعے ملک
صحت مند جمہوری نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے احتساب اور انتخاب دونوں ضروری ہیں
دونوں کو اپنے اپنے اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے لیکن کسی نوعیت کی آمریت..... خواہ سول
یا فوجی، حالات کو خراب کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہے، اصلاح کا نہیں۔

پاکستان کی آزادی اور سلامتی کا تحفظ، خود انحصاری کے راستے پر عمل کرنے میں ہے۔
یا کے تمام ممالک اور خصوصیت سے مسلمان ممالک کے ساتھ دوستی اور تعاون ہمارا قومی موقف
ہے لیکن ہماری خارجہ پالیسی اور معاشی پالیسیاں امریکہ کی اسیر بن کر رہ گئی ہیں۔ اس سے ہم نے
دکے ہی کھائے ہیں اور چرکے ہی سہے ہیں۔ اس جال سے جتنی جلدی نکلا جائے اتنا بہتر ہے۔
ارے لئے ایک مکمل طور پر آزادانہ خارجہ پالیسی اور ایک ایسی معاشی پالیسی ضروری ہے جو
کستان کے مفادات کی حفاظت کر سکے اور علاقے میں ہمارے مثبت کردار کی ضامن ہو۔

ملکی سلامتی اور عوامی ضروریات کی فراہمی کے لئے معاشی پالیسی کی تشکیل نو ناگزیر
ہے۔ معیشت کو عالمی مالی اداروں اور عالم گیریت کے سامراجی جال سے نکالنے اور ریاست اور
زار منڈی دونوں کے درمیان تعاون اور اشتراک کے لئے ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو قومی
فادات کا محافظ اور ملکی ترقی، معاشی عدل اور خوش حالی کا ضامن ہو۔ زراعت کی ترقی، بچت اور
رمایہ کاری، آجر اور اجیر کا تعاون، غربت کا انسداد اور عوامی ضرورت کی اشیاء اور خدمات کی ترجیحی
راہمی، نئی معاشی پالیسی کے اہداف ہونے چاہئیں۔ معاشی ترقی کا محور پاکستان اور اس کے لوگوں

کی ضروریات کو ہونا چاہئے، ورلڈ بنک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی مصلحتوں کو نہیں۔

15 راگست 1947ء کو تقسیم ہند کے فوری بعد بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہر
نے افغانستان کے راستے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں مداخلت شروع کر دی تھی۔ کابل مر
بھارتی سفارت خانے کی طرف سے کچھ قبائلی عمائدین کے ذریعے انگریزوں کے خلاف تحریک
آزادی کے ہیرو فقیر ایپی کے ساتھ رابطہ قائم کیا گیا اور انہیں کہا گیا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے
چہرے پر ڈاڑھی ہے اور نہ اسلام کے بارے میں کچھ جانتے ہیں لہٰذا آپ وزیرستان کو افغانستا
میں ضم کر دیں یا علیحدہ ریاست کے قیام کا اعلان کر دیں۔ دوسری طرف 17 راپریل 1948ء
پشاور میں قبائلی علاقوں کے عمائدین کا ایک جرگہ منعقد ہوا جس میں قائداعظمؒ کے سامنے اس عزم
اظہار کیا گیا کہ قبائل کشمیر کی آزادی کے لئے جہاد کریں گے۔ اس جرگے میں قائداعظمؒ
درخواست کی گئی کہ قبائلی علاقوں کو براہ راست مرکزی حکومت کے تابع رکھا جائے۔ قائداعظمؒ
یہ درخواست تسلیم کر لی۔ اس دوران انہوں نے فقیر ایپی کے نام سے یہ پمفلٹ تقسیم کیا کہ جہاد
حرام ہے بلکہ قائداعظمؒ کے خلاف جہاد کیا جائے جنہوں نے شریعت نافذ نہیں کی۔ 29 رجو
1948ء کو پاکستانی اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ ایک 35 سالہ قبائلی اوّل حسین کو گرفتار کر لیا
ہے جو فقیر ایپی کے نام پنڈت نہرو کا ایک خط دہلی سے لا رہا تھا۔ 11 رستمبر 1948ء کو قائداعظ
وفات پا گئے۔ نہرو کا خیال تھا کہ پاکستان چھ ماہ میں ٹوٹ جائے گا لہٰذا انہوں نے قبائلی علاقہ
میں شورش کو مزید ہوا دی۔ تاریخی دستاویزات بتاتی ہیں کہ 19 رجنوری 1950ء کو میر علی اور
کے علاقوں میں آزاد پشتونستان کا پرچم لہرا کر فقیر ایپی کو امیر سلطنت قرار دیا گیا اور اعلان کیا گیا
نئی ریاست کا قانون اسلامی شریعت ہوگی۔ 26 رجون 1950ء کو فقیر ایپی کے دو ساتھیوں
جان اور سعید نے کابل میں افغان حکام سے ملاقاتیں کیں اور آزاد پشتونستان کی فوج بنانے
لئے وسائل مانگے۔ یہ وسائل بھارت نے فراہم کئے جس کی تفصیل ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کت
''بطل حریت..... فقیر آف ایپی'' میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ کچھ ہی عرصے میں میر علی
وانا تک بغاوت کو کچلنے کے لئے فضائی بمباری شروع کر دی گئی۔ بمباری سے مسئلہ حل نہ ہوا تو
اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے 22 رمارچ کو احمد زئی
اتمان زئی وزیر، داوڑ اور محسود قبائل کے عمائدین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایک ا
ریاست کے خلاف جہاد جائز نہیں اگر جہاد کرنا ہے تو فلسطین اور کشمیر میں جاؤ۔ سید امین الحسی

ہ وزیرستان سے فقیر ایپی کی تحریک کمزور پڑ گئی اور انہوں نے حکومت سے نفاذ شریعت کے لئے
اکرات شروع کر دیئے۔ فقیر ایپی نے سیز فائر کر دیا تو بھارت نے ان کی مدد بند کر دی۔

16 راپریل 1960ء کو فقیر ایپی ابدی نیند سو گئے۔ کئی سال کے بعد بھارت ایک دفعہ
پاکستان کے قبائلی علاقوں میں عسکریت کو ہوا دے رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر کابل میں بھارتی
فارت خانہ ہر عسکریت پسند کو رقم اور اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دو طرح
ے عسکریت پسند ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو افغانستان میں غیر ملکی افواج کے خلاف مزاحمت کو جہاد
بھتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو افغانستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں کارروائیاں کر رہے
ں۔ ان عسکریت پسندوں کے لیڈر مولانا فضل اللہ ہیں جنہوں نے نہ کبھی افغانستان میں جہاد کیا
رنہ کشمیر میں جہاد کیا۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ شمالی وزیرستان، جنوبی وزیرستان اور دیگر
ائلی علاقوں میں پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ امریکہ کے خلاف زیادہ نفرت ہے۔ جنرل پرویز
رف کے منظر سے ہٹنے کے بعد ان علاقوں میں پاکستانی فوج کے خلاف مزاحمت کمزور پڑ گئی
یونکہ پاکستانی فوج نے ان علاقوں کے قبائلی عمائدین اور علماء کے ذریعے کئی مزاحمتی گروپوں کے
اتھ سیز فائر کر لیا لیکن وادی سوات میں ایسا نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ وادی سوات میں قبائلی نظام
زور ہے۔

یہ علاقہ صوبہ سرحد کے شہری علاقوں سے متصل ہے اور مقامی لوگ باہر سے آنے
لوں پر زیادہ نظر نہیں رکھتے کیونکہ یہاں سیاحوں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ مقامی لوگوں کے
ان اس وقت کھڑے ہوئے جب باجوڑ کے راستے سے ازبک اور تاجک اسلحہ بردار بونیر میں
خل ہونے لگے۔ یہ اسلحہ بردار بظاہر تو شریعت کی بات کرتے تھے لیکن نہ نماز باقاعدگی سے ادا
رتے اور نہ ہی روزہ رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر کو پشتو زبان بھی نہ آتی تھی بلکہ وہ فارسی بولتے
ے۔ وادی سوات میں ایسے کئی واقعات ہوئے جن میں غیر مقامی اسلحہ برداروں نے زبردستی مقامی
کیوں کے ساتھ شادی کی کوشش کی۔ مولانا فضل اللہ غنڈوں کے سامنے بے بس تھے یا پھر ان کی ملی
کت سے یہ سب ہو رہا تھا۔ یہ شواہد بھی سامنے آنے لگے کہ یہ غیر مقامی اسلحہ بردار باجوڑ کے ہمسائے
ں واقع افغان صوبے کنڑ سے رقم اور افرادی قوت حاصل کرتے ہیں اور مولانا فضل اللہ نے انہی
ناصر کے دباؤ پر مولانا صوفی محمد اور سرحد حکومت کے درمیان امن معاہدے کو ناکام بنایا۔

O

دوسری طرف افغان طالبان کے رہنما ملا محمد عمر نے خوست کے راستے شمالی وزیرستان
کے عسکریت پسندوں کو حال ہی میں پیغام بھیجا کہ پاکستانی فوج کے خلاف لڑنا جہاد نہیں ہے اگر
انہیں لڑنا ہے تو افغانستان آ کر امریکی فوج سے لڑیں۔ القاعدہ کی حکمت عملی بھی یہی ہے کہ
پاکستان میں لڑنے کی بجائے افغانستان پر توجہ دی جائے لیکن پاکستانی حکومت کی مشکل یہ ہے کہ
ڈھائی ہزار کلومیٹر لمبی پاک افغان سرحد پر کوئی باڑ یا دیوار نہیں لہٰذا وہ قبائلی علاقوں کے عسکریت
پسندوں کو افغانستان جانے سے نہیں روک سکتی اور اس مشکل کا فائدہ اٹھا کر امریکہ پاکستان پر
ڈرون حملے کرتا ہے۔ اس مسئلے کا آسان ترین حل یہ ہے کہ امریکہ افغانستان سے نکل جائے، اگر
امریکہ کو وہاں سے نہیں نکلنا تو پھر پاکستان کو چاہئے کہ پاک افغان سرحد کو بند کر دے۔ یہ سرحد
ہوگی تو نہ پاکستانی عسکریت پسند افغانستان جائیں گے نہ افغانستان کے راستے ازبک اور تاجک
سوات آئیں گے۔ افغانستان کے راستے سے پاکستان میں آ کر نفاذ شریعت کے نام پر قتل عام
کرنے والوں کو بھارتی اسلحہ اور روپیہ دیا جا رہا ہے اور اس کھیل میں ملک کے کچھ بڑے سیٹھ بھی
شامل ہیں۔

یہ کھیل 1947ء سے جاری ہے۔ 1947ء میں نفاذ شریعت کے لئے فقیر ایپی کا نام
استعمال ہوا اور 2009ء میں مولانا فضل اللہ کا نام استعمال ہوا۔ دونوں مرتبہ فساد کی جڑ بھارت
ہے۔ ہمارے حکمران مولانا فضل اللہ کو تو کوستے ہیں لیکن بھارت کے بارے میں خاموش ہیں۔
کچھ دانشور بھی اچھل اچھل کر کہتے ہیں کہ طالبان اور پاکستان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے لیکن جب ان
سے پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان میں آگ لگانے والے طالبان کو بارود اور روپیہ کون دے رہا ہے تو
یہ دانشور کھسیانی بلی بن جاتے ہیں۔ پاکستان کے آئین سے انکار کرنے والے طالبان ہمارے
دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں لیکن ہمیں ایسے دانشوروں اور ریٹائرڈ جرنیلوں سے بھی ہوشیار رہنا ہے جو
پاکستانی سرزمین پر امریکی ڈرون حملوں کی حمایت کرتے ہیں۔ کیا امریکی ڈرون حملے ریاست کے
آئین اور ریاستی عملداری کے لئے خطرہ نہیں؟ ان دانشوروں اور ریٹائرڈ جرنیلوں کے ماضی کو
کریدیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے تانے بانے بھی دہلی کے ساتھ ملتے ہیں۔ میں دہلی کے ساتھ
برابری کی بنیاد پر دوستی کا مخالف نہیں لیکن یہ سیکولر انتہا پسند ہمیں دہلی کا غلام بنانا چاہتے ہیں تو
مولانا فضل اللہ کے ساتھ ساتھ ان سے بھی ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ
امریکی ڈرون حملوں کے حامی ہیں۔ مسئلہ کشمیر کو سرد خانے میں ڈالنے کی تجویزیں دیتے ہیں اور

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ خود فیصلہ کر لیجئے کہ مولانا فضل اللہ اور بھارتی
دودھ پر پلنے والے ان آستین کے سانپوں میں کیا فرق ہے؟

O

صدر بارک اوباما نے افغانستان اور پاکستان کے لئے جس نئی حکمت عملی کا اعلان کیا
ہے، مزید فوجی نفری اور مالی امداد کی فراہمی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ امریکی مختلف اصطلاحات
استعمال کرنے کے گرویدہ ہیں، اب افغانستان اور پاکستان کے لئے ایف پاک (Af-Pak) کا
مختلف لفظ استعمال کر رہے ہیں، انہیں اس سے غرض نہیں کہ ایسی اصطلاح استعمال کرنے سے
متعلقہ ملکوں کے عوام کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی، افغانستان اور پاکستان سے متعلق پالیسی کا از سر نو
جائزہ میں غور اور تفصیلی مشاورت سے کام لیا گیا جو خاصے طویل عرصے جاری رہی اور یہی وجہ ہے
کہ اس غور و فکر کے نتیجے میں جو پالیسی سامنے آئی، بیشتر مغربی دارالحکومتوں میں اس کا خیر مقدم کیا
گیا اور اسے حقیقت پسندانہ اور قابل قبول قرار دیا گیا۔

افغانستان کے لئے امریکی و نیٹو افواج کی نفری اور جنگ سے تباہ حال اس ملک میں
بنیادی سہولتوں کے ڈھانچے اور اداروں کی نئے سرے سے تعمیر کے لئے مالی امداد میں بتدریج
اضافہ پر مبنی تھی، صدر اوبامہ کی حکمت عملی میں موخر الذکر مقصد یعنی افغانستان کی تعمیر نو سے تقریباً
صرف نظر کیا گیا ہے، لیکن فوجی قوت میں اضافہ اس کا لازمی حصہ ہے جس کے تحت القاعدہ کو برباد
کرنے اور طالبان کو شکست دینے کی ایک دوسری نمایاں کوشش کے طور پر مزید 21 ہزار فوجی
افغانستان بھیجے جائیں گے، افغانستان میں تعینات امریکی کمانڈر جنرل ڈیوڈ میکرنن نے رواں
سال کے آخر تک دس ہزار امریکی فوجی افغانستان بھجوانے کی درخواست کی ہے، اس درخواست کو
منظور کرتے ہوئے امریکی صدر دس ہزار فوجی اس سال بھجوانے کا حکم دے سکتے ہیں۔ جنرل
میکرنن نے شروع میں تیس ہزار اضافی دستوں کی مانگ کی تھی افغانستان میں 38 ہزار امریکی فوجی
پہلے سے موجود ہیں اور اگر مزید تیس ہزار فوجی بھجوا دیئے جائیں تو ان کے زیر کمان فوج کی نفری اس
سال کے آخر تک 68 ہزار ہو جائے گی اس کے علاوہ افغانستان میں دوسرے اتحادی ممالک کے
32 ہزار فوجی بھی موجود ہیں جو نیٹو کے زیر کمان برسر پیکار ہیں، صدر اوبامہ نے نیٹو سربراہ کانفرنس
سے جو 3 اپریل کو منعقد ہوئی، افغانستان کے لئے مزید دستے طلب کئے ہیں، اگرچہ یورپی
ممالک کی طرف سے مطلوبہ فوجی نفری بھجوانے پر آمادگی کا امکان ہے، لیکن وہ علامتی اضافی نفری

فراہم کر سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ افغانستان میں افغان نیشنل آرمی اور پولیس کو تربیت دینے کے لئے انسٹرکٹر بھجوانے کو تیار ہوں، اس طرح افغانستان میں امریکہ کے زیر سرکردگی اتحادی افواج کی مجموعی نفری ایک لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ اس سے افغانستان عملاً امریکہ کے لئے دلدل بن جائے گا کیونکہ افغانستان میں کمان پوری طرح امریکہ کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گی۔

تازہ کمک کی ترسیل سے افغانستان میں نیٹو اور اتحادی افواج کی نفری ایک لاکھ بیس ہزار روسی فوج کی سطح پر آ جائے گی، روس تقریباً دس سال تک اس ملک میں لڑتا رہا لیکن وہ افغان مجاہدین کو شکست دینے یا افغانستان کو مستحکم بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا، امریکہ اور اس کے اتحادی کم و بیش آٹھ سال سے برسر پیکار ہیں لیکن طالبان اور دوسرے مزاحمتی گروپوں کے خلاف ان کے فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آتے، امریکہ نے افغانستان میں جو خونیں تجربہ حاصل کیا، اس کے پیش نظر وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ طالبان کے خلاف جنگ جیتنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے، امریکہ کے نزدیک اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے غیر مستحکم پاکستان کی سلامتی کو استحکام اور اس امر کو یقینی بنائے کہ عسکریت پسندوں کو قبائلی علاقوں میں محفوظ پناہ گاہیں دستیاب نہ ہوں، صدر کرزئی بھی امریکیوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے ہیں کہ ان کے ملک میں شورش و سرکشی اور مزاحمت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ القاعدہ اور طالبان جنگجو ڈیورنڈ لائن کے دوسری طرف پاکستان سے آزادی کے ساتھ کارروائیاں کرنے اور آسانی سے پاک افغان سرحد کو عبور کرنے میں کامیاب رہتے ہیں، چنانچہ صدارتی انتخاب سے قبل اپنی صدارت کے آخری سال کے دوران کرزئی اور ان کی ڈھیلی ڈھالی حکومت نے امریکہ کو جنگ کا میدان پاکستان منتقل کرنے اور نئی حکمت عملی میں افغانستان اور پاکستان کو برابر کا درجہ دینے کا قائل کر لیا ہے، افغانستان میں طالبان کے خلاف جنگ جیتنے، امریکہ کے تحفظ اور امریکی فوجیوں کی جانیں بچانے کے مقاصد کے حصول کی خاطر اگر صدر اوبامہ کی نئی حکمت عملی سے پاکستان مزید غیر مستحکم ہوتا ہے تو کرزئی اور اوبامہ کو کوئی فکر نہیں ہوگی۔

چنانچہ یہ تعجب خیز نہیں ہونا چاہئے کہ صدر اوبامہ افغانستان میں ''اعتدال پسند'' طالبان کے ساتھ مصالحت پر زور دے رہے ہیں لیکن یہ وہ نسخہ ہے جو اس وجہ سے کارگر نہیں ہوگا کہ طالبان کے سپریم قائد انتہا پسند، سخت گیر ملا عمر کو چیلنج کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے، دوسری طرف اوبامہ ان امن سمجھوتوں پر خدشات میں مبتلا ہیں جو پاکستانی حکومت پاکستانی طالبان کے

ساتھ کر رہی ہے، اس طرح پاکستانی اور افغان طالبان کو الگ الگ خانوں میں رکھنے سے امریکی صدر پاکستانی طالبان کے ساتھ حکومت پاکستان کے معاہدوں کے اقدام پر عدم اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں۔

امریکہ پاکستان کی قبائلی علاقوں میں عسکریت پسندوں کی کمین گاہوں کو نشانہ بنانے کے لئے سی آئی اے کے زیر نگرانی جاسوس طیاروں کے حملے جاری رکھنے پر جو اصرار کر رہا ہے وہ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ امریکہ کو یقین ہے کہ یہ کام موثر طور پر انجام دینے کے سلسلے میں پاکستان کی حکومت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، تاہم امریکہ دنیا کی واحد سپر طاقت ہونے کے باوجود طالبان کے خستہ حال لشکر کو شکست دینے میں اپنی ناکامی کھلے عام تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے، اس کے لئے آسان بات یہ ہے کہ افغانستان میں اپنی پالیسیوں کی ناکامی کا الزام افغانستان میں مداخلت سے متعلق پاکستان کے غیر دانشمندانہ رجحان کے سبب پاکستان کے سر منڈھ دے اور ایسے موقع پر جب امریکہ افغان چپقلش میں نئی شدت لانے کے لئے اور قابل فتح بنانے کے لئے پر تول رہا ہے۔ پاکستان سے ''مزید کچھ کرو'' کا تقاضا کرے۔ عوامی مقبولیت سے محروم کوتاہ اندیش پاکستانی حکمران 1979ء کے بعد سے افغانستان میں دو امریکی جنگیں لڑ چکے ہیں، اس عمل میں انہوں نے اپنی آبادی کے بڑے حصے کو انتہا پسندی کے گرداب میں پھنسا دیا ہے اور ملک خطرناک حد تک غیر مستحکم ہو گیا ہے، پاکستان میں القاعدہ اور طالبان کے زیادہ سے زیادہ عسکریت پسندوں کو ہلاک کرنے کے لئے امریکہ نے اسلام آباد کی ڈانواڈول سویلین حکومت کے لئے اس کے نتائج اور قبائلی آبادی میں خوف و ہراس کی پروا کئے بغیر جاسوس طیاروں سے حملوں کی جو غیر اعلانیہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اس سے ہٹ کر اوبامہ انتظامیہ نے پاکستان کو پانچ سال کے دوران ساڑھے سات ارب ڈالر کی امداد فراہم کرنے کی پیشکش کی ہے، اس طرح پاکستان کو امریکی ڈالر میں اس کا حصہ میسر آ جائے گا لیکن جو خطیر رقم خرچ ہوئی ہے یا جیسا کہ بعض ناقدین الزام لگاتے ہیں۔ افغانستان میں رائیگاں گئی ہے، اس کے مقابلے میں یہ امریکی امداد بہت کم ہے، تاہم جیسا کہ صدر اوبامہ نے اپنی تقریر میں کہا ہے، مذکورہ امداد بلینک چیک نہیں ہوگی، انہوں نے اسے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کا مستقبل محفوظ بنانے کے لئے فوری نقد امداد سے تعبیر کیا ہے، مالی امداد کے سلسلے میں اس طرح کی درجہ بندی مناسب معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات مشترکہ مقاصد پر نہیں بلکہ ڈالروں کی فراہمی پر مبنی ہیں، بالفاظ

دیگر پاکستان کے لئے پیغام یہ ہے کہ امریکی امداد لینے کے لئے اسے بعض شرطیں پوری کرنی ہوں گی اور امریکہ جو معیار مقرر کرے گا اس پر پورا اترنا ہوگا، افغانستان کے اندر لڑائی میں متوقع شدت اور وسعت کے پیش نظر پاکستان کے لئے امریکہ کی کڑی شرائط پوری کرنا اور امریکیوں کو ہر طرح سے مطمئن کرنا ممکن نہیں ہوگا، چنانچہ امریکہ درمیان میں کسی بھی وقت پاکستان کی امداد روک سکتا ہے اور پاکستان سے ''مزید کچھ کرو'' کے مطالبے کی رٹ پھر سے لگانا شروع کر سکتا ہے تا کہ وہ افغانستان میں جنگ جیت سکے، چنانچہ عدم اعتماد اور کشمکش کی کیفیت امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات پر سایہ فگن رہے گی۔

سوات، وزیرستان اور ''را''

مئی کے دوسرے ہفتے جب سوات میں آپریشن ''راہ راست'' شروع ہوا تو اس پر مختلف انداز سے ماہرین نے مختلف تبصرے کئے۔ ان میں بریگیڈیئر (ر) محمود شاہ جو ''فاٹا'' کے حوالے سے خصوصی شہرت اور اہمیت کے حامل ہیں، کا تبصرہ شاید سب سے بھرپور، جامع اور مختصر تھا۔ انہوں نے کہا:

''ہم سوات میں بھارت سے براہ راست جنگ لڑ رہے ہیں''

یہ ہے وہ سچائی جس پر خدا جانے ہمارے بزدل حکمران کیوں پردہ ڈالتے ہیں۔ اس وقت درجنوں ویب سائٹس پر دنیا بھر کے اخبارات کے تراشے موجود ہیں۔ جدید ترین تحقیقاتی یورپی، امریکی اور ایشیائی اداروں کی رپورٹس موجود ہیں کہ افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلے بھارتی قونصلیٹس در اصل ''را'' کے تخریبی مراکز ہیں جہاں پاکستانی صوبہ سرحد اور بلوچستان کے نوجوانوں کو تربیت، اسلحہ اور پیسہ دے کر پاکستان کے کونے کونے میں دہشت گردی پھیلائی جا رہی ہے۔ پاکستانی انٹیلی جینس ایجنسیوں نے ایسے درجنوں افغانی، پاکستانی، ازبک، تاجک اور چیچن شدت پسندوں کو زندہ گرفتار کیا ہے جنہوں نے ثبوت دیئے کہ انہیں ''را'' نے افغانستان میں تربیت دے کر پاکستان میں داخل کیا۔

جنرل مشرف کے آخری دنوں میں پاکستان کے سرحدی علاقوں سے غیر ملکی خصوصاً چینی انجینئرز کے اغوا کی جو سیریل شروع ہوئی تھی اس کے حوالے سے گرفتار ہونے والے اہم کرداروں نے ''را'' کے سروبی (جلال آباد) خوست، قندھار اور ہرات قونصلیٹس کے کئی بھارتی ڈپلومیٹس کے نام اور ٹیلی فون نمبر فراہم کئے جنہوں نے انہیں تربیت دی تھی (تفصیلات کے لئے مصنف کی کتاب ''را'' کی عالمی دہشت گردی ملاحظہ فرمائیں)

راقم نے ایسے تین دہشت گردوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ جن کا تعلق بھارت سے ہے اُن کے رشتہ دار ہندو تاجر افغانستان میں صدیوں سے آباد ہیں۔ ان کا آنا جانا یہاں گزشتہ تیس سال سے لگا ہوا تھا۔ ان کو ''را'' نے اپنے مقصد کے لئے تاڑا، ان کی تربیت کی، چونکہ پشتو وہ روانی سے بول سکتے ہیں، انہیں طالبان کی صفوں میں طالبان بنا کر داخل کیا اور انہوں نے طالبان کے ایک موثر گروپ تک نہ صرف رسائی حاصل کی بلکہ علاقائی گروپس کے کمانڈر بنے۔ چینی انجینئرز کے اغوا کی وارداتوں میں یہ بطور خاص ملوث تھے اور انہیں اس اہم مشن کے لئے ہی طالبان کی صفوں میں داخل کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک سوات سے گرفتار ہوا جس نے ڈرگز کے ایک اہم ذخیرے تک انٹیلی جنس ایجنسیوں کی راہنمائی کی حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مقامی طالبان کو بھی اس کی خبر نہیں تھی کہ اس ''ہندو طالب'' کے ان کے گروپ میں موجود دو ازبک طالبان سے کیوں خصوصی مراسم ہیں۔ یہ دونوں ازبک اور ہندو طالبان افغانستان سے ہیروئن اور افیم طالبان کی آڑ میں لاتے اور مقامی ڈرگ مافیا کو سپلائی کرتے تھے۔ جس سے ''را'' کروڑوں روپے ماہانہ کمارہا تھی اور یہی رقم مختلف طریقوں سے طالبان کو منتقل ہوتی تھی۔

میں نے ایسے ایسے عینی شاہدین سے بھی ملاقات کی ہے جنہوں نے سوات اور وزیرستان کے دو معروف طالبان لیڈروں کی تجوریوں میں امریکی، بھارتی، برطانوی اور پاکستانی کرنسی کے بنڈل دیکھے ہیں جن کا یہ لوگ بہت بے رحمی سے استعمال کرتے ہیں۔ مقامی آبادی کی غربت کا فائدہ اٹھا کر نوجوانوں کو باقاعدہ ماہانہ تنخواہ پر بھرتی کیا جاتا ہے۔ یہ اعلان تو وزیرستان اور سوات کے بازاروں میں عام طور پر طالبان کی طرف سے ہوتا تھا کہ سرکاری نیم فوجی اور پولیس تنظیموں کے ملازمین ڈبل تنخواہ پر ان کی نوکری اختیار کرلیں اور شنید ہے کہ اس کا اثر بھی ہوا۔ آج بھی مختلف حلقے یہ سوال کھڑا کرتے ہیں کہ پاکستانی سیکورٹی فورسز سے جنگ کرنے کے لئے پاکستانی شہروں میں تخریب کاری کے لئے ماہانہ کروڑوں روپے کے جو اخراجات ہو رہے ہیں اس کے لئے رقم کہاں سے آتی ہے؟ محض یہ کہہ دینا کہ طالبان امریکی یا روسی فوج کے چھینے اسلحے سے جنگ لڑ رہے ہیں۔ سوائے جہالت اور ضد کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ دلیل قطعی قابل قبول نہیں۔

جو مجاہدین افغانستان میں روس کے خلاف جہاد کر رہے تھے وہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ وہ روس سے اسلحہ چھین کر اس کے خلاف استعمال کرتے ہیں جبکہ وہ خود جانتے تھے کہ جھوٹ

بول رہے ہیں اور ساری دنیا بھی اس حقیقت سے واقف تھی۔ آج بھی ساری دنیا کی انٹیلی جنس ایجنسیاں جنہوں نے کمانڈر مسعود کے معروف علاقے ''جبل السراج'' کو اپنا مرکز بنایا ہوا ہے۔ اس حقیقت سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ ان کی معاونت بھی کرتی ہیں۔

''را'' پاکستان میں کئی گھناؤنی کارروائیاں سی آئی اے کو اعتماد میں لے کر اس کے ''پرسپل ایجنٹ'' کی حیثیت سے کرتی ہے کیونکہ ہر جگہ امریکن اپنی موجودگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اسی طرح ''را'' اور ''موساد'' کا تعاون بھی سامنے کی بات ہے جس کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ پاکستان پر اس شیطانی تکون ''را''، ''موساد'' اور ''سی آئی اے'' نے اپنے گہرے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔

O

بھارتی حکومت نے پاکستان کے خلاف کیسے کیسے گھناؤنے منصوبے بنائے جن پر عمل نہ ہوسکا۔ اس کی ایک جھلک آپ کو معروف بھارتی عسکری تجزیہ نگار Ravi Rikhye کی مشہور زمانہ کتاب "The War that Never Was" میں نظر آتی ہے۔ یہ کتاب 1988ء میں بھارت کے عسکری اور تجزیاتی و تزویراتی کتابوں کے لئے معروف ادارے ''چانکیہ پبلی کیشنز'' دہلی نے شائع کی تھی جو بھارت کے سابق آرمی چیف کی طرف سے پاکستانی سرحدوں پر ہونے والی دنیا کی سب سے بڑی جنگی مشق ''براس ٹیک'' پر لکھی گئی ہے۔ تزویراتی علوم کے طالب علم Ravi Rikhye کے عسکری تجزیوں کو سند مانتے ہیں۔ 28 سال تک روی ریکھی بھارتی ڈیفنس فورسز کو پڑھاتا رہا اور اسے اپنے موضوع پر اتھارٹی مانا جاتا ہے۔ یہ انتہائی متعصب اور پاکستان کو بزور طاقت (خاکم بدہن) ختم کرنے کا نظریہ رکھنے والا ''انڈین پاک'' ہے۔ آیئے اس کی زبانی ''براس ٹیک آپریشن ٹرائی ڈنٹ'' کی تفصیلات اور تبصرہ سنتے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ بھارت کے عزائم کیا ہیں اور جو لوگ آج پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر تنقید کر رہے ہیں وہ کس کی زبان بول رہے ہیں۔ میں نے اس کتاب کے کچھ حصے منتخب کئے ہیں جبکہ یہ پوری کتاب پاکستانیوں کی خصوصی توجہ چاہتی ہے۔ روی ریکھی ''آپریشن براس ٹیک'' کے خاتمے پر اس کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

براس ٹیک آپریشن ناکام ہوجاتا

براس ٹیک کے پیچھے ایک خاموش مفروضہ ہے کہ اگر بھارت کی سندھ میں پیش قدمی پنجاب کو پاکستانی حملہ سے محفوظ کر دیتی۔ اسی لئے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ براس ٹیک کو اس لئے منسوخ کیا گیا کیونکہ اہل اقتدار کو پنجاب کی فکر تھی اور یہ کسی فوجی نقطہ نظر سے نہیں تھا۔ چند ابتدائی نقصانات اٹھانے کے بعد بھارت بہت محدود پیمانے پر مزید نفری سے اس کا ازالہ کر دیتا چونکہ پاکستان کی ریزرو فوج بھی اس حملے میں شامل ہوتی.....اس لئے باقی سارا پاکستان ایک کھلا میدان رہ جاتا اور بہر حال بھارت کی فیروز پور کے جنوب میں کامیابی پاکستان کو مجبور کر دیتی کہ اپنے اپنے دستے پیچھے ہٹانا چاہئے۔ وہ یہ چاہتا یا نہیں چاہتا یا چاہے اسے حملہ میں کتنی ہی کامیابی کیوں نہ ہو رہی ہوتی۔ اس کی دو مثالیں موجود ہیں: 1965ء کی جنگ میں پاکستان کے 7ویں ڈویژن نے صرف چھمب اور اکھنور پر اپنی ضربیں جاری رکھنی تھیں اور وہ ان کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن جب بھارت نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے لاہور اور سیالکوٹ پر حملہ کر دیا تو تقریباً فتح کے قریب 7ویں ڈویژن کو وہاں سے ہٹا کر سیالکوٹ اور لاہور کے لئے لانا پڑا جس سے کشمیر پر دباؤ ختم ہو گیا۔ 1971ء میں پاکستان کا 23ویں ڈویژن جو بہت مضبوط ہو چکا تھا، نے چھمب حاصل کر لینے کے بعد مسلسل اکھنور پر اب پیش قدمی کرنی تھی لیکن بھارت کی طرف سے سیالکوٹ میں پیش قدمی کی بنا پر اکھنور محفوظ ہو گیا۔

یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ پاکستان لاہور اور سیالکوٹ کی طرح سندھ کے دفاع کے لئے دوسرے محاذوں سے اپنے دستے ہٹانے کی پرواہ نہیں کرتا لیکن پنجاب کے اندر اس کی چند کلومیٹر پیش قدمی اس کے اپنے ملک کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے مقابلہ میں کوئی کامیابی ازالہ نہ ہوتی۔ اگر ہم اپنے تین اضلاع گورداسپور امرتسر اور فیروز پور گنوا بھی دیتے تو بھی پاکستان کی تباہی کے مقابل کچھ نہ ہوتا۔

سمندر سے منقطع ہو کر یہ صرف بھارت کے رحم و کرم پر ہوتا۔ کراچی اور حیدر آباد جیسے بڑے اور اہم شہروں پر ہمارا قبضہ ہو جانے سے پاکستان کو تباہی میں جکڑ لیتا جبکہ ہمارے تین ضلعوں کا کھو جانا گو بڑا نقصان ہوتا لیکن سندھ کے مقابلہ میں یہ بالکل ایک معمولی نقصان ہوتا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ اگر سندھ پاکستان کے ہاتھ سے نکل جاتا تو وہ پھر بلوچستان کو بھی قابو نہ رکھ سکتا،

صوبہ بھی پھر بھارت کے قبضہ میں آ جائے گا اور اس طرح پاکستان کا قصہ ختم کرنا ایک حقیقت بن جائے گا۔

اگر ہم تمام صورت حال پر غور کریں تو پھر پاکستان کی پنجاب پر حملے کی ظاہری گیدڑ بھبکی کی روشنی میں ہماری ناکامی زیادہ فکر اور تردد کا باعث ہے۔ پاکستان کے لئے نہ صرف پنجاب پر قبضہ کرنا ناممکن تھا بلکہ ساتھ ہی اس کا سندھ کے دفاع سے منہ موڑنا بھی ناممکن تھا بلکہ ساتھ ہی اس کا سندھم کے دفاع سے منہ موڑنا بھی ناممکن تھا۔ ہمیشہ کی طرح پاکستان محض دھوکہ دہی سے کام لے رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح جس کے جال میں ہم پھنس کر ناکام ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی براس ٹیک مشن ناکام ہو جاتا۔ ایک لمحہ کے لئے اس صورت حال پر غور کریں کہ پاکستان پنجاب میں کچھ فوائد حاصل کرنے کی بجائے براس ٹیک کے خلاف سندھ کا دفاع کرنے کا فیصلہ کر لیتا تو کیا صورت ہوتی۔ ایسے میں سندھ اور جنوبی پنجاب میں پاکستان اپنے 1 بکتر بند 14واں، 16واں، 18واں اور 35واں ڈویژن معہ دوسرے اور 10 (1)ویں آرمرڈ بریگیڈ اور 5ویں کور کے آزاد بریگیڈ اور 60ویں بریگیڈ کے ساتھ فوجیں جمع کر دیتا۔ چونکہ بھارت کے دونوں بکتر بند ڈویژن جنوب میں تھے اس لئے پاکستان بھی اپنا چھٹا بکتر بند ڈویژن سیالکوٹ سیکٹر سے جنوب میں بھیج سکتا تھا۔ کچھ بریگیڈ اور کچھ ٹینک بھی رجمنٹ دوسرے سیکٹروں سے بھی آ جائیں۔ آیئے ہم دو ٹینک رجمنٹ اور ایک مشینی بٹالین کو ایک عام بریگیڈ مانیں تو اندازاً پاکستان 18عام بکتر بند اور 14 انفنٹری بریگیڈ جمع کر سکتا تھا، ساتھ ہی ملتان سے تیسری کور ہیڈ کوارٹرز کراچی سے پانچویں اور کوئٹہ سے بارہویں کور میسر ہوتی۔ اس کے مقابل بھارت کی پہلی، دوسری، پانچویں اور دسویں کور 1 اور 31ویں ڈویژن، ایک عارضی بکتر بند ڈویژن، 33ویں مشینی، 18ویں اور 36ویں Tapid ڈویژن، 54ویں ہوائی حملہ اور چوتھے، 11ویں، 12ویں، 14ویں، 16ویں، 18ویں کور میں ایک (1) آرمرڈ بریگیڈ اور ایک انفنٹری (1) بریگیڈ بھی۔ جنوبی کمان میں دو (1) بریگیڈ اور بحری بری آپریشن کے ذریعہ ایک انفنٹری بریگیڈ ممکنہ طور پر 34(1) تری وینٹرم سے یا 54ویں ڈویژن سے ایک بریگیڈ لایا جاتا۔ 1 کور میں 89(1) انفنٹری بریگیڈ ہوتا۔ Rapid ڈویژن میں دو انفنٹری اور ایک ایک مشینی بریگیڈ تھے۔

بھارت کے خود مختار بکتر بند بریگیڈز نے ایک عارضی بکتر بند ڈویژن کی شکل اختیار کر لی

اور ایک بقایا میں چار عام بکتر بند بریگیڈز سے زیادہ ٹینک BMPS تھے۔ اس طرح یہ کل 12 متوازن بکتر بند بریگیڈ، پانچ مشینی بریگیڈ اور 34 انفنٹری بریگیڈز کی طاقت تھی۔

مختصراً صورت حال یہ تھی:

بکتر بند بریگیڈ	بھارت	12	پاکستان	8
مشینی بریگیڈ	بھارت	7	پاکستان	صفر
انفنٹری بریگیڈ	بھارت	32	پاکستان	14

آیئے اب لنکا سٹر فارمولا کے مطابق فریقین کی صف بندی توازن اور جنگی طاقت کے نمبر جمع کریں۔ فرض کریں انفنٹری بریگیڈ کا ایک نمبر مشینی بریگیڈ کے دو نمبر اور آرمرڈ بریگیڈ کے تین نمبر ہیں۔ اس میں ہم نے توپ خانہ ہوائی قوت ہیلی کاپٹر اور دیگر ذرائع مواصلات وغیرہ شامل نہیں کئے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ہمارے مقصد کے لئے کافی ہے۔ تو مندرجہ بالا اعداد شمار کے مطابق بھارت کے کل 82 نمبر بنتے ہیں جبکہ اس کے مقابل پاکستان 38 نمبر حاصل کرتا ہے۔ لنکاسٹر فارمولا کے تحت فریقین کی جنگی طاقت اس طرح ہے کہ بھارت کے نمبر 6609 ہیں اور پاکستان کے 1444 ہیں۔ اس طرح ہمارے حق میں چار اور ایک کا تناسب بنتا ہے جو ایک جلد فتح کے لئے مناسب توازن ہے۔ (پاکستان نے چونکہ جوابی حکمت عملی سے یہ منصوبہ ناکام بنا دیا تھا اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مصنف کہتا ہے)

کیا جنگ بند کرنے کے لئے بین الاقوامی دباؤ پڑنے سے پہلے دہلی سات دن کی جنگ میں نتائج حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ بین الاقوامی دباؤ کے موثر ہونے میں بارہ دن لگتے تھے جبکہ اتنے عرصہ میں (4/مارچ تا 16/مارچ) ہماری فوجیں 250 کلومیٹر حیدر آباد اور 15 کلومیٹر رحیم یار خان تک آسانی سے پہنچ سکتی تھیں لہٰذا پھر کیوں اس پر اصرار کیا جائے کہ براس ٹیک آپریشن ناکام ہو جاتا؟ اس نقطہ کی وضاحت کے لئے ہمیں پیچھے جا کر دونوں ملکوں کی اعلیٰ حکمت عملی کا جائزہ لینا ہوگا۔

براس ٹیک مشقیں

جنرل سندرجی سے مسند معلومات حاصل کرنے میں ناکامی ہونے پر ہم اپنے محدود ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔ براس ٹیک کا بنیادی

منصوبہ.....ایک تیر کی شکل میں دو کوروں کی طرف سے حملہ کرنا تھا تیر کی سرے کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اطراف سے آنے والے حملہ کو پرے دھکیل دیتا ہے اس طرح انفنٹری اور امدادی دستوں نے کام کرنا تھا۔ یہاں گفتگو کے لئے یہ فرض کر لیں کہ کور II شمالی پہلو اور کور I جنوبی پہلو تھا۔ دونوں پہلو تھا۔ دونوں پہلو کے درمیان تقریباً 150 کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور مقاصد میں کچھ لچک ہے۔ مثلاً II مغربی جانب مسلسل بڑھنے سے پہلے تھوڑا سا شمال مغرب کو ہٹ کر رحیم یار خان پر حملہ کرتی۔ دونوں پہلوؤں میں دو بکتر بند/مشینی ڈویژن ہیں۔ ایک ایک عارضی.....ڈویژن بھی ان میں شامل کیا جانا تھا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ 18 واں ڈویژن کور I اور 36 واں کور II کے ساتھ تھا۔ کافی سارے ڈویژن ریزور میں تھے جن میں چوتھا 14 واں اور 54 واں ہوائی حملہ ڈویژن شامل تھے۔ تیر کے سرے کے مرکزی حصے کے شمالی پہلو کو کچھ فاصلہ تک بٹھنڈہ دسویں کور کے 16 ویں اور 24 ویں ڈویژن کا تحفظ حاصل تھا۔ اس حملہ سے پاکستان کے 14 ویں اور 35 ویں ڈویژن کو یہاں الجھا لینا تھا اور جنوب کی طرف لاہور سیالکوٹ سیکٹر کی طرف سے آنے والے دستوں کو امدادی دستے روک لیتے۔ دسویں کور کو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے زیادہ لمبی پیش قدمی کی ضرورت نہیں تھی۔ محض 10، 20 کلومیٹر پیش قدمی ہی کافی تھی۔ جنوب کی طرف جنوبی کمان کی 12 ویں کور بھوج سے بدین اور پھر حیدر آباد کی طرف دو ڈویژن کے ساتھ پیش قدمی کرتی۔ اس کے علاوہ ایک مزید تقسیم اس طرح ہوتی کہ بحری بری طریقوں سے ایک بریگیڈ کراچی شہر کورنگی کے علاقہ میں اتار دیا جاتا۔ RAW اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ کراچی میں گڑبڑ پھیلاتی ان دو کے باہمی ملاپ سے پنجاب سے اور سندھ کے اندر پاکستانی فوجوں کو منتشر کر دیا جاتا۔ دو ڈویژن کے علاوہ 10 ویں کور کے حملہ کے ذریعہ پنجاب پر تمام ممکنہ پاکستانی حملوں سے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکتا تھا۔ (اندازہ کیا آپ نے کتنے بھیانک عزائم ہیں دشمن کے)

عظیم حکمت عملی

بھارت کی اعلیٰ ترین حکمت عملی کو معاشی نقطہ نظر سے فوج نے حالیہ تیاریوں کے دوران کچھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اختصار کے ساتھ پیش ہے۔

- بین الاقوامی مداخلت کی بنا پر آئندہ پاک بھارت جنگ مختصر ہوگی۔
- مختصر جنگ میں فوجوں کی صلاحیت قابل ذکر نہیں بلکہ غیر متعلق ہے اور موجود فوجیں

ہی جنگ کے نتائج لاسکتی ہیں نہ کہ ان کی جنگی صلاحیت۔

.. دونوں ملکوں کی صف بند فوجیں تقریباً برابر ہیں۔

.. بیرونی طاقتوں کی مہربانی سے پاکستان اتنا مسلح ہو چکا ہے کہ وہ شاید درحقیقت اہم کامیابی حاصل کرے۔

دستاویز سے یہ بھی مفروضہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان پہل کرے اور پنجاب میں کامیابیاں حاصل کرلے۔ان کامیابیوں کی تلاش ریگستان میں بھارتی جوابی حملہ سے کی جائے گی۔ یہ دستاویز اتنی حیران کن ہے کہ ہم اس کا جواب لکھنے یا تجزیہ کرنے میں پریشان ہیں۔ یہ عجیب غریب جھوٹ وغلط بیانی کا مجموعہ ہے کمزوری کا اعتراف ہے۔ بے بسی کا اقرار ہے اور محض خیالی دنیا میں رہنا ہے یہ یقیناً عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہے جو اپنی فوجوں پر اعتماد کرتے ہیں۔اس کے باوجود میں بہت سے ذہین محب وطن اور ذمہ دار افراد کو حکومت کی حکمت عملی کا اکثر ذکر کرتے سنا ہے جنہیں یہ شبہ ہے کہ بھارت کی فوج بھی اس ریاکاری کے 90% حصہ پر یقین رکھتی ہے۔

جھوٹ ظاہر ہے کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں دونوں فوجیں برابر ہیں اور اس بارے میں ہم ہی جائزہ پیش کر چکے ہیں یہ بات ذہن قبول نہیں کرتا کہ مسلح اور ڈویژنوں کی تعداد میں 105 کے تناسب سے پلہ بھاری ہو.....تین گنا ہوائی جہاز زیادہ اور چار گنا اوّل درجہ کے لڑاکا جہاز زیادہ ہوں اور پانچ گنا نیوی زیادہ ہوں تو تقریباً برابر طاقت کوئی پاگل تجزیہ نگار بھی نہیں گردان سکتا۔(مصنف کو اس بات سے تکلیف پہنچی کہ بھارتی ماہرین نے براس ٹیک ختم کیوں کیا)

پاکستان نے عارضی طور پر کسی ایک آدھ جزوی سیکٹر میں برابری یا تھوڑی برتر حیثیت کبھی حاصل کی ہوگی اور وہ بھی قطعی طور پر محض بھارت کی غفلت کی بنا پر۔لیکن یہ کیفیت بھارت کے نہ چاہنے کی صورت میں کبھی برقرار نہیں رہی۔ مثال کے طور پر پاکستان کے F-16 حاصل کرنے کے بعد بھارت نے میراج 2000 حاصل کرکے یہ برتری ختم کردی گو کہ دونوں ملکوں نے کافی عرصہ سے جدید لڑاکا جہاز حاصل کرنے میں وقت گزار رہے تھے۔ چونکہ F-16 کی ترسیل شروع ہوگئی جس بنا پر پاکستان کو وقتی طور پر اس شعبہ میں تقابلی برتری حاصل رہی۔ بھارت نے اس کا روایتی طرز پر جواب دیتے ہوئے اپنی فضائیہ میں پاکستان کے مقابل میں تین گنا زیادہ طیارے جن میں 40 مگ 23، 40 مگ 2000 اور 40 مگ 29 مال کرلئے، حال ہی میں پاکستان نے خودکار درمیانے توپ خانہ کے شعبہ میں امریکہ سے نئی M-109A، 155

لی میٹر دھانے کی SP Howtizer خرید کر کے جزوی برتری حاصل کی ہے لیکن ایک لمحے کے لئے پس منظر کا جائزہ لیں۔1972ء تک بھارت کے پاس ایس پی قسم کے توپ خانہ میں سے صرف جنگ عظیم دوم کی 88 ملی میٹر دھانے کی توپیں تھیں۔

پاکستان نے 1954ء کے معاہدہ کے تحت امریکہ سے 105 ملی میٹر دھانے کی SP Howtizer توپیں حاصل کر رکھی تھیں۔ دونوں حریفوں کے پاس ان کی تعداد اور ان کی کارکردگی میں فرق اتنا غیر اہم تھا کہ اس میں کسی برتری کا ذکر ہی فضول ہے۔1972 میں بھارت نے برطانیہ کی فوج میں موجود اوّل درجہ کی توپ 105 ملی میٹر دھانے کی SP Howtizer سے اپنی فوجوں کو مسلح کرنا شروع کردیا اور اس شعبہ میں پاکستان پر بہت بڑی برتری حاصل کرلی اور پہلے بھارت کے اس بارے میں زیادہ فکر نہ کرنے کی وجہ اس کی دیگر ترجیحات تھیں نیز اسے پاکستان کی اس شعبہ میں نام نہاد برتری کی فکر بھی نہ تھی۔ پھر بھارت نے 130 ملی میٹر دھانے کی خودکار Catapult بنا کر پاک بھارت کے اس شعبہ میں موجود فرق کو عظیم بنا دیا۔ Catapult کی لمبے فاصلہ کے لئے کمزوری واضح تھی لیکن اس کو دور کرنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی کیونکہ پاکستان نے اپنے وسائل کے مطابق بہترین چیز خریدنے کے خواہش رکھی ہے جو اس نے 1982ء میں ایک بہتر اسلحہ کی خرید سے پوری کی اور 1985ء میں بھی وہی ماڈل خرید کر بھارت کے ساتھ عددی برابری حاصل کرنے کی سعی کی لیکن اس شعبہ میں مزید اضافہ پاکستان نے بند کردیا ہے۔ حقیقت میں محدود ذرائع کی بنا پر وہ ابھی نمایاں طور پر مزید جدید اسلحہ کے بارے میں خیال نہیں کرسکتا۔ البتہ بھارت درمیانی ایس پی توپیں خرید کرتا رہے گا اور پھر پاکستان کو اس شعبہ میں عدد اور استعداد کے لحاظ سے پیچھے چھوڑ دے گا لیکن کسی بھی صورت میں کوئی یہ نہیں کہے گا کہ چونکہ 1978ء میں پاکستان کو ایس پی توپ خانہ کے شعبہ میں برتری تھی اس لئے وہ اس بنا پر میدان جنگ میں کوئی فتح حاصل کرلیتا کیونکہ اس کے مقابل میں بھارت کو ٹینکوں اور مشینی پیدل فوج کی بے شمار برتری حاصل تھی۔ توپ خانہ مسلح وجود کا محض تیسرا جز ہوتا ہے جبکہ بھارت کے باقی دو جز سے مکمل برتری مہیا کرتے ہیں۔

اسی طرح بھاری ٹینک شکن میزائلوں کے شعبہ پر نظر ڈالیں۔ پاکستان کے پاس 4000 گز تک مار کرنے والے غالباً 5000 TOW میزائل ہیں۔ بھارت امریکہ سے TOW میزائل خرید سکتا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر سیاسی وجوہ کی بنا پر اس سے گریز کیا اور اس

نے Euromissile Franco German Milan بنانے پر توجہ دی۔اس نے نہ صرف پندرہ ہزار میزائل تیار کرنے کا پروگرام شروع کیا بلکہ خود کفیل ہونے کے لئے اپنا پلانٹ لگایا جبکہ پاکستان صرف درآمد ہی کرسکتا ہے۔ Milan پروگرام میں طویل تسائل پاکستان کی وجہ سے نہیں بلکہ ہماری اپنی کوتاہی تھی۔ (یہ صورت حال 1986ء میں تھی اب بھارت کے پاس امریکہ اسرائیل روس اور مغربی ممالک کا جدید ترین اسلحہ موجود ہے)

ہماری دفاعی تنظیم (اس میں دفاعی امور کے تجزیہ نگار وصحافی شامل ہیں) کچھ عرصہ سے امریکی چمک دمک کے فریب میں مبتلا ہوگئے ہیں۔اس طرح ایک روایتی امریکی ایجاد Force Multiplier جن کی بظاہر بڑی اہمیت ہے لیکن درحقیقت ہے کچھ بھی نہیں پر عمل ہوا ہے۔مجھے پہلی دفعہ اس لفظ کا خصوصیت سے جو AWACES 3 کے ساتھ استعمال کئے جانے سے علم ہوا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لڑاکا طیاروں کو بہتر طور پر استعمال کرنے کے لئے ہدایت ونگرانی کا موثر نظام اس کے ذریعہ حاصل ہوا۔اس طرح بجائے اس کے ممکنہ حملہ کے دفاع کے لئے زیادہ سے زیادہ طیارے حاصل کئے جائیں۔ AWACS حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے جو کہ آپ کے موجودہ طیاروں کی جنگی قوت کو مزید طاقت فراہم کردے گا۔

کہنے کی حد تک یہ بہت اچھا ہے لیکن پھر دیکھا جائے تو تمام جدید ہدایت کمان ونگرانی Force Multipilers ہیں کیونکہ یہ تمام اسلحہ، جاسوسی، حکمران، نقل وحمل، حکمت عملی اور بمباری میں جدید پن لاتی ہیں۔گائیڈڈ اسلحہ مثلاً ٹیلی ویژن گائیڈ بم وغیرہ بھی فورس ملٹی پلائرز ہیں۔

کیونکہ ان کی مدد سے کسی مخصوص ہدف کو نشانہ بنانے کے بہت سے ہوائی حملوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ATGM ایک ایسی چیز ہے جس کی قوت بڑھتی رہتی ہے۔کیونکہ وہ زیادہ سستے طریق پر مہنگے ٹینکوں کا تباہ کر سکتے ہیں۔دہلی کا نیشنل ڈیفنس کالج بھی ایک بڑی طاقت..... ہے کیونکہ یہ کمان کے معیار میں اضافہ کرتا ہے اور موجود قوت کو بہتر طریقہ سے استعمال کرنے میں امداد دیتا ہے، بجائے اس کے کہ مزید فوجی اضافہ کیا جائے، دہلی کی I اور II فیلڈ سگنل رجمنٹ بھی بہت بڑی قوت..... ہیں، کیونکہ وہ پاکستان کی مواصلات پر نظر رکھتی ہیں۔دشمن کی نقل وحرکت کے بارے میں درست معلومات سے اپنی طاقت کو صحیح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ Ballon ٹائروں والی گاڑیاں صحرا میں ایک عظیم قوت کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ حرکت

میں آسانی پیدا کرتی ہیں جس سے بہتر نقل وحمل کی صورت میں جنگی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں بھارت کو یہ حکمت عملی اختیار کرنا پڑی۔پیشقدمی کر کے اسے مستحکم کرنے کے لئے ٹھہرنے کی بجائے بڑھتے رہنا بھی ایک طرح کی فورس ملٹی پلائر ہے۔کیونکہ اس سے موجود فوج کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور نئے اضافہ کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے۔روس بھارت معاہدہ بھی فورس ملٹی پلائر ہے کیونکہ اس کی بنا پر بھارت چینی محاذ سے اپنی فوج ہٹا کر پاکستانی سرحد تک لگا سکتا ہے۔اس طرح اسے نئے ڈویژن قائم کرنے کے دباؤ کا سامنا نہیں رہتا لہٰذا اب چونکہ ہر قوت فورس ملٹی پلائر ہے اس لئے:

(اے) اس لفظ کے استعمال سے کیا امداد مل سکتی ہے؟

(بی) اسے پاکستان کے حوالے سے استعمال کر کے یہ ظاہر کرنا ہے کہ پاکستان کے پاس بھارت کے مقابلہ میں زیادہ فورس ملٹی پلائر ہے؟

ایسے میں جبکہ بھارت پاکستان کے دو کے مقابلے میں دس گنا کے حساب سے اپنی افواج کو ترقی دے رہا ہے اس قسم کی مکروں اور گمراہ کرنے والی اصطلاح کو اگر استعمال ہی کرنا ہے تو بھارت کی کمزوریوں کی بجائے اس کو حاصل ہونے والے فوائد کے حوالے سے استعمال کیا جائے۔ورنہ یہ بھی جھوٹوں کے الجھے ہوئے پلندے میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا جس سے ہم پہلے ہی بوجھل ہیں۔

''وسیع پیمانے پر امریکی اسلحہ کی امداد، کی اصطلاح بھارت کے اخبارات اور دفاعی تجزیہ نگاروں کے دو نہایت پسندیدہ اصطلاحوں میں سے ایک ہے۔(جبکہ دوسری اصطلاح ''جدید ترین اسلحہ'' ہے)

چلئے بحث کی غرض سے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پاکستان کو امریکی امداد کی صورت میں ہتھیاروں کی واقعی بہت بڑی تعداد ملی ہے۔کیا یہ امداد کہلا سکتی ہے اگر اس کی پوری قیمت معہ تمام واجبہ بازاری سود سمیت ادا کی جانی ہے؟ اور جب کہ اس کی پوری بازاری قیمت وصول کی جارہی ہے؟ اگر یہ امداد ہے تو پھر ہم ان روسی ہتھیاروں کے بارے میں کیا کہیں گے جو بھارت کو محض 2% سود پر 17 سال کے طویل عرصہ کے دوران بازار سے کم قیمت پر فراہم ہو رہے ہیں؟ (گو کہ روسی بتدریج پوری قیمت لگا رہے ہیں لیکن اس کم ترین شرح سود کے ساتھ اور اگر ہم امریکہ کی پاکستانی کو فراہمی کو عظیم قرار دے رہے ہیں تو بھارت کی اپنی اسلحہ خریداری کو کیا کہیں گے؟ صرف

ایک حالیہ معاہدہ کے تحت بوفرز کی 155 ملی میٹر دھانے کی توپوں پر تقریباً چار بلین ڈالر خرچ آئیں گے۔ (یہ 1500 توپوں کی قیمت کا اندازہ ہے) اس کے برعکس پاک امریکہ اسلحہ فراہمی میں گیارہ سالوں میں پاکستان کو صرف 3034 بلین ڈالر کا اسلحہ ملے گا۔

ایک بامقصد اور حقیقی جائزہ لینے والا اس پر نہایت حیران ہوگا کہ جب بھارت کا صرف ایک معاہدہ ہی پاکستان کو امریکہ کی طرف سے دیئے جانے والے تمام اسلحہ سے بڑا ہے تو ہم کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟!! بیرون ممالک سے اسلحہ کی خریداری کرنے کے ساتھ ساتھ بھارت کے اندر اپنے ذرائع سے پاکستان سے کئی گنا زیادہ اسلحہ بنانے کے ادارے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان ایرونائیکل لمیٹڈ اندازاً 25 مگ 27 اور 15 جیگوار طیارے یا 40 صف اوّل کے طیارے سالانہ تیار کرتی ہے۔ یہ اس کی بیرون ممالک سے خرید کردہ طیاروں کے علاوہ ہیں جبکہ پاکستان قطعی طور پر کوئی جنگی طیارے نہیں بناتا اور پاکستان کو 40 طیارے سالانہ کے حساب سے ہر آٹھ سال میں اپنی فضائیہ میں شامل کرنے ہوں گے۔

یہ جھوٹ اور فریب کاریاں ممکن اور واضح اور قابل فہم ہیں کیونکہ ہم اپنے آپ کو ہمیشہ بہت اچھا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہم بھارت کے اس اصرار پر حیران و پریشان میں کہ جو بھی جنگ ہوگی وہ بین الاقوامی دباؤ کے تحت مختصر ہوگی۔

ہم کیوں اپنی قوت طاقت اور برتری کو ایک طرف پھینک کر پاکستانی شرائط پر جنگ لڑیں؟ ایک مختصر جنگ سے صرف پاکستان کو فائدہ ہوسکتا ہے۔ ہم نے اس کتاب میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ مختصر جنگ سے کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا، چاہے ہمیں ایک کے مقابلے میں تین کی برتری کیوں نہ ہو، حتمی نتائج چار ہفتوں یا اس کے بعد ہی برآمد ہو سکتے ہیں جبکہ ہم اپنے زیادہ نقصانات کو پورا کریں گے کیونکہ ہم حملہ کر رہے ہوں گے اور ہمیں کلی طور پر ایک کے مقابلے میں پانچ کی برتری حاصل ہو جائے گی۔ کیا یہ کام ہمارے حکمرانوں کا ہے کہ وہ جنگیں لڑ کر پاکستان کو فتح کا موقع فراہم کریں۔ ہمارے حکمران اور جنرل بھارت کے لئے لڑ رہے ہیں یا پاکستان کے لئے؟ یہ بڑے دکھ سے محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ لوگ اپنے دشمن کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم پاکستان کو پہلے حملہ کرنے کا موقعہ دیں تو یقیناً وہ پنجاب میں کامیابیاں حاصل کر لے گا لیکن ہماری قومی پالیسی یہ کیوں ہے کہ پہلے دشمن کو حملہ کرنے کا موقعہ دیا جائے؟ نہ ہی اسرائیل نہ روس ایسا کرتے ہیں وہ اس پر صاف الفاظ میں مصر ہیں کہ وہ پہلے حملہ کریں گے۔ NATO اتحادیوں کی

ی دفاعی ہے کیونکہ امریکہ کو چھوڑ کر دیگر سب ممالک روس سے چھوٹے ہیں اور روس سے زدہ ہیں اور ان کی پوری کوشش ہے کہ روس کو کسی صورت مشتعل نہ کریں۔ امریکہ اپنی انفرادی یت میں مختلف پالیسی پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سمندر میں امریکی بحریہ پہلے حملہ کرتی یقیناً اگر وہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکے تو پھر وہ اس کے لئے تیار ہے کہ حملہ کرنے سے پہلے حملہ سکے۔

اپنے حریف کو پہلے حملہ کرنے کا موقع دے دینا ایک بدترین اور مکروہ فعل ہے جس کے ہ میں وہ ایسا فائدہ حاصل کر لے جس کی وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر حاصل کرنے کا سوچ بھی لتا ہو۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم نے ماضی میں اس پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ 1971ء اس کی واضح ن مثال ہے۔ ہم نے 21,22 نومبر کی درمیانی رات پاکستان کی بین الاقوامی سرحد کو عبور کے پہلے حملہ کیا 1965ء کے بارے میں اتنا واضح نہیں ہے، پھر بھی وضاحتیں موجود ہیں۔ ب اس کے تخریب کار ناکام ہو گئے تو پاکستان نے اپنے 12 ویں اور 7 ویں ڈویژن کے ساتھ میر میں چھمب پر پہلے حملہ کیا لیکن بھارت نے بین الاقوامی سرحد پار کرنے میں پہل کی۔ مخالف پہلے حملہ کرنے کا موقعہ دینے کی غلطی کی، مثال کے طور پر اپریل 1965ء میں رَن کچھ میں ستان کو موقع دے کر کی گئی۔ بھارت نے یہاں جوابی ردِعمل کے سوائے کچھ نہ کیا اور آرام سے ، گئے۔ اس سے پاکستان کو کشمیر میں اگست اور ستمبر میں حملہ کرنے کی جرات ہوئی اور اسے خیال کہ بھارت کسی اور طرف جوابی کارروائی نہ کرے۔

کسی حکمت عملی کو تجزیہ نگاری کے لئے ایک صاف ڈھانچہ مہیا کرنا چاہئے جس کی امداد ، ہم اپنے حملے اور جوابی حملوں کے بارے میں صورت حال کو سمجھ سکیں اور پھر یہ بے لاگ ٹھوس سچے حقائق پر مبنی ہونا چاہئے اور بالکا بے رحمانہ حد تک صاف ہمارے مفادات کے بارے میں آئینہ ہونا چاہئے۔ اگر ہم ایک ناکارہ حکمت عملی کے حامل ہوں گے تو ایسی پالیسی کے تابع لڑی نے والی جنگ میں بھی ہم ناکامی کا منہ دیکھیں گے۔

یا مداخلت 12 دن میں ہوگی؟

براس ٹیک کا خیال ہے کہ بین الاقوامی مداخلت جنگ کو ختم کرا دے گی اور یہ مداخلت ن میں ہوگی۔ اگر ہم اس مفروضہ کے ساتھ اپنی کارروائی شروع کریں کہ مداخلت جنگ بند

کرادے گی تو پھر ظاہر ہے کہ ایسی مداخلت کے بعد ہم اپنی کارروائی جاری نہ رکھ سکیں گے۔ اگر مداخلت ہونی ہے تو اس کا وقت طریقہ کار اور عرصہ ہمارے دائرہ اختیار میں نہیں ہوگا۔

ایسی صورت میں کن اسباب و بنیادوں پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مداخلت 12 دنوں میں ہوگی چونکہ ہم جنرل سندرجی کے خیالات کے ترجمان نہیں۔ اس لئے ہم وقت مداخلت کے بارے میں اپنے عقل وادراک کی روشنی میں رائے دیں اور پھر دیکھیں گے کہ مداخلت کے بارے میں دیئے گئے اندازوں میں کیا خامیاں ہیں۔

12 ویں دن سے زائد تک مداخلت نہ ہونے کے کسی جواز کے بارے میں کوئی تجزیہ کرنا مشکل کام ہے بلکہ یہ اندازہ اس عام خیال پر مبنی لگتا ہے کہ نہ ہم، نہ ہی پاکستان دو تین ہفتوں سے زائد جنگ جاری رکھنے کے قابل ہے۔ چونکہ دونوں ملک 2,3 ہفتوں سے زائد جنگ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لئے اس عرصہ میں ہی کسی وقت جنگ بند کرانے کی کوششیں ہوں گی۔ حتمی طور پر مداخلت کے وقت کا اندازہ محض ایک مفروضہ ہے۔

آیئے اب ہم اپنی خارجہ پالیسی کے ایک اصول پر نظر ڈالیں۔ پاکستان کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ امریکی خارجہ پالیسی میں مشرق میں اتنا ہی اہم ہے جتنا اسرائیل اس کے لئے مشرق وسطیٰ میں، ہم امریکی مفادات اور تعلقات کے حوالے سے اس مفروضے اور فریب کاری کو قطعی طور پر تسلیم نہیں کرتے لیکن ہمارے اس تجزیہ میں ہمارے خیالات غیر متعلق ہیں اور وہی ہوتا ہے جو حکومت بہتر سمجھتی ہے۔

اگر یہ اصول درست ہے اور پاکستان واقعی امریکہ کے لئے اتنا ہی اہم ہے تو پھر مداخلت اتنی ہی جلدی ہوگی جتنی جلدی امریکہ اس کا بندوبست کرسکا جیسا کہ اسرائیل کے معاملہ میں ہوا کہ اس نے ذرا سا بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ جنگ شروع ہوتے ہی سفارتی دباؤ پڑنا شروع ہو جائے گا۔ صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ ہر وہ اسلامی ملک جسے امریکہ پاکستان کی امداد پر مجبور کرسکتا ہے، دباؤ شروع کردیں گے۔ 1971ء کی طرح بھارت کے خلاف لابی اقوام متحدہ میں بھاری تعداد میں مخالفت کرے گی۔ روسی ویٹو اقوام متحدہ کو کسی کارروائی سے باز رکھے گا لیکن دیگر اقدامات کو نہ روک سکے گا۔

یہ اقدامات مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ سفارتی تیل کی ترسیل کی بندش، بھارتیوں کا مختلف ممالک سے اخراج، اس میں فوجی مداخلت بھی ہوسکتی ہے۔ پاکستان نے اپنے فوجی سعودی

ب اور اردن کو دے رکھے ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ امریکہ ان ممالک سے فوجیوں کو اپنے ازوں سے پاکستان لا اتارے گا۔ یہ فوجی یا تو افغانستان کی سرحد پر موجود فوج کو آکر فارغ کر ں گے یا پھر سیالکوٹ یا لاہور جیسے حساس سیکٹروں میں دفاع کو مضبوط کریں گے۔ بیرونی فوجیوں ے جنگی معاملات میں کچھ زیادہ قواعد حاصل نہیں ہوں گے لیکن ان کا اس طرح شامل کیا جانا بہت یت کا حامل ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امریکہ براہ راست ملوث ہو کر اپنی افواج اور فضائیہ کے ریعہ افغانستان سرحد سے پاکستانی فوج کو ہٹنے کا موقع دے یا خود براہ راست بھارتی فوج کے نابل آجائے۔ یہاں اس کی قدر و قیمت نہ صرف فوجی بلکہ سیاسی بھی ہوگی۔

امریکہ فضائیہ کے F-15 قسم کے 72 طیاروں اور تین یا پانچ AWAC S-3 کے لروپ کے آجانے سے علاقہ کا سارا فضائی توازن بدل جائے گا اور کیا بھارت میں پہلے ہی بیرونی مداخلت کا خوف ہے؟ اور وہ کیا امریکی مداخلت سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہے؟ خیال رہے کہ اب یہ سب مفروضے ختم ہو چکے ہیں، بھارت اور امریکہ سٹریٹیجک پارٹنر بن چکے ہیں)۔

یہ دونوں مداخلتیں چند دنوں کے اندر ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر امریکہ چاہے تو 72 گھنٹے کے اندر اپنا لڑاکا فضائیہ دستہ پاکستان میں پہنچا سکتا ہے۔ ایک دفعہ بیرونی مداخلت ہو جانے کی صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پھر بھارت کے پاس 12 دن بھی ہوں گے۔ پھر اس کے پاس دو تین سے زیادہ دن نہیں ہوں گے اور کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ اتنے مختصر عرصہ میں کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔

حیدرآباد بہت دور تھا!

نقشہ پر راجستھان سے حیدرآباد (سندھ) پہنچنا آسان ہے، ہمیں زمین پر ایک کے مقابل چار کی جنگی برتری ہے۔ فضائیہ میں برتری حاصل ہے، سمندروں پر کنٹرول حاصل ہے علاوہ ساتھ ہی کراچی میں بری بحری راستہ سے فوج اتارنے کی سہولت حاصل ہے۔ ہوائی فاصلہ کے حساب سے کھوکھراپار سے حیدرآباد جنوبی پٹی کے ساتھ ساتھ تقریباً 250 کلومیٹر ہے۔ ٹینوٹ سے رحیم یار خان یا ربیتی پہنچنے کے لئے 100 کلومیٹر پاکستانی علاقہ کو عبور کرنا ہوگا۔ تقریباً 20 کلومیٹر یومیہ کے حساب سے پیش قدمی کرکے دو ہفتوں میں پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا

سکتا ہے۔ یقیناً پنجاب میں ہمیں بھی اس دوران نقصانات ہوں گے لیکن یہ سندھ میں شاندار کامیابی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں گے۔ حقیقت میں جس طرح کی ہمیں تمام شعبوں میں فوجی طاقت میں برتری حاصل ہے اس کے نتیجہ میں صورت حال یقیناً مختلف ہوگی۔ اس کو جانچنے کے لئے ہمیں بہت سے حقائق واسباب کا جائزہ لینا ہوگا۔

1983ء کی مشقیں

1983ء کی مشقوں میں ڈگ وجے بلیو نے ریڈ کے خلاف 10 کلومیٹر یومیہ یا ایک پورے حملہ میں 70 کلومیٹر کے حساب سے پیش قدمی کی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ 1983ء کے مفروضات وحقائق کے بارے میں کافی حد تک سندھ کے حالات کے بارے میں لاعلم ہونے کی بنا پر اصل حقائق سے ہمارے پیش کردہ حقائق کافی مختلف ہوں لیکن اس وقت بھی پیش قدمی صحرا میں ہی تھی اور اب جبکہ طاقت کا توازن پہلے کی نسبت ہمارے حق میں زیادہ ہے اور جگہ وہی صحرا ہے۔ نقل وحمل، مواصلات، سگنل اور توپ خانہ کی طاقت میں بہتری اور اضافہ کے مقابل پنجاب کی اندرونی گڑبڑ کو کچلنے کے لئے طاقت کو اس طرف موڑنے کی بنا پر حاصل شدہ مفاد کی نفی ہوجائے گی۔

دس کلومیٹر یومیہ کے حساب سے پیش قدمی کی صورت میں رحیم یار خان یا ریتی 12 دن میں پہنچا جاسکتا ہے لیکن حیدرآباد تک پہنچنے کے لئے ایک ماہ درکار ہوگا۔ کیا مشقوں کی طرح کے نتائج جنگ میں بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں؟ خاص طور پر جبکہ ریڈ (دشمن) فوج میں خاص طور پر اس مقصد کے لئے تربیت یافتہ فوجیوں نے حصہ نہیں لیا۔ دباؤ یہی تھا کہ ریڈ کو کمزور اور بلیو کو اچھی پوزیشن میں دکھایا جائے۔ اگر مشقوں میں پیش قدمی دس کلومیٹر ہو تو حقیقی جنگ میں بھی یقیناً ہو، اس وقت تک کہ بھارت کو معقول فوائد حاصل نہ ہوجائیں، پیش قدمی کافی حد تک کم ہوگی۔ ایک سے لے کر پانچ کلومیٹر تک روزانہ پیش قدمی کی صورت میں لاہور اور کراچی کے درمیان میں کاٹ لینے کا مقصد 12 دن میں پورا نہیں ہوسکتا۔ البتہ بھارت سندھ کا کافی بڑا حصہ حاصل کرلے گا لیکن اس سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔

سپلائی کا مسئلہ

کیا 13 ڈویژنوں کو صحرا میں امداد مہیا کی جاسکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں لگتا۔ ایک لمحہ کے لئے

اس ٹیک کے خاکہ کا جائزہ لیں۔

شمالی کنارے پر بھنڈہ سے دسویں کور اپنے دو بڑے ڈویژنوں ایک آرمرڈ بریگیڈ اور (1) بریگیڈ یعنی کل (11) بریگیڈوں پر مشتمل ہے۔

درمیان میں I اور II کور میں جن کے ساتھ تین بکتر بند ڈویژنوں ایک مشینی، ایک ائی حملہ، Rapid اور دو انفنٹری ڈویژن اور ایک یا دو (1) بریگیڈ ہیں۔

جنوبی سرے پر 12 کور دو ڈویژنوں اور کم از کم ایک (1) بریگیڈ کے ساتھ موجود ۔

بحریہ کا بری بحری امداد بریگیڈ مغرب میں ہے۔

بری بحری بریگیڈ کو سمندر کی طرف سے بحریہ امداد دے گی اور فوج کو اس بارے میں فکر نے کی ضرورت نہ ہوگی۔ دسویں کور کو سپلائی اور امداد مہیا کرنے میں دشواری نہیں ہونی چاہئے ونکہ اس نے اپنے اصل مقام سے تھوڑے فاصلہ پر جانا ہے نیز یہ ریلوے لائن کے قریب ہی ہو ا۔

12 ویں کور کو ابتدائی امداد وسپلائی آسان نہ ہوگی کیونکہ وہاں ریلوے کا صرف ایک ری سٹیشن بھوج ہی ہے جبکہ سڑکوں کے ذرائع بہت محدود ہیں، اس کے باوجود کچھ کے درمیان ، موسم سرما میں خاص اور مقررہ راستوں سے سپلائی ممکن ہونی چاہئے کیونکہ ان دنوں دلدل خشک ا ہوگی۔

"البتہ یہ I اور II کور کے ساتھ 9 ڈویژن ہیں جن کے بارے میں پریشانی ہے۔ جنگ ضروری سپلائی کو بہت محنت سے چار ماہ میں ریلوے کے برمر۔ جیسلمیر اور جودھپور سٹیشنوں ظریعہ لایا گیا لیکن یہ ایک بہت بڑی قوت بلکہ بھارت کی سب سے بڑی قوت ہے جو کسی مشن لئے ایک جگہ اکٹھی کی گئی اور وہ بھی میدانوں کے دشوار اور مشکل خطے میں، پیش قدمی کرتے ئے اور پاکستان کے اندر پیش قدمی کرچکے دستوں کو یہاں امداد اور سپلائی مہیا کرنا تقریباً ناممکن ا۔ صرف کچھ دستوں کو سپلائی ہوسکتی ہے۔ اس طرح پاکستان کو لاحق خطرے میں کمی ہو جاتی ۔

بکتر بند ہراول کو جہاں نقل وحمل میں سہولت اور آسانی ہے وہاں انفنٹری ڈویژنوں زیر استعمال گاڑیوں کی تعداد اور امداد محدود ہے۔ یہ واضح نہیں ہے کہ کیا پوری کور کے لئے

سپلائی صحرا کی عارضی ایک یا دو سڑکوں کے ذریعے ممکن ہے۔ عام طور پر اس کے لئے ریلوے ہیڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگانا بھی دشوار ہے کہ ہر ڈویژن کو روزانہ کتنے ایندھن کی ضرورت پڑے گی، ایک بکتر بند مشین ڈویژن کے لئے ایک لاکھ ٹن اور دوسروں کے لئے اس سے آدھا معقول اور مناسب ہوگا۔ ڈویژنوں کا اپنا خرچ تو کم ہوگا لیکن جب فوج اپنے کیمپ سے محاذ پر جائے تو اس طرح کے اخراجات کی ضرورت بڑھ جائے گی۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیزی سے پیش قدمی سپلائی کی رسید کی ضروت کو کم کردیتی ہے کیونکہ جم کر لڑنے کی صورت میں استعمال ہونے والے گولہ بارود اور توپ خانہ کی ضرورت سے اس طرح بچا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس باقاعدہ سڑکوں کے نہ ہونے کی صورت میں ٹرانسپورٹ میں ہر طرح کا ضیاع بڑھ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم شمالی امریکہ میں جنگ عظیم دوم کے تجربہ کی روشنی میں جانتے ہیں کہ تخمینہ شدہ سے تین گنا زائد ایندھن استعمال ہوسکتا ہے۔

صحرا میں ان سڑکوں سے ہٹ کر نقل وحرکت مزید ایک مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ سڑک پر کسی طرح کی رکاوٹ سے پیچھے آنے والی تمام گاڑیوں کی راہ روک دیتی ہے کیونکہ ایسی رکاوٹ سے ہٹ کر گزرنے کے مواقع بہت محدود ہوتے ہیں۔ پھر اس سڑک پر جس کے ذریعے بکتر بند ہراول کے پیچھے پیچھے جانے والے انفنٹری ڈویژنوں کو سڑکوں کے ذریعہ سپلائی کا کام کیا جارہا ہو وہاں ویسے ہی تیزی اور افراتفری میں رکاوٹیں پڑنے کا خطرہ رہتا ہے اور یہ ایسا بھی نہیں کہ یہ یک طرفہ راستہ ہے۔ خالی گاڑیاں اور باہر کھینچے گئے دستوں کو واپس لاکر پھر کہیں لگانے کے لئے مزید جگہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لئے میں نے ابھی دشمن کی طرف سے کی جانے والی مزاحمت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تکالیف شامل نہیں کی ہے جو دسواں حصہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے یہ اعتماد کے ساتھ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ 9 ڈویژنوں جن میں چار بکتر بند ڈویژن شامل ہیں، کے لئے امداد کرنے کے امکانات بہت محدود ہیں۔ یہ صرف عقب کے انفنٹری دستوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہراول میں بکتر بند فوج کے ساتھ بھی مشکل ہوگی اور یہی کمزوری پاکستان کے خلاف ہماری برتری کے تناسب کو کم کردے گی۔

آپریشن ٹرائی ڈنٹ (ترشول)

ہم نے Brass Tacks کے موضوع پر اپنی بحث اور تجزیہ کو زیادہ حصہ دیا کیو

کستان کے خلاف جنگ میں جیت یا ہار بالآخر میدانی علاقوں میں ہی ہوگی"۔ میدانی علاقوں میں بکتر بند جنگ انتہائی اہمیت کی حامل ہے لیکن اب ہمیں ایک سحر انگیز نظریے پر نظر ڈالنی چاہئے، اری ایک بار پھر محسوس کرے گا کہ چاہے جنرل سندر جی میں کتنی کمزوریاں ہوں لیکن دلیرانہ سوچ ن کمزوریوں میں نہیں، یہ بھارت کا واقعی ایک عظیم المیہ ہے کہ حقیقت میں بھارت کو سندر جی جیسا نرل ہی چاہئے۔ وہ ایسے وقت میں آیا جب سوائے ارون سنگھ کے کوئی اور سیاسی لیڈر اس کے وہر کو پرکھنے یا سمجھنے والا یا اسے ملک کے لئے صحیح طور پر استعمال کرنے والا ہی نہیں ہے اور ارون نگھ کا المیہ یہ ہے کہ سیاسی لیڈروں میں سے صرف اس نے ہی بین الاقوامی سطح پر طاقت کے ستعمال کی ضرورت کو سمجھا، کے تجزیہ کے بارے میں Brass Tacks پر ہماری کی گئی بحث مداد دے گی حالانکہ ایک بلند پہاڑوں پر مہم جوئی اور دوسری میدانوں میں مشینی دستوں کی کارروائی سے متعلق ہے لیکن بھارتی کمزوریوں کا دونوں طرف برابر اطلاق ہوگا۔

مختصر جائزہ

Trident ایک منصوبہ تھا جس کے مطابق بھارت کی 15 ویں کور نے سکردو اور گلگت پر حملہ کرکے پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے شمالی علاقوں کو واپس حاصل کرنا تھا، اس میں کور کے تینوں ڈویژن 3,19 اور 28 شامل تھے اور ان کو مزید چھٹے ڈویژن جو ایک پہاڑی تنظیم تھی، کی بھی بیرونی امداد حاصل ہونی تھی۔ (آج ''فاٹا'' بھارتی جارحیت کا اہم نشانہ ہے کیونکہ بھارتی فوج میدان کے بجائے پہاڑی علاقے سے پاکستان کو (خاکم بدہن) زیر کرنا آسان سمجھتی ہے)

یہ گزشتہ 70 سالوں میں ہونے والی عظیم ترین پہاڑی جنگ ہوتی، جس سے زیادہ صرف اٹلی بمقابل جرمنی، آسٹریا ہنگری کی جنگ عظیم اوّل میں اٹالین آلپس ALPS کو حاصل کرنے کے لئے تین سال تک خونریز جنگ ہوئی تھی۔ وہ مہم یقیناً ایک بالکل مختلف مہم جوئی تھی۔ یہ بلند ترین پہاڑوں پر لڑی جانے والی تاریخ کی سب سے بڑی لڑائی تھی جس میں تقریباً آٹھ لاکھ 75 ہزار انسان ہلاک ہوئے تھے جو کہ جنگ عظیم اوّل کے شدید اور زبردست نقصانات کے باوجود حیرت انگیز طور پر بہت بڑی ہلاکت تھی۔ اس مہم میں شریک فرد (اب تک کئی زندہ ہوں گے) کو ایک ذیلی تماشہ ہی خیال کرتا۔ پھر بھی ہمالیہ کی شمال مغربی بلندیوں جو دنیا کے دشوار ترین علاقوں میں ہیں، پر چار ڈویژن فوج کے ذریعہ مہم جوئی کرنے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زیادہ

عرصہ پہلے کی بات نہیں ہے جب ہم محض اس لئے سارا شمالی علاقہ کھو بیٹھے کیونکہ ہم وقت پر ایک بٹالین فوج بھی سری نگر سے آگے نہ بھیج سکے۔ یہ بھی نہایت قابل غور ہے کہ صرف ایک بٹالین اور اچھی منصوبہ بندی اس وقت نہ ملنے پر ہم ایسا علاقہ کھو بیٹھے جہاں اب چالیس سال بعد تقریباً تین گنا زیادہ بٹالینوں اور چار سو فوجی روزانہ ہلاک ہوتے، کے منصوبہ کے تحت اس طرح کا حملہ ترتیب پایا تھا۔

A- گورلیس سے گلگت پر ڈویژن کے ذریعہ حملہ 29ویں ڈویژن کا 286 بریگیڈ۔

B- کارگل سے سکردو (اصل حملہ) 28ویں ڈویژن کا 121 بریگیڈ اور 28 ڈویژن کا ایک فاضل بریگیڈ۔

C- توہیس برراستہ خاپیلو سے سکردو (امدادی حملہ) تیسرے ڈویژن کے 102 (1) بریگیڈ، تیسرے ڈویژن کے 70 بریگیڈ۔

تیسرے ڈویژن کے 14ویں بریگیڈ کے ذریعہ چھٹا ڈویژن تیسرے ڈویژن کی جگہ سنبھال کر چین کے مقابل بیٹھ جاتا۔ ریزرو کو چھٹے، نویں اور 28ویں ڈویژن سے ایک ایک بریگیڈ دے دیا جاتا۔ قاری یہاں ذہن میں رکھے کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ توہیس پر حملہ بجائے تیسرے ڈویژن کے چھٹے ڈویژن نے کرنا تھا اور تیسرا ڈویژن (لیہ) چین کے مقابل کھڑا رہتا۔ ایک بات ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دائیں طرف سے چھٹے یا تیسرے ڈویژن نے حملہ کرنا تھا، ضروری بات یہ ہے کہ ایک ڈویژن یہاں کے لئے مخصوص تھا اور جس چیز کے بارے میں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ حملہ کیوں نہیں کیا گیا؟ اور اگر حملہ کیا جاتا تو کیا ہوتا؟

ایک اور بات، یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ تیسرا ڈویژن یہاں استعمال ہوتا کیونکہ وہ علاقہ سے پوری طرح واقف ہے۔ چھٹا ڈویژن عام طور پر بریلی سے چین کے حملہ کی صورت میں یوپی کے شمالی مشرقی علاقہ کا دفاع اور پاکستان سے جنگ کی صورت میں پٹھانکوٹ جا کر کارروائی کرنے ہے۔

یہ درحقیقت دسمبر 1986ء میں اپنے جنگی مقام پر منتقل ہو چکا تھا جس بنا پر پاکستان میں خطرے کی گھنٹیاں بج گئی تھیں کیونکہ مشقیں ہوں یا نہ ہوں اس ڈویژن کا اس علاقہ میں آنے مطلب ہی یہ تھا کہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اسے ہفتہ کے اندر اندر لیہ منتقل کیا گیا اور چند موقع دیا گیا کہ وہ حالات سے روشناس ہو جائے گو کہ یہ ایک پہاڑی ڈویژن ہے ہاور گوھکہ ا

ارتی فوج اپنے فوجیوں کو بہت جلد ماحول کی آب وہوا سے مانوس کر دیتی ہے، پھر بھی علاقہ کی واقفیت نہ ہونے کی بنا پر حملہ کی صورت میں چھٹے ڈویژن کی کامیابی کا امکان تیسرے ڈویژن کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ اس لئے یہ زیادہ مناسب لگتا ہے کہ وہ تیسرے ڈویژن کی جگہ چین کے مقابل پختہ مورچوں میں بیٹھ جاتا۔ یہ خطہ زیادہ آسان ہے اور مشن بھی ایسا ہی۔

تیاریاں اور ناکامی

Trident کے سلسلہ میں اہم ترین عمل چھٹے ڈویژن کو اپنے عام پڑاؤ پٹھان کوٹ اور جموں کے درمیان سے نکال کر لیہ منتقل کرنا تھا۔ یہ کام بہترین طریقہ سے جام پور سے ہوائی جہازوں کے ذریعہ کیا گیا۔ ایک دن میں جب کہ ہوائی طریقہ سے منتقلی عروج پر تھی اس دن 70 پروازیں لیہ میں اتریں، یہ یاد رکھا جائے کہ کافی صبح ہو جانے تک لیہ کا موسم خراب رہتا ہے۔ ایسے میں یہ 70 پروازیں An 32-S 11-76 اور An 12-S تھیں، نے محض پانچ گھنٹوں میں تقریباً یہ کام کیا۔ ایک ہی وقت میں لیہ کے اڈہ پر بیس An-12 سائز کے جہازوں سے زیادہ کے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس طرح اس دن واپسی میں تقریباً پچاس پروازیں گئی ہوں گی۔

اس کے باوجود معاملات غلط ہو گئے جیسے کہ 12000 فوجیوں کے لئے وہاں خوراک کی کمی تھی جو اچانک وہاں آ گئے تھے، ساتھ ہی ضروری بھاری ساز وسامان کے منتقل کرنے میں دیر ہوئی، اس لئے حملہ کی تاریخ 6 فروری کی بجائے 8 فروری کر دی گئی جس سے فوج کو مزید دو دن ماحول سے ہم آہنگ ہونے کو مل گئے۔ حملے کے لئے 8 فروری صبح 4:30 بجے کا وقت مقرر تھا، لیکن تین بجے حملہ منسوخ کر دیا گیا۔

کیوں؟ اس کے بارے میں دو وضاحتیں ہیں جو دونوں درست ہو سکتی ہیں۔

پہلی وضاحت:۔ دہلی میں وزارت دفاع کے ان دس مشکوک افراد میں سے کسی ایک نے سارے منصوبہ کی مخبری سعودی عرب اور عرب امارات کو کر دی جہاں سے امریکہ کو علم ہو گیا۔ محتاط اور نگران سعودی عرب اور امریکہ نے دباؤ ڈال کر منصوبہ کو ختم کرایا۔ ہم اس بارے میں کوئی تصدیق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس اس کی کوئی تفصیلات نہیں پہنچی ہیں لیکن ہمیں اتنا علم ضرور ہے کہ اس بارے میں MOD نے تفتیش کی تھی جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ (کسی حد تک یہ بات

سچ ہے لیکن اصل وجہ پاکستان کی جوابی حکمت عملی تھی)

دوسری وضاحت:۔ پاکستان کو چھٹے ڈویژن کی کمک کی اطلاع مل گئی اور جس طرح شاندار طریقہ سے بھارت نے کمک بہم پہنچائی اس قدر بہترین انداز میں اس نے جوابی طور پر سکردو میں کارروائی کر ڈالی۔ 130 سی کی تین سو پروازیں تین چار دن کے اندر سکردو بھیجی گئیں اور ان کے ذریعے کم از کم دو غالباً تین بریگیڈ فاضل فوج لائی گئی۔ اس سے فوجی توازن بھارت کے خلاف ہو گیا۔ لہٰذا بھارت نے مشن منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اس بارے میں تصدیق کی ہے کہ واقعی سکردو میں یہ کمک پہنچائی گئی تھی۔ اس بارے میں البتہ شبہ ہے کہ تین سو پروازیں کی گئی ہوں گی لیکن یہاں پاک فضائیہ کو اس بارے میں اہل نہ جاننا یا 130 سی کے بارے میں ایسا کر لینے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے کیونکہ 130 سی دیگر امریکی ساز و سامان کی طرح بہت معیاری اور بڑے پیمانے پر سامان لانے لے جانے کا کام کر سکتا ہے۔

مہم جوئی میں درپیش مسائل

بھارت نے براستہ سکردو گلگت پہنچنے کے لئے دو ہفتے مختص کئے تھے۔ یہ ایک دلیرانہ سکیم تھی لیکن Brass Tacks کی طرح حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی، سکیم میں بذات خود کوئی خرابی نہیں تھی بشرطیکہ دیئے گئے وقت سے تین گنا وقت زیادہ دیا جاتا۔ ایک بار پھر فوجی منصوبے باز بجلی کی سی تیزی سے جنگ کرنے کے اپنے نظریات میں پھنس گئے اور جبکہ ہم پہلے کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ تقریباً برابر کی ٹکر والے مخالف کے خلاف اس طرح کی جنگ نہیں ہونی چاہئے، آپ اعداد و اسلحہ میں اس سے زیادہ ہوں۔

O

پاکستان کی صف بندی

شمالی علاقوں میں پاکستان عام طور پر تین بریگیڈ لگاتا ہے جن میں سے ایک سیاچین گلیشیر کے مغرب خاپیلو میں، دوسرا سکردو اور تیسرا گلگت میں۔ دسویں کور کا ریزرو بریگیڈ کمانڈنگ ہیڈکوارٹرز شمالی علاقہ (ایچ کیو سکردو جو تین بریگیڈ کو کنٹرول کرتا ہے (راولپنڈی میں 111 (1) بریگیڈ بھی عام طور پر اس علاقہ کے لئے مخصوص ہیں۔ اس طرح بھارت اپنی فوج اس طرح یہاں لا پھینکتا۔

دو بریگیڈ پاکستانی اڈے خاپیلو کے مقابل جہاں سے وہ سیاچین کی کارروائیوں میں امداد دیتا۔ بھارت کے ان دو بریگیڈوں کا پاکستان کے ایک بیگیڈ پر حملہ دریائے شایاک کی وادی کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف تو ہیس سے کیا جاتا۔ (خاپیلو انداز اُدس ہزار فٹ بلندی پر ہے) گو کہ اس حملہ میں پاکستانی سیاچین کی چوکیاں دائیں طرف رہ جاتیں لیکن اس سے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ سارے گلیشیر پر مقامی طور پر حملے کر کے پاکستان کو وہاں محدود رکھے گا، شیاک وادی کے حملہ کو امداد دی جا سکتی تھی۔

سکردو کے مقابل کارگل سے 28 ویں ڈویژن سے دو بریگیڈ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ نیچے جاتے، یہ اصل حملہ ہوتا، اس کے مقابل صرف ایک برگیڈ ہوتا اور تیسرے اور 28 ویں ڈویژن دونوں کو امدادی حملوں سے مدد دی جا سکتی تھی۔

ایک بریگیڈ گوریس سے درہ بھرذیل جاتا۔ یہ راستہ سکردو پر حملہ کے لئے موزوں ترین ہے، بھالے کا ایک تیسرا پھل بناتے ہوئے اس قصبہ پر یہاں سے حملہ ہوتا اور اگر ضرورت نہ پڑتی تو سیدھے استو دریا کے ساتھ گلگت جاتے، جہاں سے شاہراہ قراقرم پر حملہ کیا جاتا۔ (شمالی یا دائیں دستہ سکردو سے امدادی فوج حاصل کرتا)

میسر وقت کا معاملہ

اس سارے معاملہ میں دشواری وقت کے تعین کرنے کی تھی۔ یہ کام موسم گرما میں بہت مشکل ہے لیکن موسم سرما میں بھی کسی طرح بھی یہ کام چھ ہفتوں سے پہلے مکمل ہونا ناممکن تھا، کارگل سے سکردو ہوائی فاصلہ کے لحاظ سے تقریباً 80 کلومیٹر ہے، جس کا مطلب ہے کہ پیدل چلنے والوں اور گاڑیوں کے لئے وادی میں تقریباً 150 کلومیٹر اور پہاڑیوں میں 250 کلومیٹر اور سیدھا فضائی فاصلہ 130 کلومیٹر ہوگا۔ گلگت کی تو بات ہی چھوڑیں، کوئی بھی فرد سکردو دو ہفتوں میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

1971ء میں لداخ بٹالین نے اپنی دو کمپنیاں قرتوک سے بیڈگانو پر حملہ کے لئے بھیجیں جو وہاں سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا اور مقابل صرف پاکستانی فرنٹیئر کور کی چند پلاٹون تھیں، اس وقت یہ ایک بڑا معرکہ سمجھا گیا، جس میں ابتدا سے آخر تک دو ہفتے لگے تھے اور جب اگلے موسم بہار میں برف پگھلی تو معلوم ہوا کہ بھارت نے اس علاقہ سے بہت ہکم پر قبضہ کیا ہوا تھا جتنا وہ سمجھ رہے تھے، یہ دسمبر میں ہوا تھا۔

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہماری فوج کو سیاچین کی لڑائی سے بلند ترین پہاڑوں پر سا سال لڑنے کا تجربہ حاصل ہوا ہے لیکن بیرونی چوکیوں پر چاہے وہ کتنی بلندی پر ہوں لڑنے اور چا بریگیڈ کے ساتھ فروری میں سکردو جا کر لڑائی کرنے میں فرق ہے۔ یقیناً یہ کہا جا سکتا تھا، جنگ میں ہی اس ضرب المثل کا صحیح اطلاق ہوتا ہے کہ جہاں جی چاہے وہاں کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا۔ جنگ کا فعل بذات خود انسان میں ایسی کارکردگی دکھانے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے جس کا زمانہ امن میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور یقیناً بھارت نے یہ کام کر گزرنا تھا لیکن دو ہفتوں میں نہیں، اس نے کام کھلے اور پرانے روایتی طریقوں سے کر لینا تھا، جس کے مطابق ایک کے مقابل دو یا ایک۔ مقابل تین اور پھر نازک لمحات میں ایک کے مقابل نو عددی قوت کو استعمال کرتا۔ اس کا مطلب ہے ھندامت اور پچھتاوا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ سارے چھ ہفتوں میں اس کے ساتھ کچھ حربی ذہانت ورنہ جیسا کہ وہ پہاڑی خطہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان اس سے دوگنے وقت میں اس پر قبضہ تو رکھ سکتا۔ ایک چھ یا 12 ہفتہ جنگ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ہم میں چھ بلکہ بارہ ماہ تک بھی جنگ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ دشواری یا مسئلہ فوج نہیں جو کہ جتنا عرصہ کہیں لڑ سکتی ہے بلکہ حکم

عملی تیار کرنے والے منصوبہ بازوں کا ہے جو طویل عرصہ کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے اور نہ اس بارے میں اتفاق کر سکتے ہیں۔

جغرافیائی اور موسمی اسباب

Trident قسم کے مشن کے لئے یہ خطہ بھارت کے لئے زیادہ سازگار اور اس کے حق میں ہے۔ توہیس اور کارگل کی طرف سے سکردو بڑھنے کے لئے نشیب ہے۔ گوریس محور کیلئے برزیل درہ میں سے اوپر چڑھنا پڑتا ہے ھاور اس کے بعد سکردو یا گلگت کی طرف نیچے جانا ہوتا ہے لیکن اوپر چڑھنا نیچے اترنے سے بہت زیادہ مختصر ہے اور اس کے بعد ہم درحقیقت پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔ عام حالات میں بھارت کو یقیناً مغربی کشمیر میں اترائی میں ہونے کا فائدہ حاصل ہے جو سیاچین کے علاقہ میں 1984ء سے جھگڑا شروع ہونے تک متنازعہ علاقہ میں ہمارا اہم معاملہ تھا۔

ساتھ ہی البتہ یہ ضروری ہے کہ اس علاقہ میں ہمیں حاصل فوائد کے اثرات کے بارے میں مبالغہ سے پرہیز کرنے چاہئے خاص طور پر ایک مختصر جنگ میں کیونکہ گو کہ سکردو اور گلگت ہمارے اڈوں کی نسبت اترائی میں ہیں، پھر بھی ہمیں متوقع راستوں یعنی شیاک، سندھ اور استور دریاؤں کی وادیوں سے گزرنا ہوگا۔ دریائی وادیاں تنگ ہیں اس لئے آسانی سے ان کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔ پیش قدمی میں آسانی پیدا کرنے کے لئے بھارت کو وادیوں کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کی چوٹیاں قبضہ میں کرنی ہوں گی۔ اس میں پیش قدمی چڑھائی و اترائی دونوں طرح کی کرنی پڑے گی گو کہ مجموعی پیش قدمی کا رُخ اترائی کی طرف ہی ہوگا، جب ہمیں اپنی کسی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے اترائی پر حملہ کرنا ہوگا تو اس کے تمام نقصانات ہمارے حصہ میں آئیں گے۔

سیاچین کا مسئلہ پاکستان کے لئے دشوار ہے، پاکستان کو اپنے دس ہزار فٹ بلند خاپیلو اڈے سے 22000 فٹ بلند گلیشیر کی چوٹی پر چڑھنا پڑتا ہے، چھپ چھپا کر اس نے اپنی کچھ پلاٹونیں اور فوجی اس علاقہ میں پہنچا دیئے اور پھر انہوں نے بھارتی چوکیوں پر حملے کئے لیکن جب وہ کمپنی کی سطح پر فوج پہنچانا چاہتا ہے تو پھر اسے حیرت انگیز نقصان اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ پیش قدمی کے تمام راستے بھارت کے قبضہ میں ہیں۔ اب یقیناً بہت کم مقامات ہیں جہاں بھارت کو سکردو یا گلگت پر حملہ کرنے کے لئے بارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر چڑھنا پڑے کیونکہ ان شہروں کو کئی

راستے جاتے ہیں اور اس لئے دشوار اور مشکل راستوں سے بچا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی تین ہزار سے چھ ہزار فٹ چڑھائی چڑھنا بھی ایک کٹھن کام ہے اور اب ہم بات کمپنی یا بٹالین کی نہیں بلکہ پوری ڈویژن فوج کی کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے گولان کی پہاڑیوں پر شام اسرائیل جنگ کی مثال موجود ہے جہاں شام کو تین ہزار سے بھی کم بلندی پر پہنچنا تھا اور جہاں بکتر بند کے کھلے استعمال کے لئے بھی کافی جگہ تھی (1973ء کی یوم کپور مہم میں تین بکتر اور دو مشینی ڈویژن تھے) اسے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور حملہ آور اور دفاع کرنے والوں کا تناسب یکسر مختلف تھا۔ مزید یہاں کچھ دیگر عوامل بھی تھے مثلاً اسرائیلی بہتر طور پر تربیت یافتہ تھے ان کی ضربی قوت اچھی تھی، ساتھ ہی ان کی خفیہ اور فضائی قوت وغیرہ بہتر تھیں لیکن بڑا مسئلہ یہی تھا کہ شام کو پہاڑی پر حملہ کرنا تھا۔

مقامی علاقہ وخطہ کے بارے میں معلومات کا نہ ہونا بھی ایک مسئلہ ہے۔ پنجاب جیسے ایک بالکل میدانی علاقہ میں بھی سڑکوں، نہروں، پلوں، بندوں، کھائیوں، جنگلوں، دیہاتوں، فیکٹریوں وغیرہ کے بارے میں پوری معلومات نہ ہونے کی صورت میں پیش قدمی متاثر ہو سکتی ہے۔ پہاڑوں میں صورت حال اور بھی خراب ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک سادہ سی مثال کافی ہے۔ شملہ میں میرے فلیٹ کے بالکل نیچے تقریباً ڈھائی مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا پرندوں کا ایک چھوٹا سا جنگل ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو چشمہ کی وادی کے آدھے اوپری حصہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس کے راستوں اور گزرگاہوں کا نقشہ تیار کرنے کے بھی کم از کم 110 افراد دو دن اور دو راتوں کی محنت سے کریں گے کیونکہ رات کو ہر چیز ویسے ہی مختلف نظر آتی ہے۔ یہاں ایسی جگہیں ہیں جہاں صرف 10 مقامی آدمی 24 گھنٹے تک باہر سے 100 آنے والوں کو روک سکتے ہیں اور اگر دفاع کرنے والا سڑک کی چوٹی پر ہے جو تقریباً ھد و کلومیٹر لمبی ہے تو پھر اس کے پاس حملہ آور کے مقابلے میں بہت زیادہ نقل وحرکت کی گنجائش بہتر مورچے کی سہولت حاصل ہے کیونکہ حملہ آور کو وادی کے درمیان پانچ کلومیٹر راستے پر دھکے کھانے ہوں گے جو کبھی پہاڑیوں کے اندر اور کبھی وادی میں نکلتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ 100 آدمی ایک دن میں اپنا کام کر لیں گے لیکن اس سے پہلے انہیں دفاع کرنے والوں سے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا اور ساتھ ہی وقت بھی ضائع ہوگا۔ شملہ جیسے ایک لاکھ کی آبادی والے شہر میں یہ مشکوک ہے کہ 120 افراد بھی اس چھوٹے علاقہ سے اپنا راستہ بنا لیں گے، اگر ایک باہر کے آدمی کو اندر کے کسی آدمی سے امداد بھی جائے تو وہ اس کی راہنمائی میں موثر نہیں ہو سکتا۔ یہاں پھر وقت ہی فیصلہ کن چیز ہے کیونکہ

وقت بڑی بٹالینوں کے ساتھ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر ہم زور دیتے رہے ہیں۔ شمالی علاقوں کی مہم کے لئے وقت کی ضرورت تھی اور یہ صرف وقت ہی تھا جو بھارتی فوج دینے سے انکاری تھی۔

بھارت جوں جوں شمالی علاقوں میں مزید اندر پہنچتا جائے گا اس کے لئے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جائیں گے۔ بھارتی فوجی سارے باقاعدہ باہر سے آئے ہوئے فوجی ہوں گے جبکہ بھارت کی پیش قدمی روکنے یا اسے سست کرنے والے مقامی ہلکی شمالی انفنٹری کے ریکروٹ ہوں گے۔ دفاع کرنے والے کو بہت سے فوائد ہوتے ہیں لیکن پہاڑی خطہ میں جغرافیائی فائدہ سب سے بڑا فائدہ ہے۔

نقل وحرکت

پہاڑوں میں کارروائی کرنے والے ایک بھارتی پیدل ڈویژن کو حملہ کی کارروائی کے لئے روزانہ تقریباً دو سے تین ٹن وزنی ساز وسامان کی ضرورت پڑے گی۔ تقریباً دو ہزار مختلف سائز کی گاڑیاں ڈویژن اور کور کے ذرائع نقل وحمل کے لئے استعمال ہوں گی۔ وہ سڑک جو ڈویژن نے استعمال کرنی ہے گو کہ وادی سے گزرے گی لیکن اس نے بے شمار چھوٹے پلوں، موڑوں وغیرہ کو ہر کلومیٹر اور ہر دس کلومیٹر کے لئے بڑے پل کو عبور کرنا ہوگا۔ دفاع کرنے والا پسپا ہوتے وقت ہر ایک آبی راستے یا دوسری گزرگاہ کو تباہ کر دے گا جس کے پل وغیرہ تعمیر کرنے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر ساز وسامان اور انجینئروں کی ضرورت پڑے گی۔ اس کی بہترین مثال 1947ء کی جنگ اپونچھ راجوڑی سڑک کی تاریخ ہے۔ اس میں کئی ماہ لگے تھے کیونکہ دوسری وجوہات کے ساتھ یہ تھا کہ حملہ آوروں نے تمام اہم پلوں کو اڑا دیا تھا۔

(آج جارح بھارت کے پاس بہت زیادہ وسائل ہیں لیکن جس فاصلہ تک ہم نے یاں استعمال کرنی ہیں اور دفاع کرنے والی کی صلاحیتیں پہلے کی نسبت بڑھ گئی ہیں۔)

پلوں کے مسائل ایک طرف، کسی گاڑی کے رُک جانے سے ٹریفک جام کا بھی مسئلہ ہوگا، دو ہزار گاڑیوں کے جنگ کی حالت میں ہونے سے محتاط طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے باوجود اچھی حالت و دیکھ بھال کے روزانہ ایک سے دو سو کے درمیان گاڑیاں ضرور خراب ہوں میدانی سڑکوں میں ان کی وجہ سے کم دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، کیونکہ سڑک کی اطراف کھیتوں

وغیرہ سے ٹریفک کو نکالا جا سکتا ہے اور ٹریفک چلتی رہتی ہے جن تک گاڑی اٹھانے اور درست کرنے والے پہنچ جاتے ہیں، اس کے برعکس پہاڑوں میں صرف ملبے کو ہٹانے میں پہلے گھنٹوں صرف ہو جاتے ہیں، یقیناً ہمیں پہلے گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے دھکیل دینے کی پالیسی اختیار کرنی چاہئے لیکن اس میں بھی وقت لگتا ہے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ موسم گرما جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں نرم نہیں ہے۔ یہ آپریشن برف گرنے کے موسم میں ہو رہا ہے اور جبکہ سڑکیں گرتی اور جمی ہوئی برف سے ڈھکی ہیں اور برفانی ہواؤں کی بنا پر درجہ حرارت نقطہ انجماد سے 40 سنٹی گریڈ یا نیچے ہے اور جبکہ سلیقے سے کام کرنے والے اوزار بھی تکلیف دہ لگتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے مناسب روشنی اور اس سے بھی کم جب آپ وادی کے اندرون یا پہاڑوں کی دوسری طرف ہوں۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا مناسب ہوگا کہ بھارت اور خاپیلو کے درمیان کوئی باقاعدہ سڑک نہیں ہے اور خاپیلو اور سکردو کے درمیان بھی سڑک کہیں جیپ اور کہیں ٹرک چلنے کے قابل ہے۔

پاکستانی فوج اس راستہ پر ہلکے ٹرک استعمال کرتی ہے، زمانہ امن میں یا کبھی کبھی لڑائی کے خطرہ میں چند بٹالین فوج کو خاپیلو میں امداد بہم پہنچانا اور بات ہے جبکہ ایک پورے ڈویژن کو دشمن کے سامنے سے اس سڑک کے راستے امداد پہنچانا بالکل مختلف صورت ہے۔

اسی طرح کارگل سے سکردو تک ایک ناہموار سڑک کے ذریعہ ایک پورے ڈویژن کو امداد دینا بہت دشوار کام ہوگا۔ یہ کہا جا سکتا ہے لیکن ہمیشہ کی طرح مناسب وقت بہم ہونے کی صورت میں۔

ہیلی کاپٹر

کیا بھارت کی ہیلی کاپٹروں سے افواج منتقل کرنے کی اچھی خاصی صلاحیت پیش قدمی میں تیزی پیدا کرنے کے لئے کوئی اہم فرق پیدا کر سکتی ہے؟ اس کے لئے یہ یاد رکھیں کہ ہم موسم سرما کی مہم جوئی کے بارے میں دلائل دے رہے ہیں۔ ایسے میں کچھ دن ایسے ہوں گے جب زیادہ بلندی پر جانا ممکن نہیں ہوگا اور بہت کم ہیلی کاپٹر پروازیں ہو سکیں گی اوپر ہر وقت ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور خاص کر صبح گیارہ بجے کے بعد تو موسم اور بھی خراب ہو جاتا ہے جب پرواز خاص طور پر بہت زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے، ان حالات میں یا تو ہم تیزی سے اپنے ہیلی کاپٹر ضائع کر لیں گے یا پھر بہت کم امدادی پروازیں بھیج سکیں گے۔

ایک اور دشواری ہیلی کاپٹروں کی پاکستانی کندھے پر رکھ کر چلائے جانے والے ایس اے ایم میزائلوں کے سامنے کمزوری کی بنا پر سامنے آئے گی۔ روایتی جنگوں میں عام طور پر محدود مشن پر ہیلی کاپٹر محاذ جنگ کے پچھلے حصہ میں امداد فراہم کرتے ہیں۔ (یا اپنے فوجیوں کی اگلی لائن کے پیچھے جیسا کہ آج کل امریکہ میں FEBA کہلاتا ہے) اس سے ہر قسم کے SAM میزائل سے کم خطرہ رہتا ہے۔

اگر مشن FEBA سے آگے کیا جانا مطلب ہے مثلاً دیکھ بھال یا بھاری حملہ اور سکاؤٹ ہیلی کاپٹر سطح زمین کے ساتھ اڑیں اس قسم کی اڑانیں بہت مخصوص اور خاص تربیت یافتہ ہوتی ہیں اور ان کا سنٹرل یورپ میں کیا جانا تو ایک بات لیکن ایسا ہمالیہ کے بلند پہاڑوں کو سر کرنا بالکل مختلف ہے۔ دشمن کی موجودگی اور نشانہ پر ہو کر بغیر کلی فضائی دسترس اور بڑی تعداد میں ہیلی کاپٹروں کے بغیر متحرک ہوائی حملہ کر کے آگے بڑھنا اور امداد فراہم کرنا ناممکن ہے، شمالی علاقوں کے حالات میں یہ ناممکن ثابت ہوگا، اس قسم کی صورت میں میدان جنگ مساموں بھرے جسم کی طرح ہوگا جہاں کوئی FEBA نہیں ہوگی۔ دونوں طرف چھوٹے یونٹ لیڈر اپنی اصل فوج سے آگے گھس جائیں گے۔ پاکستان اپنی کچھ فوجیں پیچھے چھوڑے گا اور کچھ پروازیں غیر متوقع اطراف سے بھیج کر FEBA کے پیچھے قوت کو مختصر عرصوں کے لئے قائم کرے گا۔ SAM میزائلوں کی دو ٹیمیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر چھپ کر بھارتی ہیلی کاپٹروں کو آسانی سے نشانہ بنا سکتی ہیں۔

ہمارے پاس اتنے ہیلی کاپٹر نہیں کہ پندرہ بیس سے زیادہ کا نقصان برداشت کر سکیں۔ خراب موسم، پہاڑی پرواز مسام دار میدان جنگ اور SAM سے مسلح دشمن کی موجودگی میں اگر ہم نقل و حمل کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہیلی کاپٹروں پر انحصار کریں تو ہم یقیناً دونوں میں پندرہ بیس سے زیادہ ہیلی کاپٹر ضائع کرا بیٹھیں گے۔

توانگ، سیلہ، بومڈیلہ

کیا 1962ء میں چینیوں نے ایک بہت ہی تیز پیش قدمی غالباً 150 کلومیٹر بہت قلیل عرصہ میں نہیں کی تھی؟ اور ان کے پاس پیش قدمی کرنے والی فوج کو رسد پہنچانے کے لئے ہیلی کاپٹر بھی نہیں تھے جیسا کہ ہمارے پاس ہیں۔ جی ہاں! پہاڑی دشواریوں کے حساب سے

چینیوں نے بہت تیزی سے پیش قدمی کی تھی لیکن جس دن انہوں نے توانگ پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا، اس کے دو ہفتے بعد یہ شہر انہوں نے ختم کیا۔ اس کے بعد سیلہ اور بومڈیلہ پر 11ویں اور 55ویں کے ساتھ حملہ کرنے سے پہلے انہیں شہر میں اپنے نقل و رسد کو مستحکم کرنے کے لئے تین ہفتے رکنا پڑا جس میں سیلہ سے توانگ تک ایک (تین ٹن کی گاڑیوں تک کے لئے) سڑک بھی شامل تھی، اس کے بعد انہوں نے تقریباً ایک ہفتے میں بھارت کو شکست دی، اس طرح تقریباً 150 کلومیٹر پیش قدمی کے لئے انہیں کل چھ ہفتے لگے یا ابتداء سے تین چار کلومیٹر روزانہ۔

یہ مانا کہ ان کے پاس ہیلی کاپٹر نہیں تھے لیکن اس وقت 80000 فوجیوں پر مشتمل ایک ڈویژن تقریباً 50 ٹن سامان روزانہ استعمال کرتا جو اس وقت کی بھارتی خرچ کا پانچواں حصہ ہوتا، بڑے پیمانے پر سپلائی وہاں ممکن نہ تھی۔

فی الواقع ہر صاحب اختیار یہ تسلیم کرتا ہے کہ اگر چین اپنے گھس بیٹھنے کی تراکیب سے بھارتیوں کو فوری پسپائی پر مجبور نہ کر دیا ہوتا اور یہ کہ اگر بھارتی اپنے مورچوں میں جمے رہتے تو چینی کبھی بھی اس قدر تیز پیش قدمی نہ کر سکتے۔ کتراتے ہوئے بڑھنے کی حکمت عملی کی دو اقسام ہیں:۔

1- حملہ آور مزاحمتی جتھوں کو تنہا کر کے ساتھ ہی آگے بڑھتا ہے اور ان جتھوں سے اپنی مرضی کے مطابق سلوک کرتا ہے۔

2- حملہ آور مزاحمتی کو دہشت زدہ کر دیتا ہے جو ڈر سے پسپا ہو کر پیچھے کی پوزیشن پر چلا جاتا ہے جہاں جا کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن وہاں اس کا انتظار کر رہا ہے، جس سے وہ خوف زدہ ہو کر مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی حد تک پیچھے پسپا ہو جاتا ہے۔

حملہ آور پہلے حملہ کے اثرات سے امید لگاتا ہے لیکن اسے دوسرے حملے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔ یہاں یہ دشواری ہے کہ اگر دفاع کرنے والا اپنی پوزیشن کو مستحکم رکھے تو وہ کسی بھی وقت جارح کی پیش قدمی کو کاٹ کر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اس لئے جارح اپنے مزاحمتی جتھے اگر وہ بڑے اور بغیر تحفظ کے ہوں، پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔ پہاڑوں میں زیر دفاع علاقوں کو کم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ دفاع پر معمور قوت عام طور پر اونچائی پر اپنے آپ کو بہترین حالت میں مورچہ بند کرتی ہے جہاں سے وہ میلوں دور آگے پیچھے دشمن کا جائزہ لے سکتی ہے اور اس پر اپنی مرضی سے فائرنگ کر سکتی ہے، جارح (حملہ آور) کو پہلے جمع ہونا چاہئے اور پھر پہاڑی پر حملہ کرنا

چاہئے۔ یہ ہی وہ دشواری ہے جس کی بنا پر 1965ء اور 1971ء دونوں مختصر جنگوں میں کشمیر میں بھارت یا پاکستان کوئی نمایاں کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اب یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نہ تو اب 1987ء کے بھارتی 1962ء کے چینیوں کے مماثل ہیں نہ ہی 1987ء کا پاکستان بھارت کے 1962ء جیسا چین کا گھس جانے کا فن یا حکمت عملی دراصل ان فوجوں کا مخصوص طریقہ کار ہے جو خصوصیت سے گوریلا تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ آپ ایک تربیت یافتہ فوج کا ایک لائن میں مقابلہ نہیں کر سکتے جیسا کہ بھارت یا پاکستان میں ہے اور اس طرح انہیں گھس بیٹھنے کی حکمت عملی اپنانے پر پابند کر سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ متحرک جنگ کی حکمت عملی کے بارے میں چاہے کچھ کہا جاتا رہے، بھارت نے بنگلہ دیش میں اس میں کامیابی پائی لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ سب خاص ترین حالات میں ہوا تھا اور ایسا کام پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں کبھی نہیں کیا جا سکتا، بلاشبہ بھارتی پاکستان کی محفوظ پوزیشنوں میں کسی حد تک پیش قدمی کر لیں گے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس سے پاکستانی مورچوں میں سراسیمگی پھیل جائے لیکن ایک پاک بھارت جنگ میں محض اس مفروضے پر تکیہ کر کے اپنی پوری مہم جوئی کو ترتیب دینا بالکل بے مقصد اور بیکار ہوگا۔

یہ یاد رکھیں کہ اگر ایسا ہوا تو تین چار میل روزانہ پیش قدمی بہتر رہے گی تاکہ ہم بہر حال 90 دن میں گلگت اور 30 دن میں سکردو پہنچ جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے اور پاکستان عام طور پر اپنی جگہ مضبوطی سے جما رہے تو پھر کارکردگی بہت سست رہے گی تا آنکہ ہم دفاعی فوج کو اتنا زچ کریں کہ ہم اس پر برتری حاصل کر لیں۔ (دشمن کے عزائم کا اندازہ فرمائیں)

پاکستانی کمک کی دشواریاں

شمالی علاقوں میں پاکستان کے چار کے مقابلے میں بھارت کے سات یا آٹھ بریگیڈوں کی مجموعی قوت عام حالات میں کچھ ہفتوں کی جنگ کے بعد فتح دلانے کے لئے کافی ہے لیکن اس کا کیا ہوگا کہ اگر ہر طرف بھارتی پیش قدمی کو ایک کے بجائے دو بریگیڈوں کا سامنا کرنا پڑ گیا؟ ایسی صورت میں بھارت کے دو بریگیڈ ہمراہ ایک فاضل بریگیڈ اور گوریلوں سے بھی ایک بریگیڈ..... یقیناً کافی نہ ہوں گے پاکستان نے Trident مشن شروع ہونے کی تاریخ سے قبل سکردو میں کم از کم دو اور غالباً بریگیڈ فوج کی کمک پہنچا دی تھی، اگر ہم یہ فرض کریں کہ سکردو میں دو بریگیڈ آئے اور استور (گلگت اور درہ برزیل کے درمیان) ایک بریگیڈ تو توازن قطعی طور پر

ہمارے خلاف ہوجاتا ہے، ایسے میں یہ صورت بنتی:

شائک لائن	بھارت تین بریگیڈ	پاکستان دو بریگیڈ
سندھ لائن	ایضاً	
استور لائن	ایک کے مقابل ایک بریگیڈ	

فوری ریزور

پاکستان دو بریگیڈ

بھارت ریزور 15ویں اور 16ویں کور سے تین یا زیادہ بریگیڈ

کوئی بھی یہ ظاہر نہیں کرسکتا کہ ان حالات میں فوری فتح ممکن تھی۔ درحقیقت ایسے میں بھارت کو فیصلہ کن شکست ہوجاتی۔ (بحوالہ صفحہ 60 تا 120 The war that never was)

روی ریکھی نے 1988ء میں حملے اور ڈیفنس کی جو تفصیلات لکھی ہیں، تھوڑے فرق سے صورتحال آج بھی وہی ہے، فرق یہ پڑا ہے کہ دشمن کے عزائم وہی اور مضبوط ہوئے ہیں جبکہ ہم آپس میں گتھم گتھا ساری دنیا کے سامنے تماشا بن کر رہ گئے ہیں۔

O

آبی جارحیت اور ایٹمی بلیک میلنگ

1965ء میں بھارت نے بغیر اطلاع، اندھیرے میں چوروں کی طرح پاکستان پر لہ کر دیا۔ قدرت اس وقت مدد کو آئی، بے سروسامان پاکستان نے آٹھ گنا بڑی فوج کو ذلت میز شکست سے دو چار کیا، شاستری جی کو اقوام متحدہ میں جا کر دہائی دینا پڑی تھی۔ تاشقند ناہدے میں کامیابی پر موصوف کو وہ خوشی ہوئی کہ وہیں پر لوک سدھار گئے۔ بھارتی قیادت کا رف بھی اتنا ہی ہے۔ پھر 1971ء میں سقوط مشرقی پاکستان پر اندرا گاندھی کا بیان تو تاریخ کا مہ بن چکا ہے کہ آج دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق ہوگیا ہے۔ یہ بیان دراصل دو قومی نظریے لے خلاف ہی نہیں تھا، جس کی بنیاد پر پاکستان بنا بلکہ خود پاکستان کے وجود کے خلاف بھارتی لیڈر پ کے دل میں موجود بدترین بغض وعناد کا اظہار تھا جس کو صاف الفاظ میں ''خبث باطن'' کے اوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ 90 ہزار جنگی قیدیوں اور وہاں نظریہ پاکستان کے علمبرداروں لے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک الگ اور بھیانک باب ہے۔ 1971ء کے اس بدترین سانحے کے بعد ج 2009ء میں 37 سال کے دوران علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر کہیں بھی ایسا ایک بھی واقعہ یکارڈ پر مائیکرو اسکوپ سے بھی تلاش نہیں کیا جاسکتا، جب بھارت نے پاکستان کی مخالفت کرنے راسے نقصان پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے دیا ہو۔ خود بھارت میں اب تک ہونے لے پانچ ہزار کے لگ بھگ مسلم کش فسادات ان میں مسلمانوں کی شہادتیں تباہی بربادی اپنی جگہ سلسلے میں بجائے خود مکمل ثبوت ہے۔ امن کے پجاری بھارت نے مئی 1974ء میں پاکستان ماعین سرحد پر ایٹمی دھماکہ کرکے نہ صرف پاکستان کو ایک سنگین نوعیت کی دھمکی دی تھی بلکہ لستان کی سرحدی پٹی کو بھی ایٹمی تابکاری سے بدترین طریقے سے آلودہ کردیا تھا۔ سارا بھارت وڑ کر صرف اُس خطے کا انتخاب بھارتی قیادت کی بدنیتی اور خباثت باطنی کو عیاں کرنے کے لئے

کافی ہے۔ باقی معاملات میں ہم صرف بگلیہار ڈیم و کشمیر اور حالیہ بھارتی بجٹ کے حوالے سے کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ بھارت نے مذاکرات کے جال اور پھندے پھیلا پھیلا کر بگلیہار ڈیم تقریباً 90 فیصد مکمل کرلیا ہے اور مزید چار ڈیموں کے لئے نہ صرف فنڈز جاری کر دیئے ہیں بلکہ ان پر کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

ان میں ہر ڈیم سے پاکستان کا صرف 25 فیصد پانی بھی روکا گیا تو آئندہ چار پانچ برسوں کے اندر جب یہ سارے ڈیم مکمل ہو جائیں گے تو پاکستان کا کشمیر کی طرف سے آنے والا سو فیصد پانی بھارت روک لے گا اور کسی وقت اچانک بہت زیادہ پانی چھوڑ کر پاکستان کو دلدل میں تبدیل کر دے گا، یہاں سوال یہ بھی ہے کہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر جیسی چھوٹی جگہ میں تیس سے زائد ڈیم کیوں بنا رکھے ہیں؟ اور یہ مزید ڈیم کیوں بنائے جا رہے ہیں، یاد رکھنا چاہئے کہ بھارت اب پاکستان پر اسلحے سے حملہ شاید ہی کرے، اب بھارت پاکستان کو پیاسا مارنے کے منصوبے کام کر رہا ہے۔ یہ ڈیم اس کا کھلا اور مستحکم ثبوت ہیں۔ بھارت میں اس وقت چالیس کے لگ بھگ اسلحہ ساز فیکٹریاں دن رات آتش و آہن اگل رہی ہیں، یہ اسلحہ کے پہاڑ کس کے خلاف کھڑے کئے جا رہے ہیں؟ بھارت کے پاس اس وقت کم از کم چار نیوکلیئر آبدوزیں ہیں اور وہ کم از کم چھ مزید ایسی ہی نیوکلیئر آبدوزوں کے حصول کے لئے کوشاں بھی ہے، ایک اور اطلاع کے مطابق بھارت میں نیوکلیئر آبدوزوں کی تیاری کے لئے بھی دوڑ دھوپ شروع کر دی گئی ہے جبکہ پاکستان کے پاس ایک بھی نیوکلیئر آبدوز نہیں ہے۔ طیارہ بردار جہازوں کے حوالے سے بھی پاکستان کے پاس کوئی طیارہ بردار جہاز نہیں ہے اور حالیہ بھارتی بجٹ جس کو تفصیل سے عالمی میڈیا شائع اور نشر کر چکا ہے بھارتی وزیراعظم کی جانب سے امن، محبت، دوستی کے تمام دعوؤں کے بجائے خود ایک بہت بڑا سوالنامہ ہے کہ یہ گولہ بارود آخر کس کے خلاف اکٹھا کیا جا رہا ہے؟

بھارت کے 88 کروڑ سے زائد ننگے بھوکے عوام کے منہ سے نوالے چھین کر اور تن سے لنگوٹی اتار کر بھارتی لیڈر شپ اندھا دھند اسلحہ خرید کر جو گودام بھر رہی ہے وہ دنیا کے سامنے اہنسا کے پجاری بھارت کی کس قسم کی تصویر پیش کر رہے ہیں؟ رہ گیا کشمیر کا مسئلہ تو ایک لاکھ بے گناہ کشمیریوں کے خون سے غسل کرنے کے بعد بھی بھارتی لیڈر شپ جس میں من موہن سنگھ کا نام سب سے اوپر ہے، پاکستان اور مسلمانوں سے اظہار محبت کرے تو اس سے بڑا جھوٹ ابلیس بھی نہیں بول سکتا۔ یہ سب باتیں اپنی وضاحت آپ کر رہی ہیں کہ ان سب کارروائیوں، اقدام، گول

دے کے پہاڑ کھڑے کرنے کا مقصد صرف اور صرف پاکستان کی تباہی و بربادی ہے۔ اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ من موہن سنگھ سمیت پوری کی پوری بھارتی قیادت کی باتوں پر تو خود بھارت سنجیدہ حلقے یقین نہیں کر سکتے، پاکستان کے عوام کیونکر یقین کر لیں گے کہ ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا تو بھارت کے بس کی بات بھی نہیں۔

پاکستانی چینلز کی پیداوار بزعم خود کچھ دانشور اہل قلم آجکل ہاتھ دھو کر پاکستانی ایٹم بم کے پیچھے پڑے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اس بم نے ہی ہمارے لئے تمام مسائل کھڑے کئے ہیں۔ اس پر تو بہت بحث ہوگئی ہے کہ اگر یہ بم کا ڈیٹرنٹ ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو آج ہم کہاں کھڑے ہوتے۔

O

2006ء میں امریکی صحافی دی نیویارکر کے اسٹیو پول کی کتاب The Stand O نے عالمی شہرت حاصل کی اور آج بھی اس کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ ہمارے ان نام نہاد شوروں کے لئے اس کتاب کی تیسرے اور چوتھے باب کی تلخیص پیش خدمت ہے۔

''آرمیٹیج بھارت گئے اور نئی دہلی میں پہلے واجپائی اور بعد ازاں کابینہ کمیٹی برائے امتی کے اراکین سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں۔ اس میں انہوں نے زور دیتے ہوئے کہ کہ صدر مشرف نے میرے ذریعے صدر بش سے وعدہ کیا ہے کہ پاکستان کشمیر میں سرگرم جہادیوں کا ع قمع کر دے گا اور مجھے ان پر پورا یقین ہے''۔ بقول مشرا، بھارتی قیادت، آرمیٹیج کی اس یقین انی کو ایک سنجیدہ عہد کی صورت میں تسلیم کرنے کو تیار ہوگئی۔ اگرچہ اس میں کوئی گارنٹی بھی نہیں ل۔ انہوں نے کہا ''آرمیٹیج کے تاثرات کو ہم نے دراصل صدر جنرل مشرف کے اس پیغام کے رے میں لیا جو بظاہر انہوں نے آرمیٹیج کے ذریعے ہمیں منتقل کیا اور یہ پاکستان کی کشمیر کے سلسلے ما پالیسی کی بہت بڑی تبدیلی قرار دی جا سکتی ہے''۔

آرمیٹیج چاہتے تھے کہ بھارت وہ اقدام کرے جس سے صدر مشرف بھی جان سکیں کہ ان کم ہو رہا ہے۔ بلیک ویل کی رہائش گاہ پر بھارت کے وزیر دفاع جارج فرنانڈس کے ساتھ ثنائیہ کے بعد بھارتی حکام نے کہا کہ ایسا دکھانے کے لئے وہ اپنے چند بحری جہاز پاکستان کی حد سے دور لے جائے گا اور کولن پاول صدر جنرل مشرف کو یہ خوش کن پیغام پہنچائیں گے کہ ارت بھی مثبت جواب دے رہا ہے۔ دریں اثناء سیکرٹری ڈیفنس رمزفیلڈ نے بھی اس صورت

حال میں مزید بہتری لانے کے لئے نئی دہلی اور اسلام آباد کے دورے کا شیڈول طے کر دیا۔

''مئی میں ہم تقریباً جنگ کی صورت حال پر پہنچ چکے تھے''۔ مشرا نے مجھے بتایا ''لیکن وزیراعظم واجپائی کے سامنے جب بالکل آخری مرحلہ آیا تو انہوں نے کہا کہ میں اپنے طویل ترین سیاسی کیریئر کے اختتام پر خود کو امن کے پیامبر کی حیثیت سے زندہ جاوید رکھنا چاہتا ہوں اس لئے جنگ کر کے نوع انسانی کو تباہ و برباد کرنے کی تاریخ اپنے نام سے رقم نہیں کر سکتا''۔ واجپائی کا یہ فیصلہ بہت سے پاکستانی جرنیلوں کے لئے سبق کی حیثیت رکھتا تھا، جس کا واضح مقصد ''جوہری ہتھیاروں کا عدم پھیلاؤ'' تصور کیا جا سکتا ہے۔ ادھر ایک پاکستانی جنرل نے مجھے بتایا کہ ''فرض کریں کہ 2002ء میں اگر پاکستان جوہری قوت کا حامل نہ ہوتا تو میرے خیال میں جنگ چھڑ جاتی۔ میں نے البتہ اس بحران سے واحد سبق جو لیا وہ یہ ہے کہ ''جوہری ہتھیاروں کی موجودگی اور اس کا اعلان ہمارے لئے ہرگز بُرا خیال نہیں ہے''۔

پاکستانی فوج کا ''اسٹریٹیجک پلانز ڈویژن'' ہی وہ ادارہ ہے جو ملک کے جوہری ہتھیاروں کے نظام کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کا صدر مقام چکلالہ کے فوجی مرکز میں رہائشی کالونی کے اندر پھولوں کی کیاریوں، خوش نما لانز اور محض سفیدی سے مرصع بنگلوں کے درمیان ایک کمپاؤنڈ میں واقع ہے۔ دراصل پاکستان کے جنوبی شہر راولپنڈی کا خالص فوجی علاقہ ہے جو خود ایک چھوٹے سے شہر کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جہاں ہر طرف شہری زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ ٹریفک جام، ہریالی اور مختلف خاندانوں کی تفریح طبع کے مناظر ہر سو نظر آتے ہیں۔ یہ ڈویژن جوائنٹ اسٹاف ہیڈکوارٹر سے پارگلی میں واقع ہے جہاں اس کی نگرانی پاکستان کے خفیہ طیارے کرتے ہیں جو، لان سے بھی نظر آتے ہیں۔

لیفٹیننٹ جنرل خالد قدوائی جو ایک سابق آرٹلری آفیسر ہیں، اسٹریٹیجک پلانز ڈویژن کی کمانڈ سنبھالتے ہیں۔ وہ 2000ء میں اس کے قیام کے وقت ہی سے ابھی تک نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ فیروز خان اور دیگر جرنیلوں کے مطابق اس ڈویژن کی ذمہ داری میں جوہری پروگرام کی تیاری کے مراحل سے لے کر بتدریج ترقی تک مکمل کنٹرول کرنا تھا لیکن اس کے کنٹرول کی خامیوں کے بارے میں 2001-2002ء کے سیاق و سباق نے سراسیمگی پھیلا دی اب اگرچہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جوہری جنگ کا بحران کسی حد تک ٹل چکا ہے لیکن بش انتظامیہ کے نزدیک پاکستان کے جوہری پروگرام کی خامیوں کے بارے میں خدشات کے

میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

اسٹریٹیجک پلانز اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ پاکستان آرمی کے جنرل ہیڈکوارٹر کا ہی ایک خفیہ سیکشن ہے جو 1990ء کی دہائی کے اوائل میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ شعبہ دیگر سرکاری ایجنسیوں بشمول پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور خان ریسرچ لیبارٹری کے سربراہ عبدالقدیر خان تھے۔ فیروز خان کے مطابق 1999ء کے موسم بہار میں اسٹریٹیجک پلانز ڈویژن کی تشکیل کے وقت وزیراعظم میاں نواز شریف نے مذکورہ ڈویژن کو تینوں مسلح افواج آرمی، ایئر فورس اور نیوی کے سینئر افسران پر مشتمل ایک مشترکہ ٹیم کے تحت چلانے کی منظوری دی تھی۔ اس ڈویژن کو کم از کم کاغذ کی حد تک دیئے گئے اختیارات میں پاکستان کے جوہری پروگرام کے تمام جزو ترکیب کی دیکھ بھال کرنا شامل تھا۔

اس ڈویژن کے دو ڈائریکٹوریٹ ہیں جس میں سے ایک کے ذمہ سیکورٹی کا کام وقف ہے جبکہ دوسرا ہتھیاروں کے کنٹرول سے متعلق امور کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ان ڈائریکٹوریٹ کی کمانڈ ایک جنرل کے پاس ہے جو جنرل قدوائی کو رپورٹ کرتے ہیں۔ حساس معاملات اور بعض اوقات پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کے پروگرام پر امریکہ کے ساتھ باہمی شک و شبہ کے معاملات کے درمیان جنرل قدوائی اور ان کا سینئر اسٹاف رابطے کا اہم ترین مرکز بن گئے تھے۔ یہ لوگ جب امریکی وفود سے ملاقات کرتے تو اجلاس میں باقاعدہ شریک ہونے والے افراد کے بقول ان اجلاسوں میں خفیہ اور حساس اسلحہ سے متعلق اتنی عمدہ بریفنگ دیتے جسے عجیب و غریب کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اگرچہ یہ سب بریفنگ انہیں پاکستانی جرنیلوں کی جانب سے کی گئی ہوتی تھی۔

''ہمارا مقصد دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ جوہری ہتھیاروں پر ہمارا کمانڈ اور کنٹرول نظام بالکل محفوظ ہے اور باقاعدہ ایک منظم ادارہ کے تحت کام کر رہا ہے''۔ یہ بات لیفٹیننٹ جنرل قدوائی نے ایک ریکارڈ کے مطابق جنوری 2001ء میں پینٹاگون کے اہلکاروں کے دورے کے موقع پر بات چیت کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا تھا ''ہمارے پروگرام میں کسی سانحہ کی گنجائش نہیں ہے اور نہ پروگرام کے اندر غیر مجاز کسی کے استعمال کا احتمال ہے اور نہ کسی بھی غیر متعلقہ افراد کو پروگرام تک رسائی کی اجازت ہے اور نہ ہی اس میں کسی اور طرح کا سقم یا خلا چھوڑا گیا ہے''۔

بہ نظر غائر مطالعہ کے بعد پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا جائے تو بظاہر لیفٹیننٹ جنرل

قدوائی غلطی پر تھے۔ عبدالقدیر خان کو ان کے ایٹمی کارنامے پر محسن پاکستان کا خطاب دیا گیا۔ وہ ایک قومی ہیرو تھے، جن کی عظیم الشان خودمختار لیبارٹری نے پاکستان کو ایک جوہری طاقت بنانے میں بے پناہ مدد دی۔ 2001ء کے اوائل میں برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس افسران کے مذریعے انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر خان کی ذاتی دولت میں بے شمار اضافہ ہو رہا ہے لیکن ان کی سرگرمیوں کے بارے میں تحقیقات ابھی تک نامکمل تھیں اور اس موقع پر بات کرتے ہوئے بش انتظامیہ کے پہلے دور کے ایک اہلکار نے مجھے بتایا کہ ''ہم نے ان کی انتقال دولت کے بعض حصوں کو بہ خوبی تلاش کر لیا تھا جب کہ ان میں سے بعض اب تک تشنہ تھے''۔ انٹیلی جینس کی رپورٹ سے یہ تو ظاہر ہوتا تھا کہ کون سی جوہری ٹیکنالوجی خان کو حاصل ہو رہی تھی، لیکن یہ نہیں پتا چلتا تھا کہ خان سے اسے کون حاصل کر رہا تھا۔ اس اہلکار نے مزید بتایا کہ ''گومگو کی کیفیت کچھ اس طرح تھی کہ اس کے علاوہ پاکستان میں اس بارے میں کون جانتا ہے کہ ڈاکٹر خان کیا کر رہے تھے اور کون ان سے یہ مواد حاصل کر رہا تھا''۔

امریکی حکام کے ایک مختصر حلقے کو جسے 2001ء میں ڈاکٹر خان سے متعلق آگاہ کیا گیا، اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یا تو دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ڈاکٹر خان کی سرگرمیوں کی خاموشی سے جانچ کی جائے تاکہ ان کے گاہکوں کے متعلق پتا چلایا جا سکے، یا پھر ان کے نیٹ ورک کے خلاف موثر کارروائی کر کے ان کے آپریشن کو فی الفور روک دیا جائے۔ چنانچہ صدر بش اور ان کے مشیران نے ابتدائی طور پر یہی طے کیا کہ تحقیقات کو مکمل کرنے کی غرض سے فی الحال نگرانی جاری رکھی جائے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اس وقت اور کسی موقع پر ایسا کوئی ثبوت حاصل نہیں ہو سکا جس سے پتہ چلتا کہ خان نے جوہری ٹیکنالوجی کو القاعدہ کے ہاتھوں فروخت کیا ہے۔ خان کی سرگرمیوں سے یہ تو ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسلام کے صد افتخار لبادے میں لالچی، انا پسند اور قوم پرست دکھائی دیتے ہیں لیکن القاعدہ کی مغربی ممالک کے خلاف مکمل جنگ کی انتہا پسند فلاسفی میں شریک ہوتے نظر نہیں آئے۔

افغانستان کی جنگ کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادی فوجیوں نے طالبان اور القاعدہ کی تلاش میں جس طرح آپریشن شروع کر رکھا تھا اسی تناظر میں سی آئی اے اور پینٹاگون اہلکاروں نے القاعدہ کے کیمپوں سے کچھ ایسے نقشے برآمد کئے جن کا سمجھنا بہت دشوار ثابت ہوا لیکن دکھائی ایسا دیتا تھا کہ یہ نقشے خاص قسم کی تیاری کے بارے میں اور ممکنہ طور پر جوہری اسلحہ کے بارے میں

سکتے ہیں۔ اسی اثناء میں سی آئی اے کو یہ بھی معلوم ہوا کہ درمیانے درجے کے دو جوہری سائنس ن افغانستان میں طالبان کے فلاحی کاموں میں ممد و معاون رہے ہیں۔ اگرچہ یہ سائنسدان کلیائی بم بنانے کی براہ راست تیاری کے سلسلے میں نہیں گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی معلومات اتنی رور تھیں کہ جس سے ایک خام ڈیوائس بنانے میں بھرپور مدد میسر آ سکتی تھی۔ پاکستانی حکومت کی انب سے مذکورہ دونوں سائنسدانوں کو حراست میں لینے کے بعد ان میں سے کم از کم ایک سائنس ان نے افغانستان میں اسامہ بن لادن سے ملاقات کا اقرار کیا لیکن وہ اپنے موقف پر مصر رہا کہ ں کی بات چیت افغانستان کے اندر محض رفاہی کاموں کے حوالے سے تھی۔ بن لادن نے کافی ہلے جوہری صلاحیت کے حصول کے لئے دلچسپی ظاہر کی تھی اور اس نے دشمنوں کو خوف زدہ کرنے ی غرض سے پاکستان کی جوہری صلاحیت کے حصول کے لئے بھی حوصلہ افزائی کی۔ سی آئی اے ور پینٹاگون ان مختلف شہادتوں سے یہ اندازہ لگاتے رہے کہ جوہری صلاحیت مکمل طور پر القاعدہ کے پاس پہنچی ہے یا جزوی پر انہیں اس ٹیکنالوجی کا حصول ہوا ہے۔ یہ خطرہ بہرکیف ان کے سر پر نڈلاتا رہا۔ فی الحال صرف اتنا کہا جا سکتا تھا کہ کہ اگر القاعدہ جوہری ہتھیاروں کو چلانے کی اہلیت کھنے کی پوزیشن میں ہوتی، تبھی وہ اس ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے کوشش کرتی۔

2001ء کے اواخر میں وہائٹ ہاؤس سے اگلے دروازے یعنی ایگزیکٹو آفس کی پرانی عمارت میں واقع کمرہ نمبر 208 میں جوہری ہتھیاروں کے ماہرین پر مشتمل ایک ایجنسی کی ذیلی یجنسی پاکستان کے جوہری پروگرام کی سیکورٹی سے متعلق حالات کا جائزہ لے رہی تھے۔ اس یجنسی کی قیادت نیشنل سیکورٹی کونسل کے سینئر ڈائریکٹر رابرٹ جوزف کر رہے تھے۔ اس معاملے پر اپنی جانچ کے حوالے سے انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ جنگ رونما ہونے کی صورت میں یا پھر جنگی نقل و حرکت کے دوران پاکستان کا پورا جوہری کمپلیکس بشمول استعدادی صلاحیت چوری ہو جانے یا پھر غلط استعمال کے عظیم خطرات سے دوچار ہے۔ کافی دقیق غور و خوض کے بعد ہمارا نظریہ پاکستانی جوہری کمپلیکس کے بارے میں یہ تھا کہ یہ حد درجہ اور نسبتاً نہایت موثر انداز میں حصار بند کئے گئے ہیں اور اس وقت جب تک کہ انہیں ''فل الرٹ'' اور استعمال کی نوبت نہ آ جائے سخت حفاظتی بندوبست میں رکھا گیا ہے۔ یہ بات مجھے خود بش انتظامیہ کے ایک ایسے سابق ذمہ دار نے بتائی جو روم نمبر 208 کے اس عمیق جائزہ میں شریک کار تھے۔

یہ اندازہ اس تشویشناک صورت حال میں قائم کیا گیا جب کہ پاکستانی فوج کے ایک

ایک ڈویژن کو ''ہائی الرٹ'' کی پوزیشن میں لایا جا چکا تھا۔ اس دوران ایسی رپورٹیں موصول ہو رہی تھیں جن میں کچھ متضاد بھی تھیں اور ان میں یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان ایٹم بم کے ممکنہ استعمال کی سرگرمیوں میں عملی طور پر تیاریاں کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ پاکستانی جرنیلوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے کوئی خاص اقدامات نہیں کئے تھے۔ پاکستان اور بھارت کا پچھلی نصف صدی میں جنگ وجدل کا جو کھیل چلا آ رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ دونوں طرف کیسی جنگی تیاریاں چل رہی ہوں گی۔

اسی اثناء میں نیشنل سیکورٹی کونسل کا انٹرایجنسی گروپ اس موضوع پر بحث کر رہا تھا کہ آیا امریکی حکومت پاکستان کی جوہری تنصیبات کی نگرانی کرنے کے لئے کوئی قانونی پیشکش کرے جس سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ چوری یا غلط استعمال کے خدشات میں حد درجہ کمی واقع ہو سکے گی۔ 1970ء میں این پی ٹی (Nuclear Non-Proliferation Treat) معرض وجود میں لایا گیا جن میں امریکہ، سوویت یونین (بعد ازاں روس) چین، برطانیہ اور فرانس جوہری ہتھیار رکھنے والے بااختیار ممالک کے نام شامل تھے۔ اس معاہدے کی رو سے ان ممالک کے علاوہ جوہری ہتھیار رکھنے کے متمنی دیگر تمام ممالک غیر قانونی تصور کئے جاتے تھے۔ اس کے مروجہ اصولوں پر امریکہ میں باقاعدہ قانون سازی کا ایک سلسلہ نافذ العمل ہو چکا ہے جس میں جوہری اسلحہ کے عدم پھیلاؤ کے اصول وضع کر دیئے گئے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ آئندہ معاملات کو پیش نظر رکھ کر انٹرایجنسی گروپ نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کئی محکموں کے سرکردہ قانون دانوں سے باقاعدہ گفت وشنید کی اور آخر کار گروپ اس نتیجے پر پہنچا کہ امریکہ عملی طور پر پاکستان کے اسٹریٹیجک پلانز ڈویژن کو یہ قانونی پیشکش کرے کہ وہ جوہری تابکاری کے سدباب کے بندوبست اور ہائی گریڈ افزودگی نیز نگراں راڈاروں تک امریکہ کو رسائی مہیا کرے۔ مثال کے طور پر ایٹم بم کو اس طرح قفل بند کرے جس سے اس کے استعمال پر مکمل کنٹرول حاصل ہو جائے۔ کولن پاول نے پاکستان کے جوہری پروگرام کی نگرانی اور تحفظ کی امریکی مدد سے متعلق پہلی پیشکش 2001ء کے موسم خزاں میں دی لیکن جنرل مشرف نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ یہ بات مجھے بش انتظامیہ کے پہلے دور کے مذکورہ اہلکار نے ہی بتائی۔ انہوں نے کہا کہ ''پاکستانیوں نے صرف اتنا ہی جواب دیا کہ ان تنصیبات کا مکمل کنٹرول انہی کے پاس رہے گا''۔

(The Stand Off مصنف اسٹیو پول تلخیص باب نمبر 4-3)

بلوچستان خفیہ ایجنسیوں کا گھناؤنا کھیل

جنرل پرویز مشرف نے 17 رجنوری 2006ء کو قوم سے اپنے خطاب کے دوران دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں ایف سی کی کارروائی کے حوالے سے بتایا کہ بلوچستان کے سردار اور وڈیرے غریب عوام کو کس طرح اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مجھے ان دنوں بلوچستان میں چند روز گزارنے کا موقع ملا۔ اس حوالے سے راقم نے اپنے مشاہدات ایک روزنامے میں تفصیل کے ساتھ تحریر بھی کر دیئے تھے..... 17 رجنوری کو صدر پرویز مشرف جب خطاب کر رہے تھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مذکورہ تحریر کو پڑھ رہے ہوں..... سچی بات یہ ہے کہ صدر مشرف نے جو کچھ کہا بلوچستان کے سرداروں اور وڈیروں کے مظالم کی داستان اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہے..... ان وڈیروں کی وجہ سے بلوچستان میں حالات روز بروز خراب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بلوچستان کا مسئلہ کوئی فوری طور پر کھڑا نہیں ہوا۔ اس کا ایک طویل پس منظر ہے..... بلوچستان کے عوام کسی سے کم محب وطن نہیں، ان کے دلوں میں بھی پاکستان سے محبت کا جو مزمہ اسی قدر بہہ رہا تھا جتنا پاکستان کے کسی بھی ٹھیکیدار کے دل میں ہو سکتا ہے لیکن بلوچستان کے گزشتہ کے دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ حکمرانوں کی ناقص پالیسیوں کے باعث محبت کا یہ زمزمہ اب دھیما پڑ رہا ہے، شکوک وشبہات جنم لے رہے ہیں شکوے اور شکایتیں بڑھ رہی ہیں اور اب وہ لوگ بھی مایوس ہوتے جا رہے ہیں جو بلوچستان کے قوم پرستوں کے خلاف طویل عرصہ سے پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں..... بلوچستان کے قوم پرست جو بلاشبہ جہاد افغانستان کے بعد اپنی موت آپ مر گئے تھے اور ان کے اپنے اہل خانہ بھی ان کی سیاست کے حامی نہیں رہے تھے، اب دوبارہ نہ صرف پر پُرزے نکال رہے ہیں بلکہ اب انہیں عوام الناس کے اندر پذیرائی بھی ملنا شروع ہو گئی

ہے، وہ بلوچ قبائل جو کل تک اپنے اپنے علاقوں اور گھروں تک محدود ہو گئے تھے، اب پھر منظم ہو رہے ہیں..... بلوچستان سے سینکڑوں میل دور بیٹھے ہمارے فوجی حکمران شاید اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ انہوں نے بلوچ عوام کو فتح کر لیا ہے اور بلوچ سردار ہتھیار ڈال کر ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان میں وفاقی حکومت کے آپریشن سے بلوچستان کے قوم پرست بڑی حکمت کے ساتھ وفاق کے خلاف نفرت کو پروان چڑھا رہے ہیں۔

اس وقت بلوچستان کے قوم پرست گو عددی لحاظ سے بہت ہی کم ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بھارت، امریکہ اور افغانستان ان قوم پرستوں کی سرپرستی اور پشت پناہی کر رہے ہیں اور ان کی یہ مشترکہ خواہش ہے کہ بلوچستان کے قوم پرستوں پر وفاق زیادہ سے زیادہ تشدد کرے تاکہ قوم پرست قبائل اور جماعتیں ردعمل کے طور پر تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کر دیں اور بلوچستان میں ایک بار پھر وہی کھیل دہرایا جائے جو مشرقی پاکستان میں کھیلا گیا تھا۔

بلوچستان میں جنرل مشرف کی وسیع تر قومی مفاد میں اختیار کی گئی پالیسیوں نے بلوچستان کے قوم پرستوں کو اس قدر جرات عطا کر دی کہ وہ فوج پر راکٹ برسا رہے ہیں اور سرعام پاکستان کو ایک بار پھر توڑ دینے کی باتیں کرنے لگی ہیں..... بلوچستان یوں تو عرصہ دراز سے ہی سلگ رہا ہے، جہاں حکومت کی ناقص پالیسیوں کے سبب قوم پرست عوام الناس کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں مگر حالیہ دنوں کے دوران میں حالات میں اچانک تلخی اس وقت پیدا ہوئی جب صدر جنرل پرویز مشرف پر کوہلو میں راکٹ برسائے گئے اور اس کے بعد دونوں طرف سے ہتھیاروں کا استعمال ہونے لگا جس میں اب تک کئی جانیں ضائع ہو چکی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر جنرل صاحب کے اردگرد راکٹ نہ گرتے تو شاید سرداروں، نوابوں اور وڈیروں کے ظلم تلے دبے ہوئے غریب بلوچ عوام برسوں تک ایسے ہی وڈیروں کے مظالم کا نشانہ بنے رہتے اور کوئی ان کا پرسان حال نہ ہوتا..... بلوچستان پاکستان کا انتہائی حساس صوبہ ہے جہاں ایک طرف قوم پرست اندر سے ملک و قوم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں جبکہ دوسری طرف غیر ملکی قوتیں ان کی سرپرستی کر رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ قوم پرست گزشتہ چند برسوں سے باقاعدہ مسلح بغاوت پر آمادہ ہیں، بدقسمتی سے افغانستان میں بھی ہماری حماقتوں کی وجہ سے ایک بار پھر ایسی حکومت برسر اقتدار ہے جو قوم پرستوں کو شہ دے رہی ہے۔ پاکستان کا دیرینہ دشمن بھارت بھی اس صورت حال سے فائدہ

اٹھانے کی پوری کوشش کر رہا ہے وہ کشمیر میں جاری تحریک آزادی کا بدلہ بلوچستان میں چکانا چاہتا ہے اور وہ در پردہ قوم پرستوں کی سرپرستی کر رہا ہے۔ یہ نام نہاد قوم پرست کون لوگ ہیں، ان کی طاقت کا راز کیا ہے اور ان کی سرپرستی کون سی قوتیں کر رہی ہیں، جب تک یہ حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی تب تک مسئلے کی جڑ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

بلوچستان کے قوم پرستوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں تین چار عشرے پیچھے جانا پڑے گا تب افغانستان میں ظاہر شاہ کی حکومت تھی اور داؤد خان نے روس کے اشاروں پر اس کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ جما لیا تھا..... داؤد خان نے اقتدار سنبھالتے ہی پختونستان کے قیام کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس میں پاکستان سے اجمل خٹک اور عبدالصمد اچکزئی شامل تھے..... یہ عبدالصمد اچکزئی، پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کے سربراہ محمود خان اچکزئی کے والد گرامی تھے اور اجمل خٹک، خان عبدالولی خان کے والد گرامی باچا خان کے دستِ راست..... اس وقت یہ لوگ پاکستان سے فرار ہو کر کابل گئے تھے اور وہاں سپنزر ہوٹل میں مقیم تھے کہ داؤد خان نے ان کو صدارتی محل میں بلا کر پختونستان کا نقشہ بتایا جس میں اٹک سے سبی تک کا علاقہ دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد سرحد اور بلوچستان سے ہزاروں افراد فرار ہو کر کابل جاتے اور آتے رہے جہاں روس اور بھارت کے انسٹرکٹران کو باقاعدہ مسلح جدوجہد کی تربیت دیتے تھے۔ اسی دوران میں مری قبائل کے ہزاروں افراد افغانستان گئے اور وہاں پاکستان دشمن حکومت کی میزبانی کے مزے لوٹتے رہے۔ خیر بخش مری بھی انہی دنوں فرار ہو کر افغانستان گئے اور 1991ء میں واپس لوٹے۔ یہی خیر بخش مری اور اس کا بیٹا بالاچ مری جو بلوچستان اسمبلی کا رکن بھی ہے آج حکومت کے لئے مصیبت بنا ہوا ہے۔ کوہلو کی تحصیل کاہان ان کا مرکز ہے جہاں اس باپ بیٹے نے دہشت گردی کے درجنوں کیمپ قائم کر رکھے ہیں..... نام نہاد بلوچستان لبریشن آرمی بھی خیر بخش مری اور اکبر بگٹی نے قائم کی جس میں تقریباً پندرہ سو افراد شامل ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو قتل اور ڈاکوں کی متعدد وارداتوں میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مطلوب ہیں۔ بلوچستان لبریشن آرمی BLA کا سربراہ اکبر بگٹی کا پوتا براہمداغ بگٹی ہے جبکہ خیر بخش مری کا بیٹا بالاچ مری بھی اس کا روح رواں ہے۔ BLA کے کیمپوں میں تربیت حاصل کرنے والوں یا پناہ لینے والوں کو مقامی لوگ فراری کہتے ہیں کیونکہ وہ فرار ہو کر ان کیمپوں میں چھپے ہوئے ہیں قوم پرست ان کو بلوچستان لبریشن آرمی کے سپاہی قرار دیتے ہیں جو پاکستان سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دراصل یہ قتل و غارت میں ملوث مجرموں

کا ایک گروہ ہے جو قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے ان کیمپوں میں پناہ گزین ہے۔

خیر بخش مری نے (حق توار) حق آواز کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنا رکھی ہے جو عوام الناس میں تو مقبول نہیں لیکن علاقے کے عام لوگوں پر اس کی دہشت قائم ہے۔ حق توار کا ایک اخبار روزنامہ ''توار'' کے نام سے مستونگ سے شائع ہو رہا ہے جس کی زبان کسی بھی طرح بھارت کے اخبار ''ہندو'' سے مختلف نہیں۔ خیر بخش مری اور نواب اکبر بگٹی اس وقت حکومے کو سب سے زیادہ بلیک میل کر رہے ہیں..... ڈیرہ بگٹی کے نواب اکبر بگٹی ایک طرف حکومت سے کروڑوں روپے کی مراعات لے رہے ہیں تو دوسری طرف حکومت کے خلاف مسلح بغاوت پر بھی آمادہ رہتے ہیں یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ نواب اکبر بگٹی کے تقریباً چار ہزار مسلح گارڈز کی تنخواہیں ایک گیس کمپنی ادا کر رہی ہے۔

بلوچستان کے نام نہاد قوم پرستوں نے اپنے اپنے علاقے میں اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے۔ سردار عطا اللہ مینگل کا گڑھ وڈھ اور دشت گوران ہے۔ نوشکی کے علاقے شکئی میں بھی ان کا اثر ورسوخ ہے..... اسی طرح محمود احمد خان اچکزئی نے افغان بارڈر کے قریب گلستان اور توبہ اچکزئی میں اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں..... سردار عطا اللہ مینگل اور محمود اچکزئی کے مسلح گارڈز کی تعداد بھی کم وبیش ایک ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے جنہیں یہ لوگ ماہانہ تنخواہ بھی دیتے ہیں اور ان کے قیام وطعام کے اخراجات بھی برداشت کرتے ہیں۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ ہے..... سوال یہ ہے کہ سب کچھ کہاں سے آ رہا ہے؟ اور کروڑوں روپے کے ماہانہ اخراجات کون ادا کر رہا ہے؟ اس پس منظر میں بلوچستان کی شر پسندوں کے خلاف کارروائی پر بھارت کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ حکومت پاکستان سے آپریشن بند کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ ان قوم پرستوں کی سرپرستی کون کر رہا ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں..... بلوچستان کے یہ قوم پرست اپنے علاقے کے عوام پر کیا کیا مظالم ڈھا رہے ہیں ان کی تفصیلات کے یہ صفحات متحمل نہیں ہو سکتے۔ محض بر سبیل تذکرہ یہ جان لینا کافی ہوگا کہ ان نوابوں اور سرداروں نے اپنے نجی قید خانے بنا رکھے ہیں۔ جب تک وہ بھاری تاوان ادا نہیں کرتے ان کو سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ان ٹارچر سیلوں میں وہ اپنے مخالفین کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، اس کو بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں صرف یہی بتا دینا ہی کافی ہے کہ نواب اکبر بگٹی نے چند ماہ قبل اپنے مخالفین کی چند خواتین کو زندہ جلا ڈالا تھا۔

قوم پرستوں کے یہ رہنما اکبر بگٹی، خیر بخش مری، محمود خان اچکزئی اور سردار عطاء اللہ خان مینگل ایک طرف سیاسی جماعتیں چلا رہے ہیں، دوسری جانب انہیں سیاسی جماعتوں کی چھتری تلے انہوں نے دہشت گردی اور تخریب کاری کے سینکڑوں کیمپ کاہان، ڈیرہ بگٹی، وڈھ، گلستان اور قلات میں قائم کر رکھے ہیں اور گزشتہ پانچ سال کے عرصہ میں یہ لوگ ایک ہزار سے زیادہ واقعات کے اور دہشت گردی کی وارداتیں کر چکے ہیں۔ ان حالات میں جب جنرل مشرف کے حکم پر ان فراریوں کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا تو صوبے کے عوام نے سجدہ شکر ادا کیا لیکن یہ غریب لوگ ان سرداروں اور وڈیروں سے اس قدر خوف زدہ ہیں کہ وہ کھل کر اپنی آواز بھی بلند نہیں کر سکتے۔ ایسے حالات میں اگر عوام صوبے کی مسلم لیگ کی حکومت کے ساتھ ہوتے تو وہ سڑکوں پر نکل کر ان قوم پرستوں کے خلاف ایک تحریک چلاتے۔ صدر جنرل پرویز مشرف اور وفاقی حکومت کا المیہ یہ تھا کہ بلوچستان میں جو سیاسی ٹیم اور حکومت انہوں نے بنا رکھی ہے وہ خود چاہتے تھے کہ حالات خراب رہیں اور وہ حکومت کے مزے لوٹتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں اربوں روپے خرچ کرنے کے باوجود پانچ افراد بھی صدر مشرف کی پالیسیوں کی حمایت میں جمع نہیں ہو پاتے اور نہ ہی اخباری بیان دے پاتے ہیں۔ صوبے کے اکثر مقامی اخبارات صوبائی اور وفاقی حکومت سے کروڑوں روپے کے اشتہارات حاصل کرتے ہیں مگر خبریں قوم پرستوں اور دہشت گردوں کی چھاپنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان قوم پرستوں کے مسلح لشکر اخبارات کے دفاتر پر آئے روز حملے کرتے رہتے ہیں اور صوبائی حکومت ان کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔

بلوچستان کے اس سفر کے دوران میں راقم جہاں بھی گیا حکومت کی رٹ (گرفت) نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ بلوچستان میں پاکستان کا صرف سکہ چلتا ہے اصل حکومت نوابوں سرداروں اور قوم پرستوں کی ہے۔ میں نے بلوچستان کے در و دیوار دیکھے ہیں جن پر یہ نعرے درج تھے..... ''آزاد پشتونستان، عظیم بلوچستان''..... 'پنجابیو اور فوجیو! بلوچستان چھوڑ دو''..... ''بلوچستان میں رہنا ہے تو جئے بلوچستان کہنا ہے''..... ''بلوچو! بندوق اٹھاؤ اور آزادی حاصل کرو''..... ''پنجابی سامراج مردہ باد'' وغیرہ وغیرہ

مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ اور افسوس ہوا کہ جنرل پرویز مشرف کے بلوچستان میں بٹھائے ہوئے گورنر اویس احمد غنی، وزیر اعلیٰ جام یوسف اور مسلم لیگ کی حکومت ہونے کے باوجود کسی بھی دیوار پر پاکستان زندہ باد کا نعرہ تحریر نہ تھا..... کوئٹہ کی گلی کوچوں میں چل پھر کر تو یوں محسوس ہوتا تھا

کہ وزیراعلیٰ صاحب کی حکومت کوئٹہ شہر میں بھی نہیں..... پاکستان کے حکمرانوں کا المیہ ہے کہ وہ بلوچستان کے مسئلے کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے اور سطحی اقدامات کر کے یہ سمجھتے تھے کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مثال کے طور پر کبھی نواب اکبر بگٹی کو محب وطن کہا جاتا اور کبھی غدار۔ یہ پالیسی ہر آنے والی حکومت نے نظریہ ضرورت کے تحت اختیار کی جبکہ بلوچستان کا مسئلہ فکری طور پر بگڑا ہوا ہے۔ بلوچستان کے تمام تعلیمی اداروں میں قیام پاکستان سے لے کر آج تک قوم پرست طلبہ تنظیموں کے ذریعے طالب علموں کی ایسی تربیت کی گئی ہے جو صرف اور صرف پاکستان اور پنجاب مخالف سوچ پر مبنی ہے جب یہ طالب علم ان تعلیمی اداروں سے فارغ ہوتے ہیں تو وہ ڈگریوں کے ساتھ ایک ایسی سوچ بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ اس ملک کو ہم نے توڑنا ہے، یہ وہ بنیادی وجہ ہے جس کو کوئی بھی حکمران سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا جب تک فکری طور پر بلوچستان کے پختون بلوچ طالب علموں اور عوام کو پاکستان کی تربیت نہیں دی جاتی، اس وقت تک بلوچستان کا مسئلہ برقرار رہے گا۔

بلوچستان کے ان نوابوں، وڈیروں اور سرداروں نے نہ صرف صوبے کے غریب عوام، ہاریوں اور مزدوروں کو یرغمال کر کے اپنا غلام بنا رکھا ہے بلکہ وہ حکومتوں کو بھی بلیک میل کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے حکمران بھی آج تک انہیں نوابوں اور وڈیروں کے ڈیروں پر جا کر سجدہ ریز ہوتے رہے ہیں، حکمرانوں کی ان حماقتوں اور ترلے منتوں کا نتیجہ کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو قانون سے بھی بالاتر سمجھ لیا ہے اور ان کا جب اور جہاں جی چاہتا ہے اسلحے اور اپنے مسلح فراریوں کے ذریعے امن و امان کو تہہ و بالا کر کر رکھ دیتے ہیں..... یہی نواب اکبر بگٹی جو آج حکومت کے لئے مسئلہ بنا ہوا تھا اور یہ خیر بخش مری اور اس کا بیٹا بالاچ مری جو فوج کے اعلیٰ افسران پر راکٹ برسا رہے ہیں کیا حکومت کو ان کی سرگرمیوں اور انکے تخریب کاری کے خفیہ اڈوں کا علم نہیں..... جب حکومت کو علم ہے کہ یہ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں غرب عوام کو یرغمال بنا لیتے ہیں، ان سے بھاری تاوان وصول کرتے ہیں، ان کی بہو بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں تو پھر کیا مجبوری ہے کہ یہ سب کچھ علم ہونے کے باوجود حکومت کے اعلیٰ عہدیداران کے ڈیروں پر حاضری لگوانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ابھی پچھلے برس 2006ء تک حکمران جماعت کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین اور سیکرٹری جنرل سید مشاہد حسین نواب اکبر بگٹی سے ملاقاتیں کرتے رہے ہیں اور ان کے

امنے جھک جھک کر آداب بجا لاتے رہے ہیں، اس وقت بھی نواب اکبر بگٹی کی نجی جیل میں جنوں بے گناہ شہری قید تھے، جن سے وہ تاوان طلب کر رہے تھے..... حکومت کے جو اہلکاران ے ملنے جاتے تھے وہ بھی اپنی سیاسی ضرورتوں پر تو گفتگو کرتے تھے مگر کسی حکومتی شخصیت کو بھی ان ریبوں کی یاد تک نہ آئی جو کئی برسوں سے نواب صاحب کی جیل میں کسی جرم کے بغیر پڑے ہوئے ھے، نہ انہوں نے نواب صاحب سے یہ تک دریافت کیا کہ آٹھ نو ہزار بگٹیوں کا کیا قصور ہے جو لزشتہ ڈیڑھ دو برس سے اپنے علاقے سے ہجرت کر کے ڈیرہ غازی خان اور راجن پور کے اقوں میں کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہوئے ہیں..... کیا ان کا اس کے سوا بھی کوئی قصور تھا کہ وہ علیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے علاقے میں ترقی ہوتی دیکھنا چاہتے ہیں..... کیا نواب اکبر لٹی سے ملاقاتیں کرنے والے ہمارے حکمران ٹولہ نے ان سے یہ دریافت کیا کہ آپ ڈیرہ بگٹی ر اپنے زیر اثر علاقہ کے سرکاری ملازمین اور ان گارڈز کی تنخواہوں سے ہر مہینے تین چار سو فی کس یوں وصول کرتے ہیں اور حکومت سے کروڑوں روپے رائلٹی وصول کرنے کے باوجود آپ کا یٹ کیوں نہیں بھرتا کہ آپ تین چار ہزار ماہناہ کمانے والے غریب ملازم سے بھی اپنے فراری پ چلانے کے لئے ٹیکس وصول کر لیتے ہیں..... یہ وہ حقائق ہیں جو سرکار کے علم میں ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے ان نوابوں اور وڈیروں کو ایک مقدس گائے کا درجہ دے کر ان کی پرستش ہاری رکھی۔ اس گائے کا جب جی چاہتا ہے سینگ مارنے لگتی ہے اور جب جی چاہتا ہے حکومت کو ودھ دینے کی بجائے اس سے دودھ وصول کرنے لگتی ہے یہ عجیب بات ہے کہ بلوچستان کے یہ واب اور وڈیرے جب حکومت میں ہوتے ہیں تو مرکز کے بارے میں ان کا لب ولہجہ اور ہوتا ہے اور جونہی یہ حکومت سے باہر ہوتے ہیں تو وفاق کو گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ پاکستان توڑ ینے کی باتیں کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

O

بعض حلقوں کا تو خیال ہے کہ اسٹیبلشمنٹ نے ان نوابوں، وڈیروں، سرداروں اور خانوں کو خود پال رکھا ہے، وہ اپنی ضروریات کے مطابق کبھی ان کو دبانے لگتی ہے اور کبھی ان کو چمکانے لگتی ہے۔ جب ان کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان کے وڈیروں پر جا کر گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور جب ترجیحات ذرا مختلف ہوتی ہیں تو ان کے خلاف مہم جوئی شروع کر دی جاتی ہے اور یہ سب دکھاوے

کے عمل ہیں۔ ورنہ حکومت کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ چند ہزار افراد پر قابو نہ پا سکے۔ اگر وہ لوگ مسلح ہیں اور پہاڑیوں پر چڑھ جاتے ہیں تو کیا حکومت کو ایسے لوگ میسر نہیں آ سکتے جوان پہاڑیوں پر ان کا پیچھا کر سکیں۔ یقیناً آ سکتے ہیں، ایسے لوگ بلوچستان کے اندر کثیر تعداد میں کل بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں جو سیاسی، قبائلی اور عسکری، ہر لحاظ سے ان کا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں اور پاکستان کے ساتھ ان کی وفاداریاں بھی کسی شک وشبہ سے بالا ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ حکومت ان کو تحفظ فراہم کرے اور اخلاقی لحاظ سے ان کی سرپرستی کرے..... وہ لوگ اثر ورسوخ اور مال وزر کے حوالے سے کسی بھی طرح ان نوابوں اور سرداروں سے کم نہیں..... فرق صرف یہ ہے کہ حکومت ان نوابوں اور سرداروں کی سرپرستی چھوڑ کر محب وطن لوگوں کی تھوڑی سی اخلاقی حمایت کر دے..... مثال کے طور پر صرف بگٹی قبلیہ ہی کو لیں، اس قبیلہ میں انگریز کے دور میں نواب آف بگٹی اور چیف آف بگٹی کے دو قبائلی عہدے تخلیق کئے گئے جو ابھی تک چلے آ رہے ہیں..... نواب اور چیف کو آپ صدر اور وزیر اعظم بھی کہہ سکتے ہیں..... نواب اگر قبیلے کا صدر ہے تو چیف اس کا وزیر اعظم..... بگٹی قبیلے کی تین ذیلی شاخیں ہیں..... میسوری، راہجہ اور کلپر..... میسوری بگٹی قبیلے کی سب سے بڑی شاخ ہے جس کے افراد کی تعداد کوئی بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ نواب اکبر بگٹی کا تعلق راھجہ قبیلے سے تھا جبکہ چیف آف بگٹی میر غلام قادر میسوری بگٹی کا تعلق جیسا کہ نام سے ظاہر ہے میسوری قبیلے سے ہے۔ میر غلام قادر میسوری بگٹی ضیاء الحق کے دور میں مجلس شوریٰ کے رکن رہے، انہوں نے اپنی زمین پر لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہائی سکول قائم کئے، اپنے علاقے میں ڈیم بنوائے، سڑکیں تعمیر کروائیں..... وہ خود تعلیم یافتہ اور دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں اور ان کے اسی جرم نے نواب اکبر بگٹی کو ان کا مخالف بنا دیا، دونوں قبائل کے درمیان جنگیں چھڑ گئیں مگر میسوری قبیلے کے بڑوں نے جنگ وجدل سے باز رہنے کی تجویز دی، نواب اکبر بگٹی نے مذاکرات کے بہانے میسوری قبیلے کے اڑھائی سو افراد کو نومبر 2004ء میں اپنے ڈیرے پر بلایا اور قبائلی روایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان تمام معززین کو اپنے مسلح گارڈز کے ذریعے اپنی نجی جیل میں بند کر دیا۔ میر غلام قادر میسوری اور ان کا بیٹا میر جان محمد بگٹی خود اس وفد میں شامل تھے، وہ بھی قیدی بنا لئے گئے تھے، قبیلے کے عمائدین میں بعض انتہائی نیک اور تہجد گزار بزرگ بھی تھے، نواب اکبر بگٹی نے ان کی داڑھیاں، مونچھیں اور بھنویں منڈوا دیں اور جیل کے اندر ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک روا رکھا۔ پانچ ماہ کے بعد ایک فوجی کارروائی کے نتیجے

ں اکبر بگٹی کے مسلح گارڈز جیل کو چھوڑ کر بھاگ گئے تو یہ لوگ جیل توڑ کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو ئے.....

مارچ 2005ء میں نواب اکبر بگٹی کی نجی جیل سے رہائی پانے کے بعد سے آج تک بگٹی قبیلے ے یہ چیف میر غلام قادر میسوری بگٹی، نواب اکبر بگٹی کے مظالم کے خلاف ہر دروازہ کھٹکھٹا چکے ہیں ر کہیں ان کی شنوائی نہیں ہوئی حالانکہ اثر ورسوخ اور افرادی قوت کے لحاظ سے وہ کسی بھی طرح اب اکبر بگٹی سے کم نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ نواب اکبر بگٹی حکومت کو بلیک میل کرتے تھے جبکہ ر غلام قادر میسوری بگٹی شریف شہری بن کر پُر امن جدوجہد کر رہا ہے۔ حکومت اگر ایسے لوگوں کی ائزمدد کرے تو نوابوں اور وڈیروں کا تریاق دریافت کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ لومت کی اعلیٰ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے خواتین وحضرات اس مقصد کے لئے مخلص ہوں اور صدر ُرف کو اصل صورتحال سے آگاہ کر رہے ہوں مگر یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ بلوچستان کی وبائی حکومت کے اعلیٰ عہدیداران دن کو ان قوم پرستوں کے خلاف بیانات دیتے ہیں اور رات وان کے ساتھ مل کر محاضرات سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔ میر جان محمد بگٹی نے راقم عروف کو بتایا کہ ''جب ہم لوگ اکبر بگٹی کی جیل میں تھے تو ہم نے دیکھا کہ سات سات سال سے ل اکبر بگٹی کی نجی جیل میں پڑے ہوئے ہیں، ان کا جرم اس کے سوا کوئی نہیں تھا کہ وہ بگٹی کو تاوان انہیں کر سکتے۔ اس وقت بھی میسوری قبیلے کے پانچ افراد کسی جرم کے بغیر بگٹی کی نجی جیل میں ے ہیں۔ (2006ء)

بگٹی کے کلپر قبیلے کے ایک شخص غلام قادر عرف ککی کا ایک بیٹا اور ایک بھائی گزشتہ چودہ برس ے اکبر بگٹی نے ایک ذاتی جیل میں رکھا ہوا ہے اور اکیس لاکھ روپے تاوان ادا کرنے کے باوجود ان کو رہائی نہیں ملی۔ غلام قادر نے ہر دروازہ کھٹکھٹایا مگر کہیں بھی شنوائی نہ ہو سکی، اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور وہ قبائل کی فرسودہ روایات کے خلاف تھے۔

اکبر بگٹی کی نجی جیل سے رہائی کے بعد والد صاحب نے کوئٹہ میں پریس کانفرنس اور صوبائی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اکبر بگٹی کے مظالم سے علاقہ کے عوام کو نجات دلائی جائے..... مگر صوبائی حکومت اس معاملے کو نظر انداز کرتی چلی آ رہی تھی، نہ معلوم وہ اکبر بگٹی سے ملی ہوئی تھی یا وہ قوم پرستوں کے سامنے بے بس ہو چکی تھی..... والد صاب نے ایک سال قبل کہا تھا کہ صوبائی حکومت دہشت گردی پر کنٹرول کرے۔ بصورت دیگر وہ پورے ملک میں پھیل جائے گی، آج وہ بات

درست ثابت ہورہی ہے، اب قوم پرستوں نے بلوچستان سے نکل کر کراچی اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی دہشت گردی کی کارروائیاں شروع کردی ہیں، اکبر بگٹی کے لوگوں نے بیکٹر، رکی روڈ کو، جس کی حیثیت کسی بھی طرح موٹروے سے کم نہیں، گزشتہ ایک سال سے بند کررکھا تھا، بھی چار پانچ روز قبل حکومت اور قبائل نے کوپکل میں نواب اکبر بگٹی کے فراری کیمپ پر حملہ کرکے وہاں سے دہشت گردوں کو بھگایا جس کے بعد یہ روڈ ایک سال بعد کھل گئی ہے..... بیکٹر ہائی سکول ایک سال سے بند تھا حتیٰ کہ ڈیرہ بگٹی میں ایف سی سکول میں بچوں کو پڑھنے سے روک دیا گیا اور ایف سی کا یہ سکول بھی چار ماہ تک بند رہا۔ یہ واقعات دیکھ کر آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اکبر بگٹی اور دوسرے قوم پرست بلوچستان کو کس راہ پر لے جارہے تھے، وہ دراصل صوبے میں تعمیر وترقی کے خلاف تھے اور صوبے کو پسماندہ رکھنے میں ہی ان کی سایست اور نوابی کی بقاء ہے..... اکبر بگٹی کے مظالم اور مال وزر کی ہوس کا اندازہ آپ اس بات سے لگاسکتے ہیں کہ علاقے کے تمام سرکاری ملازم اپنی تنخواہ میں سے 200 روپے ماہانہ نواب اکبر بگٹی کو ادا کرتے تھے۔ ڈیرہ بگٹی میں اکا سکول ٹیچر بچوں کو تعلیم دینے کے بجائے دہشت گردی کے کیمپ چلارہے تھے، وہ تنخواہ حکومت سے لیتے، کام اکبر بگٹی کے لئے کرتے تھے، اسی طرح لیویز فورس تنخواہ حکومت سے لیتی اور خدمات اکبر بگٹی کے لئے انجام دیتی تھی۔

O

اکبر بگٹی کے پوتے براہمداخ بگٹی جو بلوچستان لبریشن آرمی کا سربراہ بھی ہے اور نواب بخش مری کے بیٹے بالاچ مری کا حقیقی چہرہ 14 دسمبر 2005ء کو صدر مشرف کے سامنے آیا جب کوہلو میں صدر پاکستان پر راکٹ برسائے گئے۔ نواب اکبر بگٹی بڑا شاطر اور ماہر نفسیات سیاستدان تھا جو موقع محل دیکھ کر ہر دور حکومت میں مختلف پینترے بدلتا رہا اور ہر حکومت اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہی اور اسے بڑا آدمی بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ اکبر بگٹی کی سرپرستی کرتے رہے ہیں، اکبر بگٹی سیاسی اثر ورسوخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے علاقے کے لوگوں کو دباتے رہے۔

بلوچستان میں پاکستان دشمن قوتوں کا ایجنڈا کیا ہے اور قوم پرست قوتوں کی سرپرستی کون کررہا ہے؟..... یہ وہ سوال ہے جس پر محب وطن حلقوں، پاکستان کے دفاع اور سلامتی سے

ں، حکمرانوں اور سیاسی جماعتوں کے قائدین کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ بلوچستان کے پرست تقریباً چار عشروں سے پاکستان کی جڑیں کھودنے کے درپے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارا ن ٹولہ اپنے سیاسی مفادات اور اقتدار کی کرسی پر قابض رہنے کے لئے ان کے ناز نخرے ت کرتا رہا لیکن اب پانی سر سے گزرتا جارہا ہے۔ ان قوم پرستوں کو نظر آرہا ہے کہ پاکستان پڑھے لکھے اور محب وطن عوام اب زیادہ عرصہ ان کے جاگیردارانہ نظام اور ان کی نوابی کو ت نہیں کرسکتے، اس لئے انہوں نے اب پاکستان کے وجود کے خلاف کھلم کھلا باتیں کرنا اور اں دینا شروع کردی ہیں..... افغانستان کے ماضی وحال کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا جا ہے، کرزئی حکومت کے قیام اور افغانستان میں امریکہ کی آمد کے بعد قوم پرستوں کو دو عشروں بعد پھر سے افغانستان کی طرف سے سرپرستی حاصل ہوگئی ہے۔ تاہم دو عشرے قبل کے نوں کی پشت پناہی روس کررہا تھا تو آج کے افغان حکمران امریکہ اور بھارت کے کہنے پر قوم ں کو ہر قسم کی مدد فراہم کررہے ہیں۔ بھارت کی پاکستان سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی نہیں، وہ کھلا کشمیر کا بدلہ بلوچستان میں چکانے کی باتیں کرتا ہے جبکہ اس خطہ میں امریکہ کی دلچسپیاں اور ات بھی سب پر عیاں ہیں لیکن اب کی بار بلوچستان میں امریکہ انتہائی خطرناک کھیل کھیل رہا ۔ایران کے ساتھ امریکہ کی محاذ آرائی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے، امریکہ ایران لاف گھیرا تنگ کرنے کے بعد اس کے خلاف ویسی ہی کارروائی کرنے کا متمنی ہے جیسے عراق لاف پہلے رائے عامہ کو ہموار کیا گیا اور بعد ازاں امریکہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی ج کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عراق کے خلاف چڑھ دوڑا۔ ایران کے خلاف کارروائی کے ریکہ کو پاکستان سے کسی ردعمل کا خدشہ ہوسکتا ہے۔ امریکہ پہلے ان امکانات کو ختم کرنا چاہتا ۔ایران کے خلاف کسی کارروائی سے قبل امریکہ پاکستان اور ایران کے درمیان اختلافات پیدا کے دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف اس حد تک لے جانا چاہتا ہے کہ کل امریکہ ایران لاف کارروائی کرے تو پاکستان سے حکومتی اور عوامی سطح پر کوئی آواز نہ اٹھ سکے۔ اس مقصد کو ا کرنے کے لئے بلوچستان میں شیعہ سنی فسادات بھڑکائے جارہے ہیں، کوئٹہ میں شیعہ ں کے افراد پر پے در پے حملے ہورہے ہیں اور گزشتہ چند ماہ کے دوران میں شیعہ مکتبہ فکر کی امور شخصیات کا خون کیا جاچکا ہے۔ امریکہ کا ایجنڈا یہ ہے کہ پاکستان بالخصوص بلوچستان میں مکتبہ فکر پر مظالم کرکے ایران کو بھڑکایا جائے، ایران پاکستان کی شیعہ برادری کے حق میں

پاکستان سے احتجاج سے بڑھ کر کچھ کرے اور یوں پاکستان، ایران تعلقات کشیدہ کروا کر اپنے مقاصد حاصل کئے جائیں۔

قوم پرست ایک طرف امریکہ کے اس ایجنڈے کو آگے بڑھا رہے ہیں اور دوسری طرف بلوچستان کے اندر امن و امان کی صورت حال کشیدہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئٹہ میں شیعہ برادری کے افراد کی جان لینے والے خفیہ ہاتھ ابھی تک سامنے نہیں آ سکے اور خدشہ ہے کہ اگر حکومت، سیاسی جماعتوں اور مذہبی قائدین نے ہوشمندی کا ثبوت نہ دیا تو امریکہ کے عزائم پایہ تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ بلوچستان میں امریکہ، بھارت اور افغانستان کا ایجنڈا اس وقت تقریباً ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ بلوچستان میں امن و امان قائم نہ ہونے دیا جائے اور اس مقصد کے لئے قوم پرستوں کی سرپرستی کی جائے۔ قوم پرست جماعتوں کے سربراہان نے اپنے اپنے علاقے میں دہشت گردی کے جو تربیتی مراکز قائم کر رکھے ہیں اور یہ دہشت گرد ان مراکز کو چلانے اور جدید ترین اسلحہ پر جس طرح کھلے دل سے رقم خرچ کر رہے ہیں، اس کے لئے کروڑوں روپوں کی ضرورت ہے اور یہ پیسے بلوچستان کے گنجے پہاڑوں میں نہیں اگتے، یہ کثیر سرمایہ کہاں سے آ رہا ہے، اگر حکومت اس کے ماخذ تک پہنچ جائے تو بہت سے خفیہ ہاتھ بے نقاب ہو سکتے ہیں۔

بلوچستان میں ان چند دنوں کے دوران میں مجھے یہ شدت سے محسوس ہوا کہ بلوچستان کی صوبائی حکومت مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عوام کے اندر اس کا کوئی اثر و رسوخ نہیں، دوسرے وہ خود بھی قوم پرستوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ شاید ان کی سوچ یہ ہے کہ انہیں بلوچستان میں رہنا ہے، اس لئے وہ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کیوں لگائیں.....

O

یہ تجزیہ فروری 2006ء میں لکھا گیا تھا تب نواب اکبر بگٹی زندہ تھے، اب حالات اس سے بھی بدتر ہو چکے ہیں۔

یہ سوال بڑا اہم ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے دور میں شروع ہونے والے اس چوتھے فوجی آپریشن (تین آپریشن اس سے پہلے ہو چکے تھے) کا انجام آخر اتنا بھیانک کیوں ہوا؟ نہ صرف اکبر بگٹی مارے گئے بلکہ بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک نے جڑ پکڑی، اس کا پس منظر بڑا واضح مختصر ہے!

امریکہ ہو یا بھارت یا کوئی اور طاقت، جب تک پاکستان نے "گوادر" کا پنگا نہیں لیا تھا

بلوچستان سے صرف اتنی ہی دلچسپی تھی کہ وہاں کی قوم پرست سیاست دانوں کو پاکستان کے خلاف متحرک رکھیں لیکن چین کی مدد سے گوادر کی تعمیر نے امریکہ اور بھارت دونوں کا دماغ خراب کر دیا۔ امریکہ کے لئے جہاں چین کی موجودگی عذاب بن رہی ہے اور بھارت کے لئے بندرگاہ کے باقاعدہ "ان ایکشن" ہونے کے بعد سے پاکستان کی بدلتی معاشی صورتحال مسئلہ بنی ہوئی ہے اور دونوں طاقتیں اس خطے کے غیرت مند لیکن سادہ لوح بلوچوں کو ورغلا کر اپنا الو سیدھا کر رہی ہیں۔

"فاٹا" کی طرح بلوچستان میں بھی افغانستان کے بھارتی قونصلیٹس سرگرم عمل ہیں گزشتہ دور حکومت (مشرف دور) میں بلوچستان کے گورنر (موجودہ گورنر سرحد) اویس غنی نے ساری دنیا کے پریس کے سامنے بھارتی مداخلت کے ثبوت پیش کئے لیکن دنیا کے کانوں پر جوں نہیں رینگی کیونکہ مسئلہ بھارت کا تھا۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمسایہ برادر ملک ایران کے شہر اصفہان میں موجود بھارتی قونصلیٹ بلوچستان میں باغیانہ سرگرمیوں کی سرپرستی کر رہا ہے۔ سی آئی اے اور "را" نے مل کر ایران بلوچستان سرحد پر "جنداللہ" قائم کی۔ اس کی تربیت کی اور اس سے ایران پر حملے بھی کروائے ہیں تاکہ دونوں برادر ملکوں میں اس حوالے سے ٹھنی رہے۔ بدقسمتی سے اس خطے میں "را" کی سرگرمیوں کی وجہ سے پاکستان اور ایران کے تعلقات متاثر ہو رہے ہیں لیکن ایران پھر بھی بھارت کو سہولیات فراہم کرتا ہے کیونکہ دونوں ملکوں کے تعلقات مثالی ہیں۔ ان حالات میں پاکستان نہ صرف بلوچستان میں "را" کی دہشت گردی کا شکار ہے بلکہ ایران کے ساتھ بھی غلط فہمیاں جنم لے رہی ہیں۔

O

امریکی شہری اور یونین این او کے نمائندے جان سولیکی کو گزشتہ سال کے آخر میں بلوچستان سے اغوا کر لیا گیا۔ ان کے اغوا کی ذمہ داری ایک بلوچ علیحدگی پسند تنظیم نے قبول کی اور طویل مذاکرات، رابطوں اور سفارتکاری کے بعد بالآخر جان سولیکی کو رہائی مل گئی۔

جان سولیکی کی رہائی میں تین بلوچ لیڈروں نے بڑا اہم "سوداکاری ایجنٹ" کا کردار ادا کیا تھا۔ ان کے ذریعے ہی دراصل رقم ادا کی گئی تھی، بعد کے واقعات اور شواہد نے یہ ثابت کر دیا کہ در اصل یہ سارا ڈرامہ "را" نے "جنداللہ" کے ذریعے رچایا تھا کیونکہ ان تینوں سودکاری ایجنٹوں کے

''جنداللہ'' سے قریبی رابطے تھے اور یہ تینوں ایرانی انٹیلی جینس کے لئے ہی کام کرتے تھے۔ ''جنداللہ'' کو ان کے ڈبل کراس ہونے کا علم ہوا تو وہ ان کے خلاف ہو گئے۔

آخری اطلاعات کے مطابق تاوان کی رقم کی تقسیم پر ''را'' نے ان کے اور BNLF کے درمیان زبردست اختلافات پیدا کروا دیئے جس پر مارچ 2009ء کے آخری دنوں میں ان تینوں کو تربت میں ان کی جائے رہائش سے کچھ فاصلے پر قتل کر دیا گیا۔ انہیں آپس میں تاوان کی رقم کی تقسیم نے مروایا؟ ''جنداللہ'' نے یا پھر ''را'' نے جبکہ ایرانی انٹیلی جینس بھی ان کے مشکوک کردار سے نالاں تھی لیکن ملبہ آئی ایس آئی پر ڈال دیا گیا اور اسی کی آڑ میں بلوچستان میں انارکی کی موجودہ مہم شروع ہو گئی۔

بلوچستان ہائی کورٹ نے اس واقعہ کا ازخود نوٹس لے لیا اور صوبائی حکومت نے جسٹس نادر خان درانی کی سربراہی میں ایک ٹریبونل قائم کر دیا ہے جو بلوچ رہنماؤں کے قتل کی تفتیش کر کے حکومت کو رپورٹ پیش کرے گا۔ (ڈان 10/اپریل 2009ء) جبکہ کوئٹہ کے وکلاء کے رہنما باز محمد کاکڑ نے عدالت عظمیٰ کے سربراہ جناب جسٹس افتخار محمد چودھری سے تربیت میں بلوچ رہنماؤں کے قتل کی واردات کا ازخود نوٹس لینے کی درخواست کی ہے۔ ادھر بلوچ ری پبلکن پارٹی کے رہنما ڈاکٹر حکیم لہڑی نے حکومت میں شامل بلوچ رہنماؤں کو غیرت دلاتے ہوئے کہا ہے کہ اگر وہ بلوچ قوم سے مخلص ہیں تو گورنر بلوچستان نواب ذوالفقار علی مگسی اور وزیراعلیٰ نواب اسلم رئیسانی سمیت تمام وزراء کو اپنے اپنے عہدوں سے مستعفی ہو کر پارلیمانی سیاست ترک کر کے مزاحمتی تحریک میں شامل ہو جانا چاہئے۔ (ڈان: 2/اپریل 2009ء) لیکن پختون آبادی کی نمائندہ مذہبی جماعت جمعیت علماء اسلام (ف) کے رہنما اور بلوچستان کے سینئر وزیر مولانا عبدالواسع نے محتاط اور معتدل رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک انکوائری مکمل نہ ہو جائے کسی پر بے جا الزام تراشی سے اجتناب کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ غیر ملکی عناصر فوج اور آئی ایس آئی کو بدنام کرنے کے لئے پروپیگنڈہ کرا رہے ہیں۔ (ڈان: 12/اپریل 2009)

صدر آصف علی زرداری 27,26/مارچ کو کوئٹہ گئے تھے، جہاں انہوں نے فرمایا تھا کہ ان کی حکومت بہت حد تک بلوچستان کے مسائل بھی حل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اب باقی ماندہ مسائل بھی حل کر لئے جائیں گے۔ انہوں نے حکومت کو ہدایت کی تھی کہ وہ بلوچستان کو درپیش مسائل کے بارے میں اسمبلی سے ایک قرارداد منظور کرائے اور اسے وفاقی حکومت کو ارسال

کرے، اگر اس کے لئے ضرورت پڑی تو آئین میں ترمیم کر دی جائے گی۔ 27/مارچ کو قبائلی عمائدین سے بات کرتے ہوئے انہوں نے بلوچستان کی ہمہ جہت ترقی کے لئے 46.6 ارب روپے کی امداد کا اعلان کیا، جس میں سے 36 ارب روپے کی لاگت سے چار بڑے بند بنائے جائیں گے، جبکہ کوئٹہ پر 3 ارب روپے اور اعلیٰ طاقت کی ٹرانسمشن لائن کے لئے 5 ارب روپے مختص کئے جائیں گے۔ (ڈان: 27/مارچ 2009ء)

ہم اس پیشکش پر اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے بلوچ قوم پرست تنظیموں کا ردعمل بیان کئے دیتے ہیں۔ 27/مارچ کو کوئٹہ میں سائنس کالج چوک پر ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بلوچستان نیشنل پارٹی (مینگل)، نیشنل پارٹی اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (ایم) نے آصف زرداری کے پٹارے (Package) کو مسترد کرتے ہوئے کہ کہ ہم بلوچستان کے قدرتی وسائل کو صوبے کی ترقی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور وہ اتنے وافر ہیں کہ ہمیں کسی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم پرویز مشرف کے میگا پراجیکٹ کو ٹھکرا چکے ہیں اور اگر ہمیں اپنی بہتری کے لئے صوبے کے وسائل استعمال کرنے دیا جائے تو ہمیں زرداری کے پٹارے (Package) کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ زرداری کی امداد کی پیشکش نواب اکبر بگٹی اور بالاچ مری کی قربانیوں کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ مقررین نے کہا کہ بلوچ اپنے قومی حق، اپنے ساحل اور قدرتی وسائل کی حفاظت کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ (ڈان: 28/مارچ 2009ء) اس کے علاوہ کوئٹہ کے منان چوک پر انجمن اتحاد مری، بلوچ خواتین پینل، بی ایس او (اے)، بلوچ بار ایسوسی ایشن اور رئیسانی اتحاد کے رہنماؤں نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 1948ء میں بلوچستان کو پاکستان میں اس کے رہنماؤں کی مرضی کے بغیر ضم کر لیا گیا تھا، جبکہ قلات کی پارلیمان نے پاکستان میں صوبے کے انضمام کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ (ڈان: 28/مارچ 2009ء)

اس صورتحال کو بھارتی ایجنسی ''را'' خوب ہوا دے رہی ہے اور آجکل بلوچستان کے حالات توقعات سے بھی زیادہ خراب ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ساری قومی لیڈرشپ ان کے ساتھ ہے۔ حکومت نے خصوصی پیکیج کا اعلان کیا ہے لیکن شورش روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

اس مرحلے پر انگریزی معاصر روزنامہ The News کی 6/اپریل 2009ء کی ایک سٹوری بغیر تبصرے کے پیش کی جا رہی ہے۔

India fanning trouble in Balochistan: US journal

ISLAMABAD: One of the most prestigious US journals, "Foreign Affairs has revealed on impeccable authority that India has been pumping in huge amount of money to create unrest in Balochistan and that it has direct links with terrorist activities on the soil of Pakistan.

The journal, published by the Council for the Foreign Relations from Washington, has gathered it in a roundtable conference that war arranged by it and the details of which appeared on the front page in the fresh issue of the journal. Christine Fair, an eminent US journalist after visiting Indian consulates in Iran and Afghanistan has disclosed that the missions are undertaking the job "beyond" issuance of visas. The journalist, who is a senior political scientist at the RAND Corporation and has tremendous influence over the US administration, has shed light briefly on the activities of the Indians and discussed Pakistan's perception in this regard.

Christine Fair has authored and co-authored several books, including most recently, The Madrassah Challenge: Militancy and Religious Education in Pakistan. Other participants of the conference were

Stephen Philip Cohen who is the author of numer books on the Indian and the Pakistani security issu Sumit Ganguly, a Professor of Political Science, h the Rabindranth Tagore chair in Indian cultures civilizations Shaun Gregory, Director of the Pakis Security research unit at the University of Bradford, Shah, former Rhodes Scholar, is a Ph.D candidat the Department of Political Science at Colum University and Asshley J. Tells, senior associate at Carnegie Endowment for International Peace.

The title of the conference was: "What's the Prob with Pakistan?" It has been observed that the crisi Afghanistan and Pakistan is beyond the point wh more troops will help. The US strategy must be to s compromise with insurgents while addressing regic rivalries and insecurities. Targeted killing of ene leaders have high costs, high risks, and limited bene - but are still a sensible way to comber al-Qaeda the Taliban in Pakistan.

Christine Fair said that it would be a mistake completely disregard Pakistan's regional percepti due to doubts about the Indian competence executing covert operations. That misses the p entirely. "And I think it is unfair to dismiss the notion Pakistan's apprehensions about Afghanistan ster

part from its security competition with India. Having visited the Indian mission in Zahidan, Iran, I can assure you they are not issuing visas as the main activity! Moreover, India has run operations from its mission in Mazar (through which it supported the Northern Alliance) and is likely doing so from the other consulates it has reopened in Jalabad and Kandahar along the border."

She said, "The Indian officials have told me privately that they are pumping money into Balochistan. Kabul has encouraged India to engage in provocative activities such as using the Border Roads Organization to build sensitive parts of the Ring Road and use the Indo-Tibetan police force for security. It is also building schools on a sensitive part of the border in Kunar - across Bajaur. Kabul's motivations for encouraging these activities are as obvious as India's interest in engaging them even if by some act of miraculous diplomacy the territorial issues were to be resolved, Pakistan would remain an insecure state."

Christine Fair said that given the realities of the subcontinent (e.g., India's rise and its more effective foreign relations with all of Pakistan's near and far neighbours), these fears are bound to grow; not lessen. This suggests that without some means of compelling

Pakistan to abandon its reliance upon militancy, it wil be come ever more interested in using it - and the militants will likely continue to proliferate beyon Pakistan's control.

Aqil Shah while expressing his views said that i would be reasonable to speculate that India's intelligence gathering agency Research and Analysis Wing (RAW) is setting scores with the ISI i Afghanistan and perhaps Balochistan. But so far, the Pakistani military establishment has produced little evidence of the "Indian hand", and logically it doesn' make sense for India to back groups that could instantly turn their guns on New Delhi, as many of the Pakistan Taliban promised to do in the wake of the recen Mumbai attacks.

"The trouble with Pakistan is that the specter of the unremitting "enemy" serves the parochial interests o the military. That is why the question of civil-militar relations is critical to Pakistan's external policies and hahavior. When the enterenched organizational beliefs biases, routines, and interests of the military become the primary drivers of a state's decision-making for wa and peace, it has trouble written al over it," he added.

Aqil Shah said that the Christine's observations provide damning evidence of the games states play

The Indians seem to be saying, "The Pakistanis did it to us in Kashmir, so we will pay them back in Balochistan and elsewhere." So it should not be surprising that the Pakistani military continues to patronize groups it sees as useful in the regional race for influence, even if the costs to Pakistan's political stability outweigh the benefits. He argued that the United States has to pay more attention to the Kashmir conflict and be seen to be doing so. Kashmir shapes the Pakistani state's world-view to a significant degree. It also plays a crucial role in legitimating the military's virtually open-ended security mission and limits the prospects of reversing military power in domestic politics.

Meanwhile, if Washington is backing civilian rule in Pakistan, as it says it does, the US officials should resist holding secret meetings with the Pakistan Army leadership. These interactions undermine the authority of the civilian government and reinforce the generals' exaggerated sense of importance. The military feels it can get away with murder in good measure because it believes that it is indispensable to Washington. "As for the possibility that religious fatalism" is part of the problem, I don't think cultural or religious essentialism can help us understand the Pakistani military's intransigence in the face of changing circumstances.

Organizational beliefs and norms, which define the values and goals that are important to the group and are imparted to all new members in a highly structured environment, deeply influence military behavior. One deeply internalized assumption is that India is evil and anyone who abets or aids it in any way, or is seen as doing so, must also have evil designs of Pakistan. On FATA, as urgent as dealing with militancy is, there is a serious and long overdue need to reform the barbaric colonial-era rules and regulations under which Pakistan (mis)governs the area. The government, for example, is currently allowed to use fines, arrests, property seizures, and economic blockades to punish an entire tribe for crimes committed anywhere in its territory. Official decisions are not subject to appeal in a court of law. The people of FATA are deprived of basic political rights, and political parties are still banned from operating in the area (which is one reason the madrassah-based JUI-F dominated local politics). External actors need to lean on Pakistan to get serious about governance and economic reforms in FATA. The Pakistani state has washed its hands of its basic responsibility to govern FATA by blaming it on Pashtun traditions and culture. But FATA is misgoverned deliberately, not because of tribal resistance.

In his remarks Stephen Cohen said that achieving such "Pakistan" requires a long-term strategy, and some agencies in Washington have pressing short-term goals. "They would be willing, like previous US administrations, to trade of dealing effectively with al-Qaeda and the Afghan Taliban now at the expense of helping Pakistanis construct a stable and, hopefully, democratic state over the long term. But the prospect of a truly rogue pakist5an several years down the road is frightening. As far as policy is concerned, the approach set out in the Biden-Lugar legislation changes the fundamental ground rules of our rejationship with Islamabad and the Pakistani people. I support it wholly. I don't think that the GOP understands this; Richard Holbrooke will have to make it clear to them that the old rules have changed, while convincing the rest of the Obama administration that a short-term policy must be accompanied by long-term policies as well."

(The News, Lahore: April 6, 2009)

4رمئی 2009ء کو بلوچ ری پبلکن پارٹی کے سربراہ اور بلوچ گوریلا کمانڈر نواب زادہ براہمداغ بگٹی نے بابائے نوشکی حیات جمال دینی کے چہلم کے موقع پر سیٹلائٹ فون کے ذریعے مرکزی جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''اب ہر بلوچ پر یہ اولین فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے جذبے سے سرشار ہوکر پہاڑوں کا رُخ کرے۔ میدان جنگ ہو یا کارزار سیاست، تمام بلوچ اب صرف اور صرف آزادی کی بات کریں۔ میں ان تمام شہدا کو سلام پیش کرتا

ہوں جنہوں نے ''وطن کی آزادی'' کی خاطر قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ میری تمام قابل احترام بزرگوں، نوجوانوں، ماؤں اور بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تمام تر توانائیاں مزاحمت پر خرچ کر کے ''مادر وطن'' کے لئے کردار ادا کیں۔ مختلف ادوار میں کبھی آمریت اور کبھی خود ساختہ جمہوریت کی شکل میں بلوچ قوم کو دھوکہ دیا جاتا رہا ہے، لہٰذا بلوچ قوم کو واضح طور پر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اب ہم آزادی سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہمیں ایسے لیڈروں کی ہرگز ضرورت نہیں جو اقتدار اور نوابی کے لئے پنجاب کی کاسہ لیسی کرتے ہیں۔'' براہمداغ بگٹی اس سے قبل بھی متعدد بار اسی نوع کے بیانات اور انٹرویوز میں اپنے خیالات کا نہ صرف اظہار کر چکا ہے بلکہ اس نے علی الاعلان کہا ہے کہ وہ بلوچستان کو آزاد کرانے کے لئے بھارت سے ہر طرح کی امداد بھی وصول کر رہا ہے اور اس سلسلے میں امریکہ و روس سمیت کوئی اور ملک بھی اگر ان کی مدد کرنا چاہے گا تو وہ اس کے لینے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ بلوچستان کے معاملات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ چند روز قبل وفاقی حکومت کے نمائندے گورنر بلوچستان نے بھی کہا تھا کہ اگر حکومت نے اس طرف توجہ نہ دی تو بلوچستان ہاتھ سے نکل سکتا ہے کیونکہ یہاں تخریب کاری انٹیلی جنس ایجنسیوں نے مل کر حملہ کیا ہے۔ ہمیں اس بات کا اقرار کر لینا چاہئے کہ بلوچستان کے محاذ پر ابھی تک ہماری ایجنسیوں نے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کی۔

O

''موساد'' کے خونی پنجے

ستمبر 1968ء میں مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم بھارت نے اپنے انتہائی راز دار ساتھی سیکرٹری ٹو انڈیا گورنمنٹ رامیشور ناتھ کاؤ کے زیر قیادت جب ''را'' قائم کی تو اسے کہا کہ ''را'' کو ''موساد'' کے انداز میں بنائیں اور چلائیں۔ مسز اندرا گاندھی کا شمار ان لیڈروں میں ہوتا ہے جو بھارت اور اسرائیل کا خصوصاً عسکری معاملات میں تعاون ناگزیر سمجھتی تھی کیونکہ بظاہر بھارت ''غیر نبدار تحریک'' کا ممبر ہونا اور عربوں کو اپنی چانکیائی ذہنیت کے مطابق اپنے کنٹرول میں رکھنا بھارت کا ہمیشہ مطمع نظر رہا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ مسلم دشمن اسرائیل کو نظر انداز کر دیں۔ مسز اندرا گاندھی خصوصاً پاکستان کے معاملات میں اسرائیل کا تعاون ناگزیر سمجھتی تھیں۔

کاؤ نے مسز اندرا گاندھی کے خصوصی احکامات پر اسرائیل سے ایک خفیہ رابطہ ہمیشہ بحال رکھا۔ 1950ء میں بھارت نے اسرائیل کو ممبئے میں اپنا قونصلیٹ کھولنے کی اجازت پہلے سے ہی دی ہوئی تھی لیکن بھارت کی طرف سے فلسطین کی نام نہاد حمایت کی وجہ سے اسرائیل سے بظاہر بھارت کے تعلقات مثالی نہیں تھے۔ آج بھی جب دہلی میں اسرائیلی سفارتخانہ کام کر رہا ہے۔ عرب پھر بھی بھارت کو بدقسمتی سے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ''موساد'' اور ''را'' میں انتہائی قریبی تعلقات قائم ہیں اور دونوں ایجنسیوں کے بڑے اہداف ''پاکستان، چین اور شمالی کوریا'' کے تعلقات ہیں۔ 1971ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے پیونگ نارتھ کوریا کا دورہ کر کے شمالی کوریا اور پاکستان کے درمیان عسکری تعلقات کی بنیاد رکھی تھے۔ تب سے اب تک ''موساد'' اور ''را'' نے شمالی کوریا کو ٹارگٹ کیا ہوا ہے تاکہ پاکستان کے میزائل پروگرام پر بھرپور نظر رکھ سکے۔

1977ء میں مرار جی ڈیسائی کے برسر اقتدار آنے تک ''را''۔ ''موساد'' کے تعلقات

بھارتی حکومت کے لئے بھی ''راز'' تھے۔ اس راز سے پردہ ان کے دور حکومت میں اٹھا جب موساد کے تعاون سے حاصل کردہ ایک اہم رپورٹ کی بنیاد پر ''را'' نے مُرار جی ڈیسائی کو آگاہ کیا کہ جنرل ضیاء الحق نے پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کے منصوبے پر سنجیدگی سے کام شروع کر دیا ہے۔ ان دنوں فرانس کی طرف سے پاکستان کو پلوٹونیم ری پراسسنگ پلانٹ دینے کی اطلاعات عام تھیں جبکہ یورینیم کی این رچمنٹ (Enrichment) کرنے والے پلانٹ کی کہوٹہ میں موجودگی بڑا اہم سیکرٹ تھا جب صدر کارٹر کی طرف سے دباؤ بڑھنے پر فرانس نے پاکستان کو پلانٹ کی سپلائی روک دی تو بھی پاکستان نے کہوٹہ سے متعلق اپنے عزائم تبدیل نہیں کئے۔ پاکستانی حکومت نے امریکہ کو اپنے نیوکلیائی معاملات میں مداخلت کی اجازت کبھی نہیں دی۔

مُرار جی ڈیسائی کا تعلق جنتا دل سے تھا جو ''را'' کی روز بروز بڑھتی مداخلت سے سخت پریشان تھی کیونکہ ''را'' نے اب مشرقی پاکستان سے شہ پا کر سری لنکا کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی تھی اور بھارتی حکومت کے لئے اس کا ''آؤٹ آف کنٹرول'' بجٹ مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ ''موساد'' نے ''را'' کے ذریعے بھارتی وزیر اعظم کو ایک بڑی رقم کے عوض کہوٹہ کے بلیو پرنٹ فراہم کرنے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ یہ رقم اتنی زیادہ تھی جس کی اجازت ''را'' کے لئے موجودہ حالات میں وزیر اعظم سے لینا ناگزیر تھا۔ کانگریس کی حکومت ہوتی تو وہ ہرگز یہ تکلف نہ کرتے۔ یہ ''اجازت''۔ ''را'' کو بہت مہنگی پڑی۔ امن پسند مُرار جی ڈیسائی نے جو اندرا گاندھی کے تخریب پاکستان کے کردار سے سخت نالاں اور اسے بھارت اور پاکستان کے درمیان مستقل دشمنی کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔ ایک سارک کانفرنس پر جب جنرل ضیاء الحق اور مُرار جی ڈیسائی کی ملاقات جاری تھی تو مُرار جی ڈیسائی نے انہیں مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ سے تو اپنا کہوٹہ نہیں سنبھالا جا رہا اور انہیں بتا دیا کہ کسی پاکستانی کی طرف سے خطیر رقم کے عوض بلیو پرنٹس دینے کی پیشکش کی گئی ہے۔

پاکستان میں تو یہ خبر پہنچتے ہی کارروائی شروع ہو گئی اور جلد ہی انٹیلی جنس نے وہ ''آستین کا سانپ'' قابو کر لیا لیکن ''را'' کو جب اپنے وزیر اعظم کی اس ''فراخدلی'' کا علم ہوا تو وہ ٹھگا کر رہ گئے۔ اگلا دھچکا ''را'' کو تب لگا جب اسرائیلی جنرل موشے دہان نے ''را'' کے ساتھ پاکستان کے خلاف ایک مشترکہ آپریشن کے لئے نیپال کا دورہ کیا جہاں ''را'' اور ''موساد'' کے شہ دماغوں کی مشترکہ میٹنگ کی خبر پاکستانی ایجنسی نے بریک کر دی۔

''را'' اور ''موساد'' نے دراصل کہوٹہ کو نشانہ بنانے کا شیطانی منصوبہ بنایا تھا اور اسرائیل کی طرف سے کہوٹہ کے گرد نصب زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائلوں کی مکمل تفصیلات ''موساد'' نے ''را'' کو فراہم کرنے کے بعد اپنے جہاز اور ماہر پائلٹ بھی سری نگر اتار دیئے تھے لیکن پاکستانی ایجنسیوں نے حکومت کو بروقت خبردار کر دیا جس پر پاکستان نے اپنے ایک دوست ملک (غالباً ترکی) کے ذریعے اسرائیل کو براہ راست پیغام دیا تھا کہ اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو پاکستان تل ابیب پر براہ راست حملہ کرے گا اور اسرائیل اس پاکستانی صلاحیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ پاکستان نے اسرائیل کو وارننگ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ 1981ء میں عراق نیوکلیئر پلانٹ Osirak کو فضائی حملے کے ذریعے تباہ کرنے کے بعد کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے تو اسے اپنا دماغ ابھی سے درست کر لینا چاہئے کیونکہ پاکستان ''عراق'' نہیں ہے۔ معاملات اتنے بگڑے کہ امریکہ کو پاکستان اور اسرائیل کے درمیان خفیہ مذاکرات کے ذریعے بات کرنی پڑی کیونکہ امریکہ افغانستان میں دھنسنے کے بعد پاکستان کا خاصا محتاج ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے امریکی دوستوں کی خصوصی درخواست پر جنرل ضیاء الحق نے تل ابیب کو یہ ضرور کہہ دیا تھا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام اسرائیل کے خلاف نہیں اور نہ ہی کبھی مستقبل میں ایسا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسرائیل نے ایران، عراق اور لیبیا پر Pre-emptive پیشگی حملوں کا اعلان کیا تو اس نے پاکستان کا نام نہیں لیا۔

1980ء کی دہائی کے آغاز ہی میں سی۔آئی۔اے کو پاکستان کی ایٹمی سرگرمیوں کی خبر ہو گئی تھی خصوصاً کہوٹہ سے متعلق وہ بڑے متوحش تھے لیکن افغانستان میں امریکہ اور روس کے ٹکراؤ اور پاکستان کی محتاجگی نے امریکیوں کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اس مرحلے پر جنرل ضیاء الحق نے شاندار ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے اسرائیل سے خفیہ تعلقات قائم کئے اور اسرائیل کے ذریعے بھی امریکیوں کو انتہائی اقدام سے روکے رکھا۔ مصدقہ ذرائع کا دعویٰ ہے کہ ان دنوں پاکستان کے واشنگٹن میں موجود سفارت خانے میں ''موساد'' اور ''آئی ایس آئی'' کے افسران کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ آئی ایس آئی جانتی تھی کہ ''موساد'' کو لیبیا، شام، اردن اور سعودی عرب کے متعلق عسکری معلومات درکار ہیں۔ اسرائیل کی اس کمزوری کا آئی ایس آئی نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے کافی عرصے تک اپنی مرضی کی وکٹ پر کھیلنے کے لئے مجبور رکھا۔

1990ء کی دہائی تک یہ کھیل آئی ایس آئی نے بڑی کامیابی سے کھیلا لیکن 1990ء

ں جب ''را'' کی مدد کے لئے ''موساد'' نے اسرائیلی کمانڈوز کو سری نگر بھیجا جہاں وہ کشمیری مجاہدین ے خلاف ''کاؤنٹر انسرجنسی'' میں بھارت کی مدد کرنے آئے تھے تو ''موساد'' اور آئی ایس آئی کی ہیں الگ ہو گئیں اور انہیں اس بات کا یقین آ گیا کہ ''را'' کے ساتھ ''موساد'' کے تعلقات بہت رتک جا چکے ہیں۔ اس مرحلے پر جب ایک ''اسرائیلی سیاح'' مجاہدین کے حملے میں مارا گیا اور سرا اغوا ہو گیا تو ''موساد'' کو یقین ہو گیا کہ اب ان کی ڈبل گیم نہیں چل سکتی جس کے بعد وہ ''را'' ے بہت قریب آ گئے۔

کشمیری مجاہدین کے نام پر ''جعلی مجاہد تنظیم'' سے یہ کارروائی دراصل ''را'' نے کروائی ی جسے اس بات کا علم تھا کہ آئی ایس آئی نے ''موساد'' کو خاصا قابو کیا ہوا ہے۔ اس کارروائی ے بعد ''موساد'' نے کشمیری مجاہدین کو براہ راست اپنا دشمن جان لیا اور یہی بھارتی چاہتے تھے۔ ں مرحلے پر ''را'' نے بڑا شاندار ڈرامہ ترتیب دیا۔ ''موساد'' کے اعلیٰ افسران دہلی آئے جن کے اکرات سری نگر میں اسرائیلی سیاح کو اغواء کرنے والے گروپ سے کروائے گئے اور یہودی اح کو بازیاب کروایا گیا۔

1992ء میں اس واقعہ کے بعد ''را'' اور ''موساد'' کے تعلقات میں بہت گرم جوشی آ ئی اور دہلی میں اسرائیلی سفارت خانہ ''را'' کا گیسٹ ہاؤس بن گیا۔ گرم جوش تعلقات میں ادی کردار ان دنوں کانگریس کے وزیر اعظم نرسیما راؤ نے ادا کیا جو اپنی لیڈر آنجہانی اندرا ندھی کے اس مشن پر گامزن تھے کہ ''موساد'' اور ''را'' میں قریبی تعاون لازم ہے۔ نرسیما راؤ نے رائیلی حکومت سے درخواست کے بعد امریکی یہودیوں کے ذریعے امریکی حکومت پر دباؤ بڑھایا ہ وہ ''پاکستان کو دہشت گرد ملک'' قرار دے اور اسرائیل کی مدد سے یہ مہم بھارتیوں نے بڑے رشور سے چلائی جسے پاکستانی امریکن کمیونٹی نے ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا البتہ 1993ء ما اس بھارتی اور اسرائیلی مہم کے نتیجے میں امریکہ نے چھ ماہ تک پاکستان کو اپنی دہشت گردی کی اچ لسٹ'' میں ضرور رکھا۔

امریکی حکومت کی طرف سے ان دنوں وزیر اعظم میاں نواز شریف پر یہ دباؤ مسلسل ھتا رہا کہ وہ جنرل جاوید ناصر کو آئی ایس آئی کی سربراہی سے الگ کریں۔ سی آئی اے کی طرف ے آئی ایس آئی پر یہ دباؤ بھی بڑھا کہ وہ ان دنوں کابل میں برسر اقتدار مجاہدین حکومت سے غیر ستعمال شدہ سٹنگر میزائل بھی امریکہ کو قیمتاً واپس دلوائے لیکن آئی ایس آئی نے امریکی احکامات

قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

باور کیا جاتا ہے کہ 1993ء میں بے نظیر بھٹو کے دوبارہ برسر اقتدار آنے پر پاکستان کے اسرائیل سے خفیہ مذاکرات دوبارہ شروع ہو گئے تھے اور یہودی لابی کے ذریعے محترمہ نے امریکی حکومت میں اپنا اثر و رسوخ بھی بڑھانا شروع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 1995ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورہ امریکہ کے دوران صدر کلنٹن نے اسرائیل کے ایک اہم وفد سے ان کے ساتھ مذاکرات میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ان دنوں جنرل پرویز مشرف (ڈی جی ایم او) ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز نے جو اسرائیل کے لئے سافٹ کارنر رکھتے تھے اور اپنے دور حکومت میں بھی انہوں نے اسرائیل سے سلسلہ تعلقات کبھی ختم نہیں کیا۔ اسرائیل سے ڈپلومیٹک رابطہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔

جنرل مشرف شاید پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے سرعام پاکستان اسرائیلی تعلقات کی بات کی اور وہ دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھی کور کمانڈرز بھی ان سے اس مسئلے پر اتفاق رکھتے ہیں کہ اسرائیل اور بھارت کے قریبی تعلقات ختم کرنے میں پاکستان اسرائیل سفارتی تعلقات اہم کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن عوامی ردِعمل سے خوف زدہ بھی تھے کیونکہ پاکستانی عوام اسلام آباد میں اسرائیلی سفارت خانے کا وجود کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ آج اسرائیل اور بھارت ایک ہی سطح پر پاکستان کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ انٹیلی جنس امور پر اتھارٹی رکھنے والے جینز انفارمیشن گروپ نے جولائی 2001ء میں ایک اہم رپورٹ کے ذریعے انکشاف کیا کہ ''را'' اور ''موساد'' نے ایک جائنٹ آپریشن کے لئے پاکستان میں اہم مذہبی اور عسکری شخصیات صحافی، جج، قانون دان اور بیوروکریٹس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے چار اہم ایجنسیاں الگ سے قائم کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں ایجنسیوں کا پاکستان میں ٹرین، ریلوے سٹیشن، پل، بس سٹینڈ، ہوٹل، مساجد اور امام بارگاہوں میں دھماکوں کا پروگرام بھی ترتیب پا چکا ہے۔

پاکستان کے انٹیلی جنس ذرائع کے حوالے سے جینز نے رپورٹ کیا تھا کہ ''را'' نے پاکستان میں 20 تا 30 سال کی عمر کے نوجوانوں کو اپنے دام فریب میں پھنسا کر بھارت کے دوروں پر راغب کرنا شروع کر دیا ہے۔ ''را'' کے ایجنٹ ان فرسٹریٹڈ نوجوانوں کو مختلف ترغیبات

ذریعے بھارت جانے پر رضامند کرتے ہیں۔ انہیں جعلی کرنسی دے کر بھارت بھیجا جاتا ہے اور رت میں پہلے سے ان کے استقبال کے لئے موجود ''را'' کے افسران انہیں متعلقہ ہوٹلوں سے لی کرنسی رکھنے کے الزام میں گرفتار کرنے کے بعد بلیک میل کر کے اپنے ایجنٹ بنا لیتے ہیں۔ یہ پھر بھارت کے لئے جاسوسی اور تخریب کاری میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ ایسے کچھ نوجوان ستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے گرفتار بھی کئے تھے۔

''را'' اور ''موساد'' کا موجودہ اتحاد پاکستان، ایران، افغانستان اور سنٹرل ایشائی الک پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ جینز نے دعویٰ کیا کہ دونوں ایجنسیوں یہ اتحاد پاکستان کے حساس اور اعلیٰ اداروں اور شخصیات تک رسائی کے لئے ہر ممکن ذریعہ ستعمال کر رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ 5 نومبر 1996ء کو FIA کے چیف غلام اصغر اور ایڈیشنل ائریکٹر رحمٰن ملک (موجودہ وزیر داخلہ) کو بھی صدر لغاری کی ہدایات پر ایسے ہی الزامات کے تحت لری سے فراغت کے بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں دو قسم کی آراء پائی جاتی ہیں۔ پہلی زیادہ ضبوط رائے یہ ہے کہ ''را'' نے دونوں کے متعلق مخصوص حکمت عملی Modus Aprandi کے ت شکوک پیدا کئے اور انہیں گرفتار کروا دیا۔ دوسری رائے یہ کہ ان پر حکومت کو شک تھا۔

''را'' اور موساد'' نے مل کر مقبوضہ کشمیر میں جاری تحریک آزادی کو سبوتاژ کیا اور کستان کو عدم استحکام سے دو چار کرنے کے لئے مشترکہ آپریشن ترتیب دے۔ مارچ 2001ء کے بھارتی اخبار The Pioneer کی ایک اہم رپورٹ کے مطابق سرائیلی انٹیلی جنس موساد نے بھارتی حکومت کی طرف سے پاکستانی سرحد کے ساتھ خاردار تاروں کی تنصیب کو بھی غیر محفوظ اور نامکمل قرار دیتے ہوئے مخصوص ہائی ٹیک Gadgets کو سرحدوں لاقوں میں مخصوص ٹاورز کے ساتھ نصب کر کے سرحد کے آر پار مداخلت روکنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ''موساد'' اسرائیلی آرمی انٹیلی جنس اور اسرائیل ایئر کرافٹ انڈسٹریز (I.A.I) کے ماہرین نے سمجھوتہ ایکسپریس کے غیر محفوظ Loops کی نشاندہی کی اور اس خصوصی ٹیم کی ہدایت پر ہی ھارتی حکومت نے لاہور کے بعد سمجھوتہ ایکسپریس کا اگلا پڑاؤ ''اٹاری'' قرار دیا۔ بھارتی ہوم منسٹری کے ذرائع کے مطابق اس ٹیم نے پنجاب اور کشمیر کے درمیان (198) کلومیٹر سرحد کے چپے چپے کا سروے کیا اور بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس (B.S.F) کے ساتھ سمجھوتہ ایکسپریس کے راستے کا بھی تنقیدی جائزہ لیا۔

''موساد'' نے B.S.F کے سابق چیف ای۔این۔رام موہن کو بارڈر مینجمنٹ کا انچارج بنایا جس نے ''موساد'' کی مدد سے یہاں ریڈارز، ایئر وسیٹلائٹ بیلون اور Flirt کا جال بچھا دیا۔ بھارت کو اسرائیل کی طرف سے بطور خاص (UAVs) سرویلنس ایئر کرافٹ سسٹم بھی دیا گیا۔ یواے ویز نہ صرف پاکستان بلکہ آندھرا پردیش میں نکسل باڑی فورسز کے تدارک کے لئے بھارت کا اثاثہ ثابت ہوئے۔ برطانیہ میں سابق پاکستانی ہائی کمشنر قطب الدین نے یکم اپریل 2001ء کو ایک اہم مضمون لکھا جس میں بتایا کہ جون 2000ء میں بھارت ہوم منسٹر ایل۔کے ایڈوانی نے اسرائیل کا ایک اہم لیکن خفیہ دورہ کیا اور وزیراعظم واجپائی کو رپورٹ دیتے ہوئے بتایا کہ ''موساد'' اور ''را'' کی جائنٹ آپریشنل فورس نے ایسے منصوبے بنائے ہیں جو نہ صرف پاکستان بلکہ اسرائیل کے دشمن ممالک پر بھی دہشت طاری کر دیں گے۔ ایل کے ایڈوانی کے اس اہم دورے کے دوران ''را'' اور موساد'' کے شیطان دماغوں نے عہد کیا تھا کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے مسلم ممالک میں اپنی مذموم سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔ اس میٹنگ کا سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ دوست ممالک خصوصاً ایران، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب اور مصر میں موجود بھارتی سفارت خانوں اور قونصلیٹ میں ''موساد'' کے باقاعدہ ایجنٹ موجود رہیں گے جو یہاں موجود اپنے بھارتی ''را'' کے دوستوں کے ذریعے ان مسلم ممالک میں جاری ''موساد'' کے آپریشنز میں ہر ممکن تعاون کریں گے۔ ان مسلم ممالک میں آج بھی بھارتی سفارت خانے موساد کی آنکھیں اور کان بنے ہوئے ہیں۔

بھارت نے ''موساد'' کو اپنے ملک میں خصوصی رعایت دے رکھی ہے۔ موساد نے یہاں اپنا اینٹی ٹیررسٹ سیل بنایا ہوا ہے جس کے ذریعے وہ مسلم دہشت گردی پر نظر رکھتی ہے۔ ان کے خلاف بھارت میں آپریشن لانچ کرتی ہے اور ''را'' کی خصوصی معاونت سے انہیں آف دی ریکارڈ اغوا اور قتل تک کر دیتی ہے۔ ایل کے ایڈوانی کے ساتھ اسرائیل خفیہ مذاکرات کے لئے جانے والی اس ٹیم میں. بھارت کے اعلیٰ درجے کے سپائی ماسٹر جی آئی بی شیام لال وتا ڈائریکٹر سنٹرل انٹیلی جنس بیورو (CBI) آر۔کے راگھون چیف انڈین بارڈر سیکورٹی فورس (BSF) ای۔ایم۔رام موہن سیکرٹری ہوم منسٹری کے پانڈے جو بیرون ممالک میں ''را'' کی سرگرمیوں کے ڈیسک کا انچارج تھا بھارتی سفارت خانوں میں متعین ''را'' کے تمام افسران اس کے زیر کمان تھے۔ اس ٹاپ لیول میٹنگ میں ایڈوانی نے اپنے اسرائیلی ہم منصبوں کا بطور خاص شکریہ ادا کیا

انہوں نے بروقت اسرائیل اور بھارت کے مشترکہ دشمن پاکستان کے خلاف ان کی مدد کی اور اس ضرورت کا شدت سے احساس دلاتا رہا کہ ہندو و یہود مل کر ہی ان مسلم دہشت گردوں کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔ اس نے یہودیوں کو بتایا کہ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ بھارت اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم ہوں اور اس کی پارٹی کی کوششوں پر ہی بالآخر 1992ء میں کانگرس سرکار اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اس نے اسرائیل اور بھارت کے مشترکہ دشمن مسلم دہشت گردوں کے خلاف بھارتی انٹیلی جنس کو درکار جاسوسی کے آلات کی ایک طویل فہرست بھی اسرائیل کو دے دی جو انہیں درکار تھے۔ 14 رجون کو اسرائیل کے پولیس چیف Yehuda Wilk نے ایک خصوصی تقریب میں ایڈوانی اور اس کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا اور مشترکہ مسلمان دہشت گردوں کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر جنگ کرنے کے عزم کا اعادہ بھی کیا۔

O

اسرائیل کے لئے بھارت کے ساتھ دوستی کا سب سے بڑا فائدہ ''را'' کی اسرائیل دشمن مسلم ممالک تک بآسانی رسائی تھی۔ اسرائیل کا ٹارگٹ پاکستان، لیبیا اور ایران کے ساتھ بھارت کے مثالی تعلقات ہیں جہاں ''را'' کھل کر اپنا کام کرتی ہے۔ بھارت نے بھی اپنے ازلی دوست اسرائیل کو خوش کر دیا اور موساد کو بھارتی ہوم منسٹری (Cipu) سنٹر انٹیلی جنس پراسیسنگ یونٹ نئی دہلی تک مکمل رسائی دے دی جہاں انہیں اپنے مطلب کی تمام اطلاعات آسانی سے میسر تھیں۔ (Cipu) ایڈوانی کی خصوصی ہدایت پر اسرائیل اور امریکہ کی معاونت سے حال ہی میں قائم ہوا تھا جلد ہی (CIA) بھی اس شیطانی تثلیث کا حصہ بن گئی اور اب بھارت اسرائیل اور امریکہ مل کر مسلمان دہشت گردوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔

فیڈریشن آف امریکن سائنٹسٹ (FAOS) کی ویب سائٹ کے مطابق ''را'' نے پاکستان کے خلاف ڈس انفارمیشن جاسوسی اور تخریب کاری کی مضبوط مہم چلا رکھی ہے اور یہ سلسلہ صرف پاکستان میں نہیں اس کے تمام ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ (JTMS) جین ٹیررازم اینڈ سیکورٹی مانیٹر رپورٹ کے مطابق اسرائیل اور بھارت نے مقبوضہ جموں و کشمیر میں مشترکہ آپریشن لانچ کیا ہوا ہے۔

(بحوالہ FAOS 14 راگست 2001ء)۔

(''را'' کی بین الاقوامی دہشت گردی'' سے انتخاب)

O

بھارت اسرائیل تعلقات کا آغاز 1970ء کی دہائی میں ہوا اور 1980ء اور 1990ء کی دہائی میں ان تعلقات کو فروغ حاصل ہوا۔ ستمبر 1980ء کے دوران ایران اور عراق کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ 1982ء میں ایرانی افواج کے لئے امریکی سامان حرب وضرب کی شدید کمی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ایران کے وزیراعظم حسین موسوی نے بھارت کا دورہ کیا اور اسے تیل کی انتہائی ارزاں نرخوں پر فراہمی کا اعلان کیا۔ بھارت نے اسرائیل سے رابطہ کیا اور امریکہ ساختہ سامان حرب وضرب تل ابیب سے تہران کو منتقل کروایا۔ واضح رہے کہ اس وقت ایران کا اسلحہ کی خریداری کا مکمل انحصار امریکہ پر تھا۔ نئی حکومت کے قیام کے بعد امریکہ نے پابندی لگا دی۔ ایران عراق جنگ میں ایرانی افواج کے لئے اسلحہ کی شدید کمی کا مسئلہ پیدا ہوا تو اسرائیل نے اپنے وسیع حربی ذخائر سے ایران کو اسلحہ سپلائی کیا۔ امریکی طیارے F-14 (ٹام کیٹ) F-4 فینٹم M48 ٹینک M60 ٹینک M113 اے پی سی، 155 ایم ایم ایس لی گنز 106 ایم ایم آر آر اور دوسرا ہر قسم کا سامان ایران نے حاصل کیا اور یوں خرم شہر عراق سے واپس لیا۔

دوسری طرف اس وقت بھارت اور اسرائیل کے تعلقات بھی بڑی گرم جوشی سے پروان چڑھ رہے ہیں۔ دونوں ممالک کو باہمی تعلقات کے حوالے سے امریکی آشیر باد حاصل ہے۔ دونوں پاکستان کے بدترین دشمن ہیں۔ اسی پاکستان دشمنی کی بنیاد پر 1997ء سے دونوں کے درمیان تعلقات زیادہ وسیع ہوئے۔ انتہائی شرم ناک بات یہ ہے کہ ایک مسلم ریاست قطر کا سربراہ بھی دونوں کے درمیان رابطہ کا کام کرتا رہا 1998ء میں قطر نے اپنے 10 عدد میراج 2000 بھارت کو تحفے میں دیئے تھے۔

اس میں کوئی ابہام نہیں کہ دونوں ممالک کی بری افواج کے درمیان گہرا فوجی تعاون قائم ہے۔ اسرائیل نے بھارت کو جدید ترین ٹینک ''مرکاوا'' کی Technology فراہم کی ہے۔ یہ ٹینک امریکی ٹینک M/60A1 اور MIAI کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسرائیل نے جدید ترین ٹینک شکن نظام TOW کی ٹیکنالوجی بھی بھارت کو فراہم کر دی ہے۔ اسرائیل کے فوجی ماہرین سری نگر میں موجود ہیں اور ''بارلیولائن'' کی طرز پر بھارتی دفاع کو مضبوط بنا رہے ہیں۔ اسرائیل کی سیکوٹیکنالوجی کمپنی نے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کے ٹھکانوں کے گرد Fencing کا کام کیا ہے۔ دراصل بھارت، اسرائیل اور امریکہ کی مثلث مضبوط ہو رہی ہے۔ حال ہی میں

امریکہ کے اشارے پر اسرائیل نے طیارہ شکن میزائل سسٹم بھارت کو منتقل کیا ہے۔ اسرائیل اپنے دفاعی سودے خفیہ رکھتا ہے لہٰذا بہت سے خفیہ معاہدوں کے تحت بھی بھارت کو امداد دے رہا ہے۔

بھارت نے اسرائیل کے تعاون سے جنگی فریگیٹ Stealth Warship تیار کر لی ہے اور اسے P-17 Frigate کا نام دیا ہے۔ اس کی لمبائی 143 میٹر اور چوڑائی 17 میٹر ہے۔ ایک اسرائیلی فوجی ماہر جیرالٹ اسٹین برگ نے 2003ء میں بیان دیا تھا کہ ''اسرائیل سے ہتھیاروں کی خریداری کے باعث اور اسرائیلی تعاون، اشتراک اور تربیت کے نتیجے میں بھارت کو جدید ترین ملٹری ٹیکنالوجی تک رسائی حاصل ہو چکی ہے''۔ اسرائیل بھارت کو اسلحہ اور تربیت فراہم کرنے والا نمبر ایک ملک ہے، جبکہ روس نمبر دو پر چلا گیا ہے۔ آج بھارتی قیادت نے روس پر کلی انحصار ختم کر دیا ہے۔ اسے ہر قسم کا امریکی سامان اسرائیل سے مہیا ہو رہا ہے۔ تمام طاغوتی طاقتیں اس کے ساتھ ہیں۔ ہمارے دوست چین کے بھی اسرائیل کے ساتھ دوستانہ مراسم ہیں۔ بھارت عالمی طاقتوں کی شہ پا کر اور ان کی گود میں بیٹھ کر اس کوشش میں ہے کہ چاروں طرف سے ہمیں گھیر لے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ وطن عزیز کے کچھ طبقے بھی اسرائیل اور بھارت کے حامی ہیں۔ جنرل مشرف بھی ان میں شامل ہیں۔ قادیانی گروہ اسرائیل کا پُرجوش حامی ہے۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ اس وقت 600 پاکستانی قادیانی اسرائیل کی فوج میں شامل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کی مسلح افواج سے قادیانیوں کو نکال دیا جائے کیونکہ یہ لوگ ملک کے اہم دفاعی راز اسرائیل کے حوالے کر سکتے ہیں۔

اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان کے یہ الفاظ تاریخ کا حصہ ہیں:

"It is essential that we .... Strike and Crush Pakistanis, enemies of Jews and Zionism by all disguised and secret plans".

''یہ انتہائی اہم بات ہے کہ ہم اپنے خفیہ منصوبوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پاکستانیوں پر کاری ضرب لگا کر انہیں کچل دیں جو کہ یہودیوں اور صیہونیت کے دشمن ہیں''۔

جینز انفارمیشن گروپ (Janes information group) انٹیلی جنس معلومات کے سلسلے میں دنیا کا قابل اعتماد ادارہ ہے۔ اس کا انٹرنیٹ پر باقاعدہ ویب سائٹ بھی ہے۔ اس کی جولائی 2001ء کی رپورٹ کے مطابق ''ہندوستانی جاسوس ادارے را

(RAW) اور موساد نے باہمی اشتراک سے چار نئے گروپ بنائے ہیں جن کا کام پاکستان میں سرایت کر کے وہاں اہم مذہبی، فوجی شخصیات، صحافیوں، وکیلوں، ججوں اور بیوروکریٹس کو نشانہ بنانا ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے اسٹیشنوں، ریل گاڑیوں، لاری اڈوں، پلوں، سنیما گھروں، ہوٹلوں میں دھماکے کرانا اور مختلف مذہبی فرقوں کی مساجد میں بلاسٹ کرنا تاکہ فرقہ ورانہ فسادات بھڑک اٹھیں، ان ایجنسیوں کے ایجنڈے میں شامل ہے۔ پاکستانی خفیہ اداروں کی رپورٹ کے مطابق ''را'' نے ایک اور پلاٹ بھی بنایا ہے جس کے مطابق پاکستان میں ہندوستانی سفارت خانوں نے نوجوان لڑکوں کو جن کی عمریں 20 اور 30 سال کے درمیان ہیں ہندوستان کی سیر کے بہانے مفت ویزوں کی پیشکش کرنا ہے بعد میں ان لڑکوں کو بھارتی سرحد کے اندر ''دہشت گردی اور جعلی کرنسی'' کے جھوٹے موٹے کیسوں میں گرفتار کرنا اور پھر انہیں رہائی کے عوض پاکستان کے خلاف جاسوسی پر آمادہ کرنا ہے۔ یہود اور ہنود کا یہ پھندہ بہت پہلے تیار ہو چکا ہے جو آہستہ آہستہ پاکستان، افغانستان اور وسطی ایشیا کے ممالک میں پھیلایا جا رہا ہے۔

ہندوستانی اخبار پائیونیئر (Pionier) نے اپنے 3/مارچ 2001ء کے شمارے میں لکھا ''پاک ہند سرحد پر خاردار باڑھ لگانا کافی نہیں ہے۔ سرحد پار دہشت گردی کو روکنے کیلئے اسرائیلی فوجی ماہرین نے تجویز پیش کی ہے کہ کشمیر کی لائن آف کنٹرول اور پنجاب کی سرحد پر جدید ترین حساس راڈار اور Thermal Imaging Devices لگائی جائیں۔ اب انڈیا نے اسرائیل سے سرحدوں پر نظر رکھنے کے لئے خصوصی جاسوسی طیارے خریدے ہیں۔

موساد اور اسرائیلی آرمی کے کمانڈوز نے اپنے بھارتی ہم منصب افراد کو خصوصی تربیت فراہم کی۔ اس کے علاوہ اسرائیل نے بھارت کو جاسوسی، نگرانی (Surveillance) اور ایزا رسانی کے جدید ترین آلات وافر مقدار میں فراہم کئے۔ اسرائیلیوں کو سب سے زیادہ دلچسپی مسلم ممالک میں متعین بھارتی سفارت کاروں کی خفیہ رپورٹوں میں ہے جو بالخصوص پاکستان، ایران اور لیبیا سے بھیجی جاتی ہیں۔

دہلی میں وزارت داخلہ کے سنٹرل انٹیلی جنس پروسیسنگ یونٹ (CIPU) میں را کے ساتھ موساد کے کارندے چوبیس گھنٹے مصروف رہتے ہیں۔ وہاں مسلم سیاسی شخصیات، تنظیموں اور کشمیر حریت لیڈروں کے متعلق ڈیٹا کا تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے خلاف جاسوسی، سبوتاژ، منفی پروپیگنڈہ اور ڈس انفارمیشن (Disinformation) کے نت نئے

رام تیار ہوتے رہتے ہیں۔

اسرائیل نے پاکستان کو کبھی نہیں بھلایا۔ 9/اگست 1967ء کو ایک اسرائیلی ہفت ہ ''دی جیوش کرونیکل'' (The Jewish Chronicle) میں پہلے اسرائیلی وزیراعظم ابن گوریان کا ایک بیان شائع ہوا: ''عالمی صیہونی تحریک کو پاکستان کی طرف سے درپیش رات سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ پاکستان ہمارا پہلا ٹارگٹ ہونا چاہئے کیونکہ یہ نظریاتی ست ہماری بقاء کے لئے ایک دائمی خطرہ ہے۔ پاکستان یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے ت کرتا ہے۔ عالمی صیہونی تنظیم کو پاکستان کے خلاف فوراً اقدامات کرنا انتہائی ضروری ہے، وستان کی اکثریت ہندو ہے جن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بھرپور نفرت ہے لہٰذا وستان کی سرزمین سے ہم آسانی پاکستان کے خلاف کام کر سکتے ہیں۔''

بھارت اور اسرائیل نے 1983ء کے دوران مشترکہ طور پر کہوٹہ پر ہوائی حملے کا پلان ا تھا لیکن آپریشن کے عین ابتدائی لمحات میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا کیونکہ سی آئی اے نے اچانک اءالحق کو یہ راز منکشف کر دیا تھا۔ یہ انکشاف، حال ہی میں مارکیٹ میں آنے والی ایک کتاب:

Deception: Pakistan, the United States and the Globa Weapon Conspiracy

ا ہوا ہے۔ یہ کتاب دو تفتیشی صحافیوں Adrian Levy اور Catherine Scott-clar نے مل کر لکھی ہے۔

وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: فروری 1983ء میں بھارت اور اسرائیل کا ابھی باقاعدہ غارتی تعلق بھی قائم نہیں ہوا تھا لیکن ان کا کہوٹہ ریسرچ لیبارٹری پر ہوائی حملے کا پلان ایڈوانس سٹیج ۔ بھارتی ملٹری افسروں نے خفیہ طور پر تل ابیب کا دورہ کیا۔ انہوں نے کہوٹہ کے ایئر ڈیفنس م کو ناکارہ بنانے کے لئے جدید الیکٹرانک آلات کی خریداری کی۔ نئی دہلی کو اپنا پلان ایک اور سے بھی منسوخ کرنا پڑا جب 1983ء میں بھابھا ایٹامک ریسرچ سنٹر (انڈیا) کے ڈائریکٹر رمانا کو پاکستان ایٹامک انرجی کمیشن نے ویانا میں دھمکی دی کہ اگر بھارت نے کوئی حرکت کی تو نان ان کی ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنائے گا۔ پلان کے مطابق اسرائیلی ایئر فورس کے ایف-16 یف-15 جیٹ جہازوں نے ہندوستانی ریاست گجرات کے شہر جام نگر میں ایک ہوائی اڈے آپریشن کا آغاز کرنا تھا۔ ان طیاروں کی ری فیولنگ کے لئے شمالی ہند کے ایک دوسرے ایئر

فورس بیس کو منتخب کیا گیا تھا۔ (ایفا صفحہ 113)

مارچ 1984ء میں مسز اندرا گاندھی نے اس حملے کے پلان پر دستخط کر کے برصغیر کو ایٹمی تباہ کاری کے دھانے پر پہنچا دیا تھا۔ مذکورہ کتاب کے مطابق امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بھارت کو باقاعدہ وارننگ دی کہ اگر انہوں نے یہ حملہ کیا تو امریکہ ان کے خلاف کارروائی کرے گا۔

اندرا گاندھی نے جب اس آپریشن کو منسوخ کرنے کا حکم دیا تو بھارتی اور اسرائیلی افواج کے اعلیٰ حکام نے اس کا بے حد بُرا منایا کیونکہ کئی سالوں کی سوچ بچار اور پلاننگ یکدم رائیگاں ہوگئی۔

امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی حال ہی میں ایک دستاویز سے پتہ چلا ہے کہ اسرائیلی حملے کا پلان صدر جمی کارٹر کے دور حکومت میں ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ ڈی کلاسیفائیڈ (Declassified) ڈاکومنٹ نیشنل سیکورٹی آرکائیوز نامی ایک غیر سرکاری تنظیم نے آزادیٔ صحافت ایکٹ کے تحت شائع کیا تھا۔ اس ادارے کے ایک سینئر اہل کار نے کہا کہ یو۔ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اسے ریلیز کرنے سے پہلے اس کے بعض حساس حصوں کو سنسر کر دیا تھا یا دوسرے لفظوں میں اسرائیلی آپریشن کی مکمل تفصیلات کو حذف کر دیا تھا، اب یہ ادارہ بقیہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آسٹریلین انسٹی ٹیوٹ فار سٹریٹیجک سٹڈیز Australion Institute for Strategic Studies) کی ایک رپورٹ کے مطابق 1980ء کی دہائی میں اسرائیل۔ امریکی سی آئی اے کی فراہم کردہ معلومات اور سیاروں کی مدد سے لی گئی تصاویر کی مدد سے بالکل عراقی ری ایکٹر آپریشن کی طرز پر کہوٹہ پر حملہ کرنے کا پلان بنایا تھا۔ یہ پلان آج بھی اسرائیلی ایئر فورس کے ہیڈ کوارٹرز میں اَپ۔ڈیٹ ہوتا رہتا ہے۔ ایئر فورس کے ایف 16 اور ایف 15 سکوارڈرن کے پائلٹوں کو وقتاً فوقتاً خصوصی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اسرائیل کے جنوبی صحرائے نگیو میں کہوٹہ کا پورا ماڈل بنایا گیا ہے جہاں اسرائیلی ایئر فورس کے مذکورہ طیارے حملے کی مشق کے دوران غوطے لگاتے رہتے ہیں۔

پاکستانی ایٹمی تنصیبات پر حملے کے لئے ان ہوابازوں کو چنا گیا تھا جنہوں نے آپریشن بے بیلون میں حصہ لیا تھا۔

اسرائیل نے اس آپریشن کے لئے دو تجاویز اپنے سامنے رکھی تھیں۔

(1) بھارتی ہوائی اڈوں کا استعمال

(2) اسرائیل سے نان۔سٹاپ براہ راست کہوٹہ۔ پرواز کے دوران ان طیاروں کو فضا میں دوبارہ ایندھن مہیا کرنے کے لئے ایک ہوائی ٹینکر مختص کیا گیا۔ اس کے علاوہ پاکستانی ایئر ڈیفنس سسٹم کو ناکارہ بنانے کے لئے اسرائیلی ایواکس (Awacs) طیارے کو مشن میں شامل کیا گیا۔

بھارت اس سلسلے میں اسرائیل کی بڑی خوشامد کرتا رہا کہ وہ جلد از جلد اس منصوبے کو عملی جامہ پہنائے لیکن ساتھ ہی وہ اپنے ہوائی اڈوں کو استعمال کرنے سے کتراتا رہا تھا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس صورت میں اس کے اپنے ایٹامک تنصیبات پاکستان ایئر فورس کے نشانے سے بچ نہیں سکیں گے۔

ریگن ایڈمنسٹریشن نے بھی دونوں ممالک کو وارننگ دے دی تھی۔ اس سلسلے میں امریکی دلچسپی کی بنیادی وجہ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ تھی اور پاکستان اس کا ان کوششوں میں اہم فریق تھا۔ اس دوران پاکستان نے اسرائیل کو صاف کہلوا دیا کہ اگر انہوں نے پاکستان میں کسی مہم جوئی کی کوشش کی تو یاد رکھنا کہ اس کا مقابلہ عراقی ایئر فورس سے نہیں بلکہ پاکستان ایئر فورس سے ہوگا۔ ایک دوسرے ذریعے سے اسلام آباد نے انہیں یہ بھی باور کرایا کہ ان کے ممکنہ آپریشن کی صورت میں پی اے ایف (PAF) صحرائے نگیو میں واقع ڈیمونا نیوکلیئر ریسرچ سنٹر کو نشانہ بنائے گی۔

1981ء میں اسرائیلی آپریشن بے بیلون کی کامیابی کے بعد جنرل ضیاء الحق نے پی اے ایف ہیڈ کوارٹرز کو اپنا دفاعی نظام انتہائی چوکس کرنے کا اور پاکستان پر حملے کی صورت میں جوابی کارروائی کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ اس پر ایئر ہیڈ کوارٹر چکلالہ میں سپیشل آپریشن روم قائم کیا گیا۔

میراج-3 کے ایک سکواڈرن کو اسرائیلی ایٹمی تنصیبات پر حملے کے لئے ریڈ الرٹ کر دیا گیا۔

13 رمئی 1998ء کو بھارت نے جب ایٹمی دھماکہ کیا تو پاکستانی نیوکلیئر تنصیبات پر اسرائیلی اور بھارتی ایئر فورسز (Air Forces) کے مشترکہ حملے کا امکان انتہائی بڑھ چکا تھا۔ ان

نازک حالات میں پی اے ایف نے مملکت خداداد کی حفاظت اس قدر موثر انداز میں کی کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ چاغی میں ایٹمی سائنسدان ٹیسٹ میں مصروف تھے اور پاکستان کے عین اوپر ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر آسمان پاکستان ایئر فورس کے جیٹ لڑاکا طیاروں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی بھی دشمن طیارے کے لئے پاکستانی فضاؤں میں داخل ہونا ناممکن ہو چکا تھا۔ دوسری طرف زمین پر اینٹی ایئر کرافٹ گنز اور ریڈار سسٹم انتہائی چوکس حالت میں تھے۔ دھماکے سے ایک روز قبل پاکستان ایئر فورس کا ایک ایف-16 چاغی کے علاقے میں انتہائی نیچی پرواز کرتا ہوا اچانک گزرا تو نیچے پاکستانی ایئر ڈیفنس سسٹم والوں نے سمجھا کہ شاید کوئی اسرائیلی جیٹ حملہ کرنے آ گیا ہے۔ اسی غلط فہمی میں واشنگٹن میں پاکستانی سفیر نے اسرائیلی سفارت خانے سے زبردست احتجاج کیا لیکن انہوں نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اقوام متحدہ میں پاکستانی سفیر احمد کمال نے سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:۔

''ہمارے پاس ٹھوس ثبوت ہیں کہ بھارت ہماری ایٹمی تنصیبات پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر اس نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو پاکستان کی جوابی کارروائی اس سے زیادہ تباہ کن ہوگی''۔ (16 رمئی 1998ء سی این این کو انٹرویو)

مئی 1998ء میں پی اے ایف نے پورے پاکستان کی حفاظت کا جو زبردست آپریشن شروع کیا تھا اسے آپریشن بدر کا نام دیا گیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد آپریشن تھا جس میں پی اے ایف کے چاروں کمانڈ سیکٹر ہیڈ کوارٹرز نے بھرپور حصہ لیا تھا یعنی پشاور، سمنگلی (کوئٹہ) فیصل (کراچی) اور سرگودھا۔ انٹیلی جنس اطلاعات کے مطابق بھارت اسرائیل کا مشترکہ حملہ نہ صرف پاکستانی ایٹمی تنصیبات پر بلکہ خاران اور اس کوہ کے نیوکلیئر ٹیسٹ سائٹس پر بھی ہو سکتا تھا۔ بھارتی اور امریکی جاسوس اداروں کو خاران ڈیزرٹ سائٹس کا بالکل علم نہیں تھا۔ مغرب یا جنوب مغرب کی طرف سے کسی بھی ممکنہ ہوائی حملے سے بچنے کے لئے پاکستان نے کوئٹہ میں 1982ء سے TPS-43G ہائی لیول ریڈار سسٹم نصب کیا ہوا تھا۔

مئی 1998ء میں پاکستان کے دو مقامات نے دنیا بھر میں زبردست شہرت اختیار کی، یعنی چاغی کے پہاڑوں اور دالبندین ایئر فیلڈ نے، دالبندین (Dalbandin) چاغی سے انیس کلومیٹر جنوب مشرق میں ریت کے ٹیلوں میں واقع ہے اس کے قریب ہی پاک افغان سرحد ہے۔

دالبندین ایئر فیلڈ 1935ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ سمنگلی ایئر بیس کے متبادل کے طور پر بنایا گیا تھا، دوسری جنگ عظیم کے دوران اسے رائل انڈین ایئر فورس نے افغانستان یا ایران کے راستے ممکنہ روسی حملے سے نبٹنے کے لئے استعمال کیا۔ 1970ء کی دہائی میں یہ ایئر فیلڈ پی اے ایف کے استعمال میں نہیں رہا۔ یہ ہوائی پٹی انتہائی بلندی سے صاف دکھائی دیتی ہے لیکن پائلٹ جب اس پر لینڈنگ کی کوشش کرتے ہیں تو یہ آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہی کیونکہ پٹی پر پھیلی ہوئی ریت اور اردگرد کے ریتلے ٹیلے انسانی بصارت کو دھوکہ دیتی ہیں۔ یہ قدرتی طور پر کیموفلاج جگہ ہے۔ یہاں ریت کے طوفان بسا اوقات چلتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے جہازوں کے لئے لینڈنگ اور ٹیک آف میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ 1985ء میں سول ایوی ایشن (Civil Aviation) نے اس کی بڑے پیمانے پر مرمت کی اور یہاں ایئر ٹریفک کنٹرول اور دیگر جدید سہولیات کا انتظام کیا۔

1998ء میں چاغی اور دالبندین کے درمیان جہازوں کی آمد و رفت بڑے زور و شور سے شروع ہوئی۔ ٹیسٹ سے چند دن پہلے پی اے ایف کے دو دیو ہیکل سی 130 ٹرانسپورٹ طیاروں میں نیوکلیئر آلات الگ الگ حصوں میں چکلالہ سے دلبندین ایئر فیلڈ پہنچائے گئے۔ ان طیاروں کی حفاظت کے لئے ایف-16 جیٹ لڑاکا طیارے اس کے اردگرد اوپر نیچے پرواز کرتے رہے۔ دوران سفر ان حفاظتی جہازوں کے ریڈیو مکمل آف رکھے گئے تھے تاکہ انہیں کسی جعلی حکم سے گمراہ نہ کیا جا سکے۔

29 رمئی 1998ء کو پاکستان نے چھٹا ایٹمی دھماکہ کر کے دنیا کو انگشتِ بدنداں کر دیا۔ چاغی کا پہاڑ سفید راکھ کا ڈھیر بن گیا لیکن اسرائیل اور بھارت کا پاکستان کے خلاف مہم جوئی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان ایئر فورس کا آپریشن بدر اپنے انجام کو پہنچا۔ مئی 1998ء میں مذکورہ حملے کا امکان کتنے فیصد تھا، اس کا جواب تو مشکل ہے۔ لیکن خطرات کچھ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ انہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسرائیل اپنے اردگرد تمام مسلم ممالک کے ویپن سسٹم پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ پاکستان کے بعد وہ سب سے زیادہ ایران کے نیوکلیئر پروگرام سے خوف زدہ ہے۔

O

آئی ایس آئی ہی کیوں؟

اس مرحلے پر ایک اہم سوال یہ ہے کہ بھارت میں اگر کسی کو چھینک بھی آ جائے تو وہ آئی ایس آئی ہی پر کیوں چڑھ دوڑتے ہیں؟ اور پاکستان میں اگر کوئی انہونی ہو جائے تو اسے بھی آئی ایس آئی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ ہر سیاسی حکومت نے اس ایجنسی کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا اور اس پر اپوزیشن میں آ کر الزام تراشی شروع کر دی۔

بھرت ورما بھارت کا متعصب ہندو عسکری تجزیہ نگار اور بھارتی آرمی کے پرچے 'ڈیفنس جنرل' کا ایڈیٹر ہے۔ اس نے غالباً 1999ء کے آخری دنوں میں (تاریخ مجھے یاد نہیں) بی بی سی پر ایک مذاکرے میں بڑے تلخ لہجے میں ایسی بات کہہ دی جس نے ہمیں تو چونکایا ہی تھا۔ بھارتیوں کو بھی آئی ایس آئی کی برتری قبول کرنے پر آمادہ کر لیا، بھرت ورما نے کہا:۔

"تم کیا جھک مار رہے ہو۔ آئی ایس آئی سو ڈیڑھ سو لونڈے تیار کر کے کشمیر بھیجتی ہے اور اس نے تمہاری پانچ لاکھ فوج کو ان کے ہاتھوں پندرہ سال سے یرغمال بنا رکھا ہے"

یہ ایک طرح سے آئی ایس آئی کی برتری کا بھی اعتراف تھا اگر واقعی اس نے مقبوضہ کشمیر میں انسرجنسی شروع کی ہے تو وہاں ایک وقت میں سو سے ڈیڑھ سو تک مجاہدین یا بھارتی زبان میں "گھس بیٹھیے" مصروف کار ہوئے ہیں۔ جنہوں نے بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیئے بھارتی فوج کے مورال کا کیا عالم ہے؟ اس میں خودکشیوں کا تناسب کیا ہے؟ جوانوں کا اپنے افسروں کو بسا اوقات گولی مار دینا، عام طور پر گالی گلوچ اور حملہ آور ہونا اور فوج سے فرار کا تناسب کیا ہے؟ بھارتی تزویراتی اداروں کے نزدیک یہ شرمناک اور انتہائی تکلیف دہ ہے جو ایک

فیشنل آرمی کے ہرگز شایان شان نہیں۔

اس مرحلے پر یہ بات جان لینی چاہئے کہ پاکستان کی فوج Defensive Arm ہے جو حملہ ہونے پر ہی متحرک ہوتی ہے اس کی تربیت، تشکیل اور تربیت بھی اسی انداز میں ئی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہوں گی جس پر الگ کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن تزویراتی علوم کا لب علم اس پر ہمیشہ معترض رہا کہ آخر ہم Efensive یعنی جارح کیوں نہیں جبکہ جارحیت شہ بھارت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کا جواب تو ظاہر ہے کوئی ذمہ دار ہی دے گا لیکن یہ جان اضروری ہے کہ پاکستان کے تمام دفاعی ادارے اس حکمت عملی Modus Aprandia کے ند ہیں۔ اس لئے آئی ایس آئی جارحیت بھی ناگزیر حالات میں کرتی ہوگی۔

اس ضمن میں بریگیڈیئر (ر) ترمذی کی کتاب Profiles of Intelligence ے کچھ صفحات کا ترجمہ حاضر ہے۔ جس سے آئی ایس آئی کا کیس سمجھ آ جاتا ہے۔

ہم پاکستانی، چاہے وردی میں ہوں یا سادہ لباس میں، پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی ود کی پاسبانی ہمارا اولین منصب ہے۔ چونکہ ہم ہمیشہ بھارت کے اول درجے کے دشمن رہیں ے، اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے وطن کے خلاف بھارت کی مذموم سرگرمیوں، سازشوں منصوبہ بندیوں کا منہ توڑ جواب دیں۔ ہم نے اپنے کئی سالوں کے تجربے سے بھارت کے خفیہ ریقہ کار، انداز اور عمل کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ پاکستان نی کے حوالے سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں اپنے اہلکاروں اور خفیہ ایجنٹوں کو کس طرح استعمال رتا ہے۔

بھارت کے سفارت خانے اور قونصلیٹ سے منسلک تمام اداروں میں کام کرنے لے بھارتی اہلکاروں کو تمام ممکنہ ذرائع سے پاکستان کے بارے میں مفید معلومات حاصل کرنے خصوصی تربیت دی جاتی ہے اور گاہے گاہے سرحد پار سے دہشت گرد، خفیہ ایجنٹ اور تخریب کار ما پاکستان بھیجے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ایجنسیوں کے کاؤنٹر انٹیلی جنس کے شعبہ کو ہمہ ت بھارت کی جانب سے ایک مستقل چیلنج کا سامنا رہتا ہے۔ پاکستان میں بھارتی سفارت روں اور اہلکاروں کو چار مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو وزارت خارجہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بھارتی ارت خانے اور قونصلیٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ یہ لوگ صحافیوں، شہر کے معززین،

تاجروں، صنعتکاروں اور اعلیٰ سرکاری حکام کے ساتھ اپنے ''سماجی'' تعلقات استوار کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں اور گپ شپ کے دوران ان سے معلومات اخذ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ان کا دوسرا پسندیدہ حلقہ سیاستدانوں کا ہے۔خاص طور پر وہ پرانے سیاستدان جو ہمیشہ اپوزیشن میں رہے ہیں اور ان کی حیثیت بھارت کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں بھی تسلیم کی جاتی ہے۔

یہ سفارتکار اپنے کام کا آغاز عموماً سماجی تقریبات اور مختلف پارٹیوں کے انعقاد سے کرتے ہیں۔ان پارٹیوں کا انعقاد یوں تو وہ محض سوشل تعلقات بڑھانے کے لئے کرتے ہیں مگر ان کے پیچھے ان کا اصل مقصد ٹیلنٹ کی تلاش، فہرست سازی اور مہمانوں کی مختلف حیثیتوں کے مطابق ان کو مختلف درجوں اور گروہوں میں تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ان عمومی تقریبات کے بعد ان ''خصوصی دوستوں'' کے لئے خاص تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے جن کے بارے میں انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ان کے مقاصد کے حصول کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور جن سے بعض اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔یہ تعلقات بظاہر کھلم کھلا استوار کئے جاتے ہیں اور مہمانوں کو اپنے میزبانوں سے یہ ملاقاتیں انتہائی بے ضرر معلوم ہوتی ہیں مگر یہ ان میزبانوں کا کمال فن ہے کہ وہ اپنی تربیت کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں کام کی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور یوں ملاقات در ملاقات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان خصوصی دعوتوں کا اہتمام عموماً سفارت کاروں کی رہائش گاہوں پر کیا جاتا ہے۔ یہاں مہمانوں کو موم بتی کی ہلکی سی روشنی اور کلاسیکی موسیقی کی مدھر دھنوں میں شراب کے جام پیش کئے جاتے ہیں۔کچھ پاکستانی بھائی اسے جنس نایاب سمجھتے ہیں۔ان سفارت کاروں کی بیویاں اس سحر انگیز ماحول میں اپنی روایتی ساڑھیوں میں ملبوس اپنے حسن کی نمائش کرتی اور مسکراہٹیں بکھیرتی ایک مہمان سے دوسرے مہمان پر اپنی نیم باز آنکھوں کے جادو چلاتی رہتی ہیں۔ایسے ماحول میں ان کی زیر لب گفتگو سے بھی پیار اور دوستی کا امرت رس ٹپکتا رہتا ہے۔یہ اپسرائی ماحول اتنی مہارت اور مکاری سے پیدا کیا جاتا ہے کہ مہمان کے لئے جان بچانے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا اور وہ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کے ذہن کے دریچے اپنے میزبانوں کی عین توقع کے مطابق کھلنے لگتے ہیں۔یوں یہ سفارت کار اپنے مہمانوں کو سیاسی، اقتصادی، سماجی اور دفاعی معاملات پر بحثوں میں الجھا لیتے ہیں اور ان سے نہ صرف ان معاملات پر ان کی آراء حاصل

رتے ہیں بلکہ مختلف امور پر ان کا ردعمل جاننے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور بالآخر اس موصی اجتماع میں انہیں ایک دو ایسے رازدار مل جاتے ہیں جن کے ساتھ ان کا مستقل رابطہ استوار جاتا ہے۔ان میں بعض کو غیر سفارتی سرگرمیوں کے لئے تحفظات فراہم کرنے کے لئے باقاعدہ یر کے طور پر بھی رکھ لیا جاتا ہے۔کچھ لوگ سفارتی حلقوں میں پذیرائی کو اپنے لئے اعزاز سمجھتے ئے اس خوب صورت جال میں پھنس جاتے ہیں۔کچھ محض ''اچھا'' وقت گزارنے اور اچھی راب پینے کے شوق میں اس حلقہ میں آ جاتے ہیں۔بعض بزرگان وطن اپنے ان نام نہاد بھائیوں ربھاوجوں کے فریب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔کچھ کے لئے یہی خوشی کا باعث ہوتا ہے کہ سیاسی یفوں، حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کے بارے میں ان کی آراء کو اہمیت دی جا رہی ہے اور انہیں غور سے سنا جا رہا ہے۔وہ اپنی گفتگو کو ذہنی فرسٹریشن کے اظہار کے لئے طول دیتے رہتے ہیں اور ان اقاتوں کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

پاکستان کے خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے متعدد بار اس قسم کی محفلوں میں شرکت لرنے والے ان معززین اور بزرگوں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ ان کی ملاقاتوں کا زیادہ تر وضوع کیا رہا؟ تو شہر کے یہ معززین اپنے بنیادی حقوق کی پامالی کا شکوہ بڑے فخر سے اپنے ہندو دستوں سے بھی اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ایجنسیاں ان کی نگرانی کرتی ہیں، ان کا پیچھا کیا اتا ہے اور ان کو تفتیش کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ان میں سے بہت کم لوگوں کو اس بات کا حساس ہوتا ہے کہ ملک کا دفاع اور سلامتی انتہائی مقدم شے ہے اور خفیہ ایجنسیوں کو اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے اپنا کردار ہر حال میں ادا کرنا پڑتا ہے۔اس کے برعکس بعض لوگ وطن پرستی کے جذبے کے ساتھ ان ایجنسیوں کے ساتھ بھرپور تعاون بھی کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ وہ سفارت کار اور غیر سفارت کار ہیں جن کا تعلق دفاعی سروسز، پولیس، انٹیلی جنس بیورو یا ''را'' سے ہوتا ہے اور انہیں مختلف اداروں میں کسی اور روپ میں تعینات کیا جاتا ہے۔ان کی اکثریت ویزا جاری کرنے والے دفاتر میں کام کرتی ہے اور ان کے نمائندے اکثر اوقات ویزا کے حصول کے لئے آنے والے معصوم شہریوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔یہ لوگ اپنے رویے میں خاصے شاطر اور پُراعتماد ہوتے ہیں۔ان کی حرکات وسکنات مختلف ہوتی ہیں اور ان کا رویہ پُراعتماد ہوتا ہے یہ لوگ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے، یہ دفتری اوقات کے بعد بھی کسی نہ کسی مشن پر ہوتے ہیں۔مثلاً کسی خاص ملاقات کے لئے، کسی خفیہ معاملے کی تکمیل

کے لئے، اپنی نگرانی کرنے والوں کو پہچاننے کے لئے یا ان کی توجہ حاصل کرنے کے لئے یا کسی بامقصد ڈرائیو پر یا پھر اپنے کسی ساتھی کو خفیہ والوں سے بچانے کے لئے دھوکہ دہی کے کسی مشن پر جاتے ہیں تاکہ ان کی توجہ حاصل کر کے اپنے ساتھی کو نکل جانے کا موقع فراہم کر سکیں۔

تیسرا گروپ ماتحت عملے کا ہے جن کی سرگرمیوں کا دائرہ دفاتر سے گھروں تک ہی محدود رہتا ہے، یہ لوگ اکثر شام ڈھلے مقامی مارکیٹوں میں اپنی بیگمات کے ساتھ روزمرہ کی ضرورت کی اشیاء کی خریداری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آمدنی اپنے افسران کے مقابلے میں خاصی کم ہوتی ہے، اس لئے وہ دوکانداروں کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرتے ہیں اور پاکستان میں دال سبزی گوشت کی قیمتوں کا بھارتی مارکیٹوں میں ان اشیاء کی قیمتوں سے موازانہ کرتے سنائی دیتے ہیں، مگر اکثر اوقات ان کی قوت خرید گوبھی کے پھول یا ایک کلو آلو ہی کی متحمل ہوتی ہے۔ بھارتی سفارت خانے کا یہ ماتحت عملہ انتہائی ناگزیر حالات میں زندگی گزارتا ہے۔ ان کا تعلق بھی اکثر اوقات بھارت کے غریب گھرانوں سے ہوتا ہے، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تنخواہ میں سے ایک ایک پائی کی بچت کریں تاکہ مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد گھر روانگی کے وقت ان کے پاس اتنا سرمایہ جمع ہو جائے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی باعزت طریقے سے گزار سکیں۔ بھارت میں چونکہ خالص نمک کمیاب ہے اس لئے یہ لوگ بھارت چھٹی پر جاتے ہوئے اکثر پاکستانی نمک ساتھ لے جاتے ہیں، یہ لوگ مقامی باشندوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اپنے پڑوسیوں سے بھی ان کی کوئی رارسم نہیں ہوتی۔

چوتھا گروپ ان لوگوں کا ہے جو سفارتخانے یا قونصلیٹ کے ملازمین نہیں ہوتے بلکہ خاص مقاصد کے تحت ایمبسی سکول، ایئر لائنز کے دفاتر، بینکوں اور اخبارات کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ان گروپوں سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ ہماری طویل سرحدوں سے تخریب کاروں، دہشت گردوں اور خفیہ ایجنٹوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

پاکستان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس کے لئے بھارتی کارروائیاں ایک مستقل چیلنج ہیں اور ہم اس چیلنج کا مقابلہ انتہائی وقار، پیشہ وارانہ مہارت اور شاندار منصوبہ بندی سے کرتے ہیں۔ ہم بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' RAW کی اس کے اہداف میں کسی حد تک کامیابی کو تسلیم کرتے ہیں مگر جس طرح بھارت کو آئی ایس آئی کا فوبیا ہے ہمیں RAW کی جانب سے اس قسم کی کوئی پریشانی یا دباؤ کا سامنا نہیں۔ آئی ایس آئی بھارتیوں کے لئے بہرام آ گیا، کے مصداق انتہائی شدید

اعصابی دباؤ کا موجب ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بمبئی سے لے کر آسام تک اور مدراس سے لے کر کشمیر تک جہاں کہیں بھی آزادی کی کوئی تحریک جنم لیتی ہے، کوئی احتجاج ہوتا ہے یا بم کا کوئی دھماکہ ہوتا ہے۔ بھارتی اداروں کو اس کے پیچھے آئی ایس آئی کا خفیہ ہاتھ دکھائی دیتا ہے اور اب تو عالم یہ ہے کہ بھارتی مائیں آئی ایس آئی کا نام لے کر بچوں کو ڈراتی ہیں۔

متعدد بار ایسا ہو چکا ہے کہ بھارت سیکورٹی کے اہلکاروں نے پاکستانی سفارت کاروں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس اپنی ناکامی کا غصہ ان سفارت کاروں پر نکالتی ہے اور یہ سراسر ہماری کامیابیوں کے ردعمل کے طور پر بھارتی اہلکاروں میں پیدا ہونے والی فرسٹریشن اور کنفیوژن کا اظہار ہے۔

انہیں جب بھارت میں پاکستان سفارت کاروں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا تو وہ پاگلوں کی طرح ان پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ بھرے بازار میں اپنی جنتا کے سامنے گالی گلوچ کرتے ہیں اور مار پیٹ سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پاکستان ہائی کمیشن کے عملے کے اراکین اور سفارت کاروں کے خلاف جو بھی کارروائی ہوتی ہے وہ بھارتی ایجنسیوں کی ناکامی اور نااہلی کا کھلا اعتراف ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس قسم کے واقعات سے بھارتیوں کے قومی کردار اور ذہنیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ ان پر تشدد کی کارروائیوں میں اخلاق کی تمام حدود پار کر جاتے ہیں۔ اس ضمن میں میرے ایک دوست مسٹر ملک کی مثال سنئے جو نئی دلی میں پاکستان ایمبیسی میں فرسٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو کر گئے۔

وہ 2 دسمبر 1981ء کو اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ نئی دلی پہنچے۔ ان کا قیام سردار پٹیل روڈ پر رچ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ اپنے قیام کے پہلے ہی روز جب وہ رات کے کھانے سے واپس آئے تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں کمرے کی تلاشی لی گئی ہے۔ انہوں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ کمرے کا جائزہ لیا تو انہیں بجلی کے سوئچ بورڈ کے پیچھے چرس کا ایک پیکٹ ٹھونسا ہوا ملا، غالباً بھارتیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مقامی اور عالمی پریس کے نمائندوں کو اکٹھا کیا جائے اور ان کی موجودگی میں مسٹر ملک کے کمرے پر چھاپہ مار کر چرس ''برآمد'' کی جائے، انہیں منشیات کا سمگلر ثابت کیا جائے اور یوں عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کیا جائے۔ مسٹر ملک نے فوری طور پر سفیر صاحب سے رابطہ کیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ یقیناً بھارتی خفیہ ایجنٹ ہوٹل کا سٹاف کارکن ہوگا کہ اس نے فون پر مسٹر ملک کی سفیر صاحب سے گفتگو سن لی۔ اس نے اپنے افسروں کو بتا

دیا ہوگا۔ چنانچہ اس گفتگو سے بھارتی خفیہ ادارے کی اس منصوبے پر پانی پھر گیا۔

یوں مسٹر ملک کی عقل مندی اور بروقت اقدام سے پکستان کا ایک معزز سفارت کار منشیاب کی سمگلنگ کے الزام سے بچ گیا۔ اگلے روز ہمارے سفیر نے اس واقعہ پر نہ صرف انڈین فارن آفس سے شدید احتجاج کیا بلکہ ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کر ڈالی جس میں مسٹر ملک کے کمرے سے برآمد ہونے والا چرس کا پیکٹ بھی صحافیوں کو دکھایا گیا۔ یوں ''را'' کی کالی ہنڈیا بیچ چوراہے ٹوٹ گئی اور چانکیا کے چیلوں کو منہ کی کھانی پڑی۔

ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے اس قسم کی بھونڈی اور گھٹیا منصوبہ بندی کبھی نہیں کی۔ اگر ہمیں کبھی کسی بھارتی اہلکار کے منہ پر تھپڑ مارنا بھی پڑا تو یہ محض مجبوری کے عالم میں ہوا اور اس سے بھارتیوں کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ اگر نئی دلی میں ہمارے بھائی محفوظ نہیں ہیں تو اسلام آباد میں ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یوں بھی بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دشمن کے ساتھ اس زبان میں بات کی جائے جسے وہ اچھی طرح سمجھتا ہو اور بندر صرف یہی زبان سمجھتا ہے۔

پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات کے حوالے سے بھارت نے ہمیشہ سے مکارانہ رویہ اور انداز اپنایا ہے اور اپنے گرو چانکیا کے اس فرمان پر پوری طرح عمل کیا ہے کہ ''تمہارا سب سے قریبی ہمسایہ کبھی تمہارا دوست نہیں ہو سکتا''۔

1971ء کی جنگ کے بعد جب پاک بھارت سفارتی تعلقات بحال ہوئے تو آئی ایس آئی نے بھارتی سفارت کاروں کی کلیئرنس چند ہی روز میں بھجوا دی مگر بھارتی حکام نے ہمارے عملے کی کلیئرنس کو جان بوجھ کر التوا میں ڈالے رکھا اور ہمارے فارن آفس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ بھارتی عملے کو فوری طور پر اسلام آباد آنے کی اجازت دی جائے۔ ہمارا خیال تھا کہ دونوں جانب کے عملے کو ایک ہی وقت میں بھیجا جانا چاہئے اور بہتر بھی یہی ہوگا کہ واہگہ کی مشترکہ چیک پوسٹ پر دونوں ملکوں کے سفارتی عملہ کا ایک دوسرے سے تعارف ہو۔

تاہم ہمارا دفتر خارجہ بھارتی سفارت کاروں کو خوش آمدید کہنے کے لئے بہت بے چین دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے اپنی بھرپور کوشش کی کہ ہماری سفارشات کو نظر انداز کر دیا جائے، یہاں تک کہ انہوں نے ڈی جی آئی کو بھی اس بات پر قائل کر لیا کہ بھارتی عملے کے فوری آ جانے میں کوئی حرج نہیں، چند روز میں ہمارے عملے کو بھی کلیئرنس مل جائے گی مگر میں نے ڈی جی آئی کو

صاف کہہ دیا کہ بھارتی حکام چالاکی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور وہ پاکستانی عملے کی کلیئرنس کو غیر معینہ مدت تک ملتوی رکھیں گے۔ اگر ان کا عملہ اسلام آباد پہنچ گیا تو ہمارے پاس پاکستانی عملی کی کلیئرنس کے لئے بھارت پر دباؤ ڈالنے کے لئے کچھ نہیں ہوگا۔ ڈی جی آئی صاحب نے میرے نقطہ نظر سے اتفاق کیا اور ہم اس امر کو یقینی بنانے میں کامیاب ہو گئے کہ دونوں ملکوں کا سفارتی عملہ بیک وقت ہی واہگہ چیک پوسٹ پار کرے گا۔

کچھ اس طرح کی صورت حال بمبئی میں پاکستانی قونصلیٹ اور کراچی میں بھارتی قونصلیٹ کھولنے کے وقت بھی پیدا ہوئی۔ میں نے اس بار پھر یہی تجویز پیش کی کہ ہم بھارتی عملے کو کلیئرنس اس وقت دیں گے جب دونوں دفاتر بیک وقت کھلنے کے انتظامات مکمل کر لئے جائیں، مگر ہمارے دفتر خارجہ نے ایک بار پھر ہماری تجویز کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ محض ضابطے کی کارروائی ہے اور بھارتی حکام نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جونہی برطانیہ جناح ہاؤس خالی کرے گا، اسے صرف پاکستان کے حوالے کر دیا جائے گا بلکہ پاکستانی عملے کو شاندار استقبالیہ بھی دیا جائے گا۔ میں نے اس کے جواب میں فارن آفس کو لکھا کہ ''ہندو ذہنیت کو سمجھنے کے لئے کیا ہمیں اور تجربات کی ضرورت ہے؟ میرے الفاظ کہیں کندہ کر لیں کہ بھارت نہ صرف اپنے وعدے سے مکر جائے گا، بلکہ بمبئی میں ہمارا قونصلیٹ کھولنے میں جہاں تک ممکن ہو سکا لیت ولعل سے کام لے گا'' مگر ہمارا دفتر خارجہ ایک بار پھر ہمیں نظر انداز کرنے کے لئے بے چین تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ سندھ میں رہنے والے پاکستانیوں کو بھارتی ویزے کے حصول کے لئے سخت مشکلات کا سامنا ہے اور ان کی سہولت کے لئے کراچی میں بھارتی قونصلیٹ کا جلد از جلد قیام بے حد ضروری ہے، مگر میں بھی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ جب تک ہم بمبئی میں اپنا قونصلیٹ نہ کھول لیں، بھارتیوں کو کراچی میں نے کی اجازت نہ دی جائے، مگر بدقسمتی سے فارن آفس نے ایک بار پھر اپنے ''جذبات'' کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

''آپ سمجھتے ہیں کہ صرف آئی ایس آئی ہی پاکستان کی وفادار ہے اور فارن آفس کی وفاداری مشکوک ہے؟''

چنانچہ ہماری سفارشات کی بالکل پرواہ نہ کی گئی اور کراچی میں بھارت کو یکطرفہ طور پر اپنا قونصل خانہ کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ ادھر بھارتی حکام نے بمبئی میں ہمارا قونصل خانہ کھولنے کی راہ میں نہ صرف انتظامی اور سفارتی رکاوٹیں پیدا کیں بلکہ وہ جناح ہاؤس ہمارے

حوالے کرنے کے وعدے ہی سے مکر گیا۔ کراچی پہنچتے ہی بھارتی قونصلیٹ کے سٹاف نے سندھ میں نہ صرف امن وامان کی صورت حال کو خراب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا بھی بلکہ وہ تخریب کاری میں ملوث ہو گیا۔ بھارت نے نہ صرف جناح ہاؤس ہمارے حوالے نہیں کیا بلکہ پاکستانی سٹاف سے اس قسم کا سلوک روا رکھا گیا کہ بالآخر پاکستان بمبئی میں اپنا قونصل خانہ بند کرنے پر مجبور ہو گیا اور جن حالات کے تحت بمبئی سے پاکستانی عملہ واپس آیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اس کے ردعمل طور پر بھارتیوں کو بھی کراچی سے نکالنا پڑا۔

(Profiles of Intelligence مصنف بریگیڈئر (ر) سید اے آئی ترمذی)

اس نوعیت کے متعدد واقعات ہماری انٹیلی جینس تاریخ کا حصہ ہیں مئی 2009ء میں لاہور میں آئی ایس آئی کے دفتر پر دہشت گردوں کا ناکام حملہ اور اس سے پہلے آئی ایس آئی اور دیگر سیکورٹی اداروں پر حملے یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ آئی ایس آئی ہی کیوں پاکستان دشمنوں کا ٹارگٹ بنتی ہے۔

OOO

ٹارگٹ پاکستان ہے

امریکہ کے معروف ہفتہ روزہ ٹائم نے 14 جنوری 2008ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پاکستان کی عمومی صورتحال کے حوالے سے ایک اہم آرٹیکل بعنوان "WHY PAKISTAN MATTER شائع کیا جس کے مصنف سائمن روبنسن ہیں، اس ون کی زہرناکی کا اندازہ اس کی ذیلی سرخیوں سے کیا جا سکتا ہے۔ مصنف کہتا ہے

No one Save Benazer Bhutto. Why we need to Sa Pakistan?

امریکی ذہنیت کا اندازہ اس ذیلی سرخی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ سائمن روبنسن لکھتا

Benazer Bhutto's assassination has plunged the Musl nuclear power in to Chaos. Now the Bush Administration m help undo decades of flawed U.S policy to Save Pakistan.

(ہفت روزہ ٹائم 14 جنوری 2008ء صفحہ 16)

قیام پاکستان کے بعد سے آج تک ہم نے امریکی دوستی کی جو قیمت چکائی ہے اس کا بیان

آگے آئے گا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکن بڑے دعوے سے ہمیں دھوکہ دیتے اور اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ انہیں پاکستان سے لڑکی لڑکے والا عشق نہیں، اپنے معاملات کی حد تک وہ اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں اور بس..... تاریخ نے تین مرتبہ پاکستان کے حوالے سے امریکنوں کا امتحان لیا۔ 1971ء میں اُن کا ساتواں بحری بیڑہ ہماری مدد کو آتا رہا ہم انتظار کرتے رہے۔ پاکستان دولخت ہو گیا۔ افغان جہاد (اصلی والا) میں اُن کی آمد نہ افغانوں کو روسی استعماریت سے نجات دلانے کے لئے تھی نہ ہی وہ پاکستان سے اظہار محبت کرنے آئے تھے، وہ ایک منصوبے کے تحت یہاں آئے، افغانستان کا بیڑہ غرق کیا، روس کو توڑا، پاکستان کو ہیروئن، دہشت گردی اور کلاشنکوف کا کینسر لگایا اور کان لپیٹ کر چلے گئے۔ آج اگر ہلیری کلنٹن اپنے اس تاریخی جرم کا اقرار کر رہی ہے کہ ہم نے پاکستانیوں کو دنیا بھر کے دہشت گرد (مجاہدین) جمع کر کے دیئے۔ اپنا اُلو سیدھا کیا اور یہاں سے بھاگ گئے جس کے بعد ہمارے یہ سانپ پاکستان کے بدن کو نیلا کرتے رہے جب انہوں نے پاکستان کا خون اچھی طرح چوس لیا اور ہمارا نائن الیون کیا تو ہم دہائی دینے لگے، میں اس تاریخی اعتراف پر مسز ہلیری کلنٹن کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ اُن کے پیشرو اسے چالاکی اور بہادری سمجھتے تھے۔ وہ دھوکہ دہی اور منافقت کو سفارکاری اور ڈپلومیسی کہتے ہیں۔

اب وہ افغانستان کا تورا بورا کرنے کے بعد پاکستان کی طرف لپکے ہیں تو اُس کی وجہ ہماری شدت پسندوں سے نجات نہیں بلکہ امریکنوں کو یہ خوف دامنگیر ہے کہ کہیں پاکستان کا نیوکلیئر اثاثہ طالبان کے ہاتھ نہ لگ جائے اور وہ امریکہ کا تورا بورا نہ کر دیں۔ ایک خوفزدہ شخص، ملک یا قوم کی جو نفسیات ہوتی ہے امریکن اُس کا شکار ہیں اور اُن سے ہر ایسے اقدام کی توقع رکھنی چاہئے جس کا کوئی خوفزدہ نفسیاتی مریض مظاہرہ کر سکتا ہے، اگر ہم نے یہ بات سمجھ لی تو ہم موجودہ جنگ جیت جائیں گے بصورت دیگر امریکی ہمیں ڈالروں کی بھیک دے کر ہمارے شہروں پر ڈرون حملے جاری رکھیں گے اور ان حملوں کے ردِعمل کا شکار ہم ہوں گے امریکہ نہیں۔ جو ایک طرف آگ بجھانے کی ترغیب دیتا اور دوسری طرف مسلسل آگ بڑھاتا چلا جاتا ہے تاکہ اس خطے میں اُس کی موجودگی کا جواز قائم رہے۔

سوات، فاٹا، بلوچستان ہر جگہ سازشوں کا ایک جال پھیلا ہے، سی آئی اے کی آشیرواد سے ''را'' ''موساد'' ''ایم آئی 6'' اور دوسری ایجنسیوں کے علاوہ ڈرگ مافیا، دہشت گرد اور ملک

دشمن عناصر شیطانی اتحاد بنا کر ہم پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ آیئے اس سازش کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ سازش کو سمجھ لینے سے ہم آدھی جنگ لڑے بغیر جیت جائیں گے بصورت دیگر ہم ایک دوسرے کا گریبان پھاڑتے رہیں گے اور دشمن اپنا اُلو سیدھا کرتا رہے گا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے قبائلی علاقہ جات میں روس کے اعلان واپسی کے فوراً بعد ہی سے جرائم پیشہ، دہشت گرد اور غیر ملکی مجاہدین نے ڈیرے جما لئے تھے، طالبان حکومت کا افغانستان میں قیام پاکستان کا بڑا کارنامہ تھا لیکن نائن الیون کی سازش نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ امریکہ اس سازش کی آڑ میں بدنام افغانستان میں گھس آیا۔ افغانستان میں موجود امریکہ کے ساتھ مجاہدین اور موجودہ دہشت گرد پاکستان کی طرف لپکے ہم انہیں کیسے سنبھالتے اور کہاں سنبھالتے کہ ہم تو خود سہاروں کے محتاج ہیں۔ ہماری کمزوری، بزدلی، نااہلی کچھ بھی کہہ لیجئے نے ان لوگوں کو یہاں اپنا کھیل کھیلنے کا موقعہ دیا اور آہستہ آہستہ سلگتی یہ لکڑیاں ایک روز آتش فشاں بن کر ہمیں جھلسانے لگیں۔ جنرل مشرف نے امریکہ کے عشق میں ان پر چڑھائی کی تو انہوں نے جنرل صاحب کا بدلہ پاکستانی قوم سے لینا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

غیر ملکی دہشت گرد

21 فروری 2006ء بروز منگل انگریزی معاصر ''دی نیوز'' نے صفحۂ اوّل پر ایک حیرت انگیز خبر شائع کی جسے پڑھنے کے بعد ایک نیا منظر سامنے آتا ہے۔ یہ منظر ہمیں بتاتا ہے کہ ''فاٹا'' کی بعض ایجنسیوں میں مسلح غیر ملکیوں نے اتنی طاقت اور استحکام حاصل کرلیا ہے کہ وہ نہ صرف مقامی شہریوں کو تنگ کر کے اُن پر دہشت طاری کرنے کے عادی ہو گئے ہیں بلکہ پاکستان کے قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی چیلنج کر رہے ہیں۔ پشاور کی ڈیٹ لائن سے شائع ہونے والی مذکورہ بالا خبر کا متن کچھ یوں ہے:

''شمالی وزیرستان ایجنسی کے ایک معروف قصبے میر علی کے نزدیک ایک گاؤں میں مقامی قبائلیوں اور ازبکستانی مسلح افراد کے درمیان خونریز تصادم ہو گیا۔ 20 فروری کو ہونے والے اِس تصادم میں دو مسلح حملہ آور ازبکستانی ہلاک اور مقامی قبائلی نوجوان جاں بحق ہو گئے۔ ایک دوسرا قبائلی نوجوان، جس کا نام حنیف اللہ بتایا گیا ہے، شدید زخمی ہو گیا۔ اُسے مقامی ہسپتال میں ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد پشاور منتقل کر دیا گیا۔ سرکاری ذرائع کا کہنا تھا کہ قتل ہونے والے غیر ملکیوں کی لاشیں اُن کے ساتھی فوری طور پر وہاں سے لے گئے جبکہ مقامی قبائلی ذرائع کا دعویٰ ہے کہ اُنہوں نے مرنے والے دونوں غیر ملکیوں، جن کے بارے میں وثوق سے کہا جا رہا ہے کہ وہ

ازبکستانی تھے، کی لاشیں اپنے قبضے میں لے لیں اور اُنہیں مقامی قبرستان میں دفن کر دیا۔ یہ سانحہ میر علی قصبے کے نزدیک ایک گاؤں حسوخیل، جو میر علی قصبے کے جنوب میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، میں پیش آیا۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ مسلح حملہ آور نوجوان سفید رنگ کی ایک گاڑی پر سوار تھے اور گاڑی پر کوئی نمبر پلیٹ بھی نہیں لگی تھی۔ وہ لوگ حسوخیل آئے اور ایک قبائلی نوجوان شان زیب، جو شیر نواب کا بیٹا تھا، پر گولیوں سے حملہ کر دیا۔ شان زیب کی عمر 17 سال تھی اور وہ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ گولیاں لگنے سے شان زیب شدید زخمی ہو گیا۔ مرنے سے قبل اُس نے اپنے آخری بیانات میں کہا کہ حملہ آور ازبکستانی تھے جو شمالی وزیرستان ہی میں رہتے ہیں۔ شان زیب کے بیان کے مطابق، اِن لوگوں نے چند روز قبل اُس سے بھاری معاوضے پر ٹیکسی کرائے پر مانگی تھی لیکن اُس نے انکار کر دیا تھا۔ اِس بات کا اُنہیں رنج تھا کیونکہ مقامی لوگ ازبکستانیوں کے سامنے عموماً انکار نہیں کرتے ہیں۔ شان زیب نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اِنہی لوگوں نے اِسی بات کا بدلہ لینے کے لئے مجھ پر حملہ کیا ہے۔''

''دی نیوز'' کی خبر کے مطابق اس سانحہ کے بعد مقامی دیہاتیوں نے ازبکستانیوں پر ہلا بول دیا۔ اِس میں ایک ازبکستانی ہلاک ہو گیا، دوسرا ازبکستانی فرار ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے مزید ازبکستانی ساتھیوں کے ساتھ اپنے مقتول ساتھی کا بدلہ لینے کے لئے حملہ آور ہو گیا۔ اُس کی یہ بھی کوشش تھی کہ اپنے مرنے والے ساتھی کی لاش بھی قبضے میں لے لی جائے۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ حسوخیل کی عیدگاہ کے نزدیک دوبارہ طرفین میں گولیاں چلیں۔ اِس بار ایک اور ازبکستانی مارا گیا۔ اِس حملے میں مذکورہ گاؤں کا ایک قبائلی نوجوان حنیف اللہ بھی شدید زخمی ہو گیا۔ دوسرے ازبکستانی اپنی گاڑی میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ خبر میں کہا گیا ہے کہ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں آج کل عمومی طور پر اُنہی لوگوں پر یہاں پناہ یافتہ غیر ملکی حملہ کرتے ہیں جو اُن کے بارے میں فوج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اطلاعات فراہم کرتے ہیں لیکن مقتول شان زیب پر کیوں حملہ کیا گیا، اِس بارے میں کوئی مصدقہ بات سامنے نہ آ سکی کیونکہ شان زیب اور اُس کا خاندان اُن لوگوں میں شامل نہیں جن کے بارے میں وثوق سے کہا جائے کہ یہ لوگ غیر ملکیوں کے بارے میں حکومتی اداروں کو اطلاعات فراہم کرتے ہیں..... لیکن اِس سانحہ سے یہ حقیقت ایک بار پھر بہرحال سامنے آئی کہ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں غیر ملکی مسلح دہشت گرد موجود ہیں، وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور اس سلسلے میں حکومتِ پاکستان جو کچھ کہہ رہی

ہے وہ محض پروپیگنڈہ نہیں ہے۔

(دی نیوز..... 21 فروری 2006ء)

شمالی وزیرستان کے قصبے میر علی کے نزدیک ایک گاؤں حسوخیل میں وقوع پذیر ہونے والے مذکورہ بالا سانحہ کے ساتھ ہی انگریزی معاصر ''ڈان'' نے شمالی وزیرستان ہی کے حوالے سے ایک چھوٹی سی خبر شائع کی۔ اِس خبر کے مطابق شمالی وزیرستان ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ سید ظہیر الاسلام نے میران شاہ میں ایک جرگے سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''ہم، آپ سب کا اور خصوصاً اس ایجنسی کے بزرگوں، مذہبی رہنماؤں اور سیاسی شخصیات کا بنیادی فریضہ ہے کہ یہاں جتنے بھی غیر ملکی رہائش پذیر ہیں اور وہ جیسی بھی سرگرمیوں میں ملوث ہیں، اُن کے بارے میں مصدقہ اطلاعات حکومت اور حکومتی اداروں کو فراہم کریں۔ یہ غیر ملکی نہ صرف ملک کے لئے دردِسر بن گئے ہیں بلکہ انہوں نے یہاں کے معزز اور مہمان نواز قبائلیوں کی مہمان نوازی اور دریا دلی کا بھی ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس لئے لازم آتا ہے کہ اِن سے جلد از جلد چھٹکارا پایا جائے اور انہیں یہاں سے نکال باہر کیا جائے۔ اِس سلسلے میں اِن غیر ملکیوں کو یہاں سے نکال باہر کرنے کے لئے حکومت جو کوششیں کر رہی ہے، آپ سب کا فرض ہے کہ اِن کوششوں میں حکومت کے دست و بازو بنیں۔''

(روزنامہ ڈان..... 22 فروری 2006ء)

شمالی اور جنوبی وزیرستان میں یہ غیر ملکی کون تھے؟ یہ کہاں سے آئے تھے؟ ان کی تعداد کتنی تھی؟ اُنہیں یہاں لانے اور بسانے والے کون تھے؟ مقامی سطح پر وہ کونسے ہاتھ ہیں جو ان مسلح غیر ملکیوں کی ہر طرح سے اعانت کرتے رہے ہیں؟ اِس امداد اور اعانت سے اُنہیں خود کیا حاصل ہو رہا ہے؟ اِن سوالات کے جوابات جاننے کے لئے ہمیں کچھ عرصہ پیچھے جانا پڑے گا!!

10 جون 2004ء کو پاکستان فوج کو وانا آپریشن کے دوسرے راؤنڈ کا آغاز کئے دوسرا روز گذر رہا تھا کہ وطنِ عزیز کے سب سے بڑے شہر، جسے پاکستان کی معاشی شہ رگ بھی کہا جاتا ہے، کراچی میں ایک ایسے سانحے نے جنم لیا جس نے پاکستانی عوام کے ساتھ ساتھ پاک فوج کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ اُس روز کراچی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل احسن سلیم حیات پر دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا۔ جنرل احسن سلیم ایک مسلح کارواں کی معیت میں دفتر جا رہے تھے کہ صبح ساڑھے آٹھ بجے اُن پر حملہ ہو گیا جس میں اگرچہ جنرل صاحب کو اللہ نے محفوظ رکھا مگر اُن کے ڈرائیور

سمیت سات افراد دہشتگردوں کی گولیاں کا نشانہ بن کر جاں بحق ہو گئے۔ اس حملے نے حساس اداروں میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں۔ اس سے قبل اسی انداز میں دہشت گرد عناصر نے راولپنڈی میں صدر جنرل پرویز مشرف کے قافلے پر حملہ کیا تھا اب اس دوسرے حملے نے سب کو حیران اور ششدر کر دیا تھا لیکن یہ دوسرا حملہ زیادہ تر اس لئے بھی پریشان کن خیال کیا گیا کہ جنرل احسن سلیم حیات ایک غیر سیاسی عہدے دار ہیں، اُن سے کسی کی مخالفت سمجھ سے بالاتر تھی۔ سوال اٹھائے گئے کہ کراچی کے کور کمانڈر سے کسی کو کیا مخاصمت ہو سکتی ہے؟ اور کیا یہ حملہ کسی طرف سے حساس اداروں کو پیغام تھا؟

21 فروری 2006ء کو اِن حملہ آوروں کو کراچی کی عدالت نے سزائے موت سنا دی۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ حملہ آور ''جنداللہ'' تنظیم کے وابستگان تھے۔ اِس سزا کے حوالے سے 22 فروری 2006ء کو اخبارات نے جو خبریں شائع کیں، اُن کے متن کے مطابق: ''انسدادِ دہشت گردی کی عدالت کے جج فیروز محمود بھٹی نے کور کمانڈر کراچی کے قافلے پر حملہ کرنے کے الزام میں قائم مقدمے میں ملوث ملزمان اور کالعدم ''جنداللہ'' جماعت کے 11 کارکنوں کو دہشت گردی اور قتل کے جرم میں سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ فاضل عدالت نے بم دھماکہ کرانے، املاک کو نقصان پہنچانے اور اقدامِ قتل کے جرم میں ہر ملزم کو مجموعی طور پر 49 سال قید بامشقت کی سزا سنائی ہے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں ملزمان کو بم دھماکہ کرنے کے الزام میں عمر قید اور اُن کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد ضبط کرنے کا حکم سنایا جبکہ اقدامِ قتل میں 14 سال قید بامشقت، پچاس پچاس ہزار روپے جرمانہ، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کے الزام میں دس دس سال قید، پچاس پچاس ہزار روپے جرمانہ کا حکم سنایا گیا۔ عدالت نے اپنے ریمارکس میں کہا کہ ملزمان ایک ایک لاکھ روپے بطور جرمانہ مقتولین کے ورثا کو ادا کریں گے۔ فاضل عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ بھی قرار دیا کہ ملزمان کو سزائے موت ہائیکورٹ سے توثیق کے بعد دی جائے گی، عدالت سے سزا پانے والے ملزمان میں عطاء الرحمٰن، شہزاد باجوہ، عزیز احمد (عبداللہ) دانش امام، خرم سیف اللہ، شعیب محمد صدیق، راؤ خالد، شہزاد مختار، عدنان شاہ عرف ٹیپو، یعقوب سعید اور نجیب اللہ شامل ہیں جبکہ محمد اسم، شہاب، بلال، حماد اور طیب اس مقدمے میں مفرور ہیں، عدالت انہیں پہلے ہی اشتہاری قرار دے چکی ہے۔ ملزمان کے خلاف مقدمہ ایس ایچ او بوٹ بیسن واصف قریشی کی مدعیت میں ایف آئی آر نمبر 165/4 کے تحت درج کیا گیا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران عدالت میں استغاثہ کے

32 گواہان پیش ہوئے۔ استغاثہ کے مطابق 10 جون 2004ء کو کور کمانڈر کراچی احسن سلیم حیات اپنے قافلے کے ہمراہ کور ہیڈ کوارٹر جا رہے تھے کہ پرنس کمپلیکس اور کلفٹن برج کے قریب گھات لگائے بیٹھے ملزمان نے حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں 6 فوجی جوان افضل شاکر، شاہد حسین، طارق نوید، ہیڈ کانسٹیبل نذیر احمد، لیاقت گجر اور ایک راہ گیر اشوک ہلاک ہو گئے تھے جبکہ امجد علی، کریم بخش، عبدالقادر، محمد الیاس، گل شیر، محمد حسین، ارشد علی، محمد افضل اور لانس نائیک آصف سہیل، عابد حسین، فرید اقبال اور گل خان زخمی ہوئے۔ مقدمے کے فیصلے کے موقع پر کے ایم سی ریسٹ ہاؤس میں واقع عدالت کے گرد و نواح میں سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے، فیصلے کے فوراً بعد جج اپنے چیمبر میں چلے گئے اور ملزمان نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عدالت کا یہ فیصلہ ہمارے لئے اعزاز ہے اور ہمارے حوصلے بلند ہیں۔"

ابھی جنرل احسن سلیم حیات پر حملے کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا میں جنوبی وزیرستان کی ممتاز ترین شخصیت نیک محمد کا پیغام بھی مبینہ طور پر سامنے آیا: "اسلام آباد، پشاور اور لاہور میں بھی ایسی ہی کارروائیاں ہوں گی۔" میڈیا کے بعض چینلوں سے اس جملے اور دھمکیوں کے حوالے سے اقرار (Confessions) کی ٹیپ سنا دی گئی جس میں مبینہ طور پر نیک محمد یہ سب کچھ کہتے سنائی دیئے۔ حملے کے روز جب ایک نجی ٹی وی نے پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل شوکت سلطان سے نیک محمد کے بارے میں استفسار کیا تو وہ کمپیئر کامران خان سے شدید ناراض ہو گئے تھے اور جب شوکت سلطان صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اُنہوں نے کہا: "نیک محمد کو آپ میڈیا والے اتنا بڑھا چڑھا کر پیش نہ کریں۔ اُس کی اتنی حیثیت نہیں کہ وہ اس طرح کے حملے کرنے کی جرأت کر سکے۔" ممکن ہے شوکت سلطان صاحب بھی اپنے تئیں درست کہتے تھے لیکن لوگوں نے اس حوالے سے بہرحال یہ ضرور سوچا کہ چلو میڈیا والے تو ممکن ہے نیک محمد کو مبالغہ آرائی کر کے بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ وانا آپریشن کے پہلے راؤنڈ کے خاتمے کے بعد پشاور کے کور کمانڈر نیک محمد کو پھولوں کے ہار پہنانے اور اُن کی خدمت میں دونوں ہاتھوں سے تحفے میں تلوار پیش کرنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ اگر نیک محمد کی "اتنی اوقات" نہیں تھی تو مبینہ معاہدہ شکئی میں نیک محمد کی مرکزی حیثیت کو کیوں اور کس نے تسلیم کیا تھا؟

15 جون 2004ء کی صبح پاک فوج کے ترجمان اور آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل

شوکت سلطان کی طرف سے وانا آپریشن کے دوسرے راؤنڈ کے حوالے سے ایک اعلان ان الفاظ میں شائع ہوا: "جنوبی وزیرستان میں آپریشن کے دوران 55 غیر ملکی دہشتگرد مارے گئے جبکہ فوج کے 17 اہلکار شہید ہوئے۔ 9 اور 10 جون کو ہونے والے آپریشن میں 35 دہشتگرد مارے گئے جبکہ سکیورٹی فورسز کے 15 اہلکار شہید ہوئے، 11 اور 12 اور 13 جون کے آپریشن میں پاک فوج کے صرف 2 اہلکار شہید ہوئے اور 20 دہشتگرد مارے گئے اور شکئی میں پاک فوج نے کنٹرول سنبھال لیا ہے اور وہاں سے غیر ملکی دہشتگردوں کا صفایا کر دیا گیا ہے اب مقامی قبائل سے سیاسی مذاکرات کے ذریعہ یہ طے کیا جائے گا کہ اس علاقے میں غیر ملکی دہشتگرد دوبارہ داخل نہ ہوں۔ شکئی اور دوسرے علاقوں میں ترقیاتی کام شروع کئے جا رہے ہیں تاکہ یہاں کے عوام کے بنیادی مسائل حل کئے جا سکیں۔"

حیرانی کی بات ہے کہ اس اعلان اور بیان میں وانا آپریشن کی مرکزی شخصیت نیک محمد کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں کیا گیا اور اُنہیں جس انداز میں دانستہ نظر انداز کیا گیا، اس سے یہ اعلان سننے اور پڑھنے والوں کو بہت سی باتیں کھٹکیں، سب سے بڑا سوال یہ سامنے آیا کہ اگر شکئی میں، شوکت سلطان صاحب کے اعلان کے مطابق، پاک فوج نے کنٹرول سنبھال لیا ہے تو پھر نیک محمد کہاں ہیں؟ اور اُن کا معروف زمانہ "کنٹرول" کہاں گیا؟ کیا اُنہیں ہمیشہ کیلئے خاموش کرا دیا گیا؟

مولانا معراج الدین صاحب جنوبی وزیرستان سے ایم ایم اے کے رکن اسمبلی تھے۔ یہ وہی مولانا صاحب ہیں جنہوں نے معاہدہ شکئی میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اب دوسری بار وانا میں ملٹری آپریشن کی مخالفت کرتے ہوئے مولانا معراج الدین کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مولانا فضل الرحمٰن انہی مولانا معراج الدین کے رہنما بھی ہیں، اس پس منظر میں دونوں حضرات کی جانب سے نیک محمد کی حمایت اور ملٹری آپریشن کی مخالفت سمجھ میں آتی تھی..... مگر اس مخالفت کو اُس وقت کے وفاقی وزیر مواصلات بابر خان غوری نے ذرا مختلف انداز میں دیکھا۔ اُنہوں نے 14 جون 2004ء کو اسلام آباد میں سینئر کالم نگاروں کی ایک مجلس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "وانا آپریشن کی مخالفت کرنے والے مولانا فضل الرحمٰن نے 1997ء میں نواز شریف حکومت اور سرحد کے وزیر اعلیٰ سردار مہتاب خان عباسی سے خود آپریشن کی درخواست کی تھی کیونکہ مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھیوں اور شاگردوں کو جنوبی وزیرستان کے بعض شر پسند لوگوں نے اغوا کر

لیا تھا۔ آج وہی کام ایسے ہی بعض مفسد اور شر پسند عناصر کے خلاف اور ملکی مفاد میں جنرل پرویز مشرف کر رہے ہیں تو یہ حضرات سیاسی سکور حاصل کرنے کے لئے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔''

(روزنامہ دی نیوز.....15 جون 2004ء)

کالم نگاروں کی اس مجلس میں شریک بہت سے افراد بابر غوری صاحب کے اس انکشاف پر حیرت زدہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف کو محض اس لئے مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ کراچی میں ایم کیو ایم (الطاف گروپ) اور ایم ایم اے کے درمیان شدید مناقشت اور تصادم جاری تھا اور طرفین ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

جناب حافظ حسین احمد ایم ایم اے کی ممتاز شخصیات میں سے ایک شمار ہوتے ہیں، وہ ایم ایم اے کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر بھی تھے۔ وانا میں دوسری بار آپریشن شروع ہوا اور نیک محمد کا نام ایک بار پھر اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا میں گونجنے لگا تو راقم اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب معمول وہ ہونٹوں اور آنکھوں سے مسکراہٹ کے چراغ روشن کئے محبت سے ملے۔ وانا میں ملٹری آپریشن اور نیک محمد کے ''نیک'' کردار کے بارے میں میرے استفسار پر حافظ حسین احمد ایم این اے فرمانے لگے: ''قبائلی علاقوں میں بمباری اور آپریشن معاہدہ شکئی کو سبوتاژ کرنے کی سازش ہے جس کیلئے خفیہ ہاتھ سرگرم عمل ہے۔ آپریشن میں براہ راست امریکی ہیلی کاپٹر حصہ لے رہے تھے اور انکے لئے میانوالی ایئرپورٹ کو ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔ یہ ملک میں خانہ جنگی کی صہیونی سازش ہے جس کی ہم مزاحمت کریں گے۔ مسلح افواج سے کہیں زیادہ ایک کروڑ قبائلی مغربی سرحدوں پر دفاعی حصار کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انہیں دیوار سے لگا کر مخصوص مقاصد کے حصول کیلئے حکمران سرگرم عمل ہیں، انہیں یہاں پھر لینے کے دینے پڑیں گے اور سوائے شرمندگی اور ندامت کے ان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ قوم کو بتایا جائے کہ یہ نیک محمد نامی شخص کون تھا اسے کس نے بنایا اور کس نے ان کی مجاہدانہ تربیت کی، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارا کھیل ملکی سلامتی پر اثر انداز ہونے کے لئے ہے۔ جب کور کمانڈر کی کوششوں سے قبائل اور علماء کے ساتھ معاہدہ شکئی ہوا تو ضروری تھا کہ اس سے آگے کے اقدامات ہوتے، اس معاہدے میں کسی رجسٹریشن کا ذکر نہیں، مفتی نظام الدین شامزئی قبائلی علاقوں میں امن مفاہمت کو آگے بڑھانے کیلئے جانے والے تھے انہیں ایک روز پہلے راستے سے ہٹا دیا گیا۔ ایم ایم اے وانا کے مسئلہ کو ملکی سلامتی کے حوالہ سے الارمنگ سمجھتی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ملک کے اندر خانہ جنگی ہو اور آگ بھڑکے۔''

ممکن ہے جناب حافظ حسین احمد کے اس استدلال اور بیان سے بعض لوگ اختلاف کریں لیکن اتنا ضرور یاد رکھا جائے کہ ایم ایم اے کے منتخب ہونے والے ایم این ایز اور ایم پی ایز زیادہ تر وہ لوگ تھے جو نیک محمد اور اُن کے آس پاس بسنے والے جہادیوں کے ہمدرد رہے ہیں اور اُن کی محبتیں ہی اُنہیں اسمبلیوں میں لائی تھیں۔

جنوبی وزیرستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ علاقہ ''وانا'' میں دہشتگردوں کی صفائی اور اُن کے مبینہ سرپرست نیک محمد کے خلاف ملٹری آپریشن جاری تھا کہ قومی اسمبلی میں اپوزیشن رہنما مولانا فضل الرحمٰن چارسدہ میں تشریف لائے۔ وہ اپنے ساتھ اسلام آباد سے چند اخبار نویسوں کو بھی لے گئے تھے جن میں راقم بھی شامل تھا۔ مقصد یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے سابق وزیراعلیٰ آفتاب خان شیرپاؤ صاحب اور حال کے وزیر داخلہ کے بھائی کی دعائے مغفرت میں شریک ہوا جائے۔ راستے میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے بار بار کہا کہ معاہدہ شکئی امریکہ کے دباؤ پر پاکستانی حکمرانوں نے منسوخ کیا اور اسی بنیاد پر پھر وانا میں آپریشن کیا گیا جس کے نتائج منفی انداز میں سامنے آئیں گے۔ مولانا فضل الرحمٰن سے جب راقم نے دریافت کیا کہ آیا وانا میں مقیم غیر ملکیوں کی رجسٹریشن کا حکومتی مطالبہ غیر منطقی اور غیر ضروری تھا تو اُنہوں نے کہا: ''رجسٹریشن کا مطالبہ بے ضرر تھا مگر دوسرے فریق (نیک محمد اور پناہ یافتہ غیر ملکی) کی طرف سے بھی کچھ تحفظات تھے۔ طاقت کے استعمال سے قبل اُن کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔''

وزیرستان میں غیر ملکیوں کی آمد

اگر عالمی سطح پر رواں لمحوں میں مسئلہ کوکشمیر، چیچنیا اور عراق پر امریکی قبضے کی بازگشت سنائی دے رہی ہے تو اس گونج اور بازگشت میں پاکستان کے جنوبی وزیرستان میں جاری کشمکش کے حوالے سے بھی کچھ حیرت انگیز آوازیں سنائی دے رہی ہیں خصوصاً جنوبی وزیرستان کے علاقے ''وانا'' کو عالمی شہرت ملی جسے نیک محمد نے اپنے مخصوص کردار سے ایک نیا رنگ اور ایک نیا آہنگ بخشا تھا۔ افغانستان سے سوویت یونین کی واپسی کے بعد افغانستان کے اندر جس نئی خونریز صورتحال نے جنم لیا، کہا جاتا ہے نیک محمد اسی کی پیداوار تھے۔ افغانستان کے اندر بظاہر جہاد کے خاتمے کے بعد ایک ''نئے جہاد'' نے جو شکل اختیار کی اور بعدازاں طالبان نے جس تیزی سے افغانستان کے اکثریتی حصے پر اپنی حکومت کا پرچم لہرایا، نیک محمد ایسے کئی پاکستانی ''مجاہدین'' نے اسی تگ ودو اور کشمش میں جنم لیا۔ اب جبکہ بظاہر وانا آپریشن کے خاتمے کا اعلان سامنے آچکا ہے لوگ نیک محمد کے کردار اور زندگی کے بارے میں متجسس ہیں کہ خواہ عوام کچھ بھی ہوں، اس شخص نے اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، خالد شیخ محمد، ابوزبیدہ، شبیہ الرمزی اور ابومصعب الزرقاوی کے بعد ایک نئے انداز میں عالمی شہرت حاصل کی تھی، حتیٰ کہ ''ٹائم'' ایسا بین الاقوامی جریدہ اس کی بڑی بڑی تصویریں شائع کرنے پر مجبور ہوا۔

جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں افغانستان میں قابض سوویت فوجوں کے خلاف پاکستان سے جس جہاد کا آغاز کیا گیا اور مذہبی اور جہادی جذبات کا جو دریا دریائے کابل کی لہروں

کے مخالف چڑھا، نیک محمد اسی دریا کی ایک لہر تھے۔ اس ''لہر'' نے 1975ء میں جنوبی وزیرستان میں جنم لیا۔ 1980ء کے عشرے میں جنوبی وزیرستان کا علاقہ ''وانا'' افغانستان میں جا کر روسی فوجوں کے خلاف جہاد کرنے والوں کا ''لانچنگ ہیڈ'' کہلاتا تھا کہ مجاہدین یہیں اکٹھے ہوتے اور جہاد کی ضروری تیاری کے بعد اس عظیم کارواں کا حصہ بن جاتے جو پاکستان کی مغربی سرحدوں سے شروع ہو کر افغانستان کے صوبوں زابل سے پکتیا تک ایک زنجیر کی طرح پھیلتا چلا گیا تھا۔ ''فاٹا'' کی یہ ایجنسی، جنوبی وزیرستان اُن دنوں امریکی خفیہ ادارے ''سی آئی اے'' اور پاکستان کے بعض حساس اداروں کے تجربہ کار اہلکاروں سے سجی نظر آتی کہ یہ لوگ قبائلی مجاہدین کو روسی فوجوں کے خلاف جنگ پر اُبھارنے، اُنہیں ضروری جنگی تربیت سے آراستہ کرنے اور جہاد میں کام آنے والے ہر ممکنہ اسلحہ سے لیس کرنے کے فرائض انجام دیتے نظر آتے۔ اس دوران عالم عرب کے بہت سے مجاہدین نے وانا اور وانا سے متصل علاقے میں کنکریٹ کے کئی بنکرز تعمیر کر لئے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کے مساجد فنڈز کی شکل میں کئی ملین ڈالر کے چندوں نے اس علاقے میں نئی مساجد اور نئے دینی مدرسوں کو بھی متعارف کروایا۔ ان میں عرب نوجوان بھی واضح طور پر نظر آنے لگے۔ ہر کوئی سوویت یونین فوجوں کو جہاد کی بے پناہ طاقت سے شکست دینے کے جذبات سے سرشار نظر آنے کے ساتھ اس امر کا بھی دعویٰ کرتا نظر آتا کہ ہم انشاء اللہ دنیائے طاغوت کو ''دارالسلام'' میں تبدیل کر کے رہیں گے۔

نیک محمد کے والد صاحب کا نام نواز خان ہے جو وانا میں معمولی درجے کے زمیندار تھے اور اس اعتبار سے ''چھوٹے سے ملک'' بھی کہلاتے ہیں۔ ''مالکی'' کے وارث ہونے کے ناطے وہ ان لوگوں میں بھی شامل رہے ہیں جنہیں پاکستان کی وفاقی حکومت سے وظائف اور مراعات دی جاتی ہیں۔ نواز خان ''خاصہ داری'' کے بھی اہل تھے اور اس بنیاد پر وہ اپنے علاقے کے کسی بھی بڑے سردار اور ملک کے حکم پر پولیس کے فرائض بھی انجام دے سکتے تھے۔ نیک محمد کے والد گرامی نواز خان دوسروں مَلکوں کے مقابلے میں ایک غریب آدمی تھے۔ ان کی تھوڑی سی زمین بھی ہے جس میں وہ اپنے چار بیٹوں کے ساتھ کاشتکاری کرتے مگر اس سے اتنی ہی یافت ہوتی جس سے زندگی کی بنیادی ضرورتیں بمشکل ہی پوری ہوتیں۔ نواز خان کی یہ زمین ''وانا'' کے علاقے ''کالوشاہ'' میں ہے۔ (اور یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے مبینہ طور پر دریافت ہونے والی بعض زیرِ زمین سرنگوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ حکومت نے دعویٰ کیا تھا کہ انہیں سرنگوں کے ذریعے دہشت گرد جنوبی

وزیرستان سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ایک سرنگ کے بارے میں کہا گیا تھا کہ نیک محمد کے بڑے بھائی محمد شریف کے گھر کے نیچے سے گذرتی ہے۔)

وانا میں فروکش مولانا نور محمد وزیر کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ وہ نیک محمد صاحب کے پہلے استا ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ جہاد افغانستان (اصلی والا) کے دوران مشرق وسطیٰ سے مساجد فنڈز کے نا سے جو بے تحاشہ پیسہ وانا میں آیا، مولانا نور محمد وزیر اُن لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے ان فنڈ کے حصول کے بعد وانا میں ایک شاندار دینی مدرسہ قائم کیا جو آج علاقے بھر میں ''جامعہ دارالعلو وزیرستان'' کے نام سے مشہور ہے۔مولانا نور محمد صاحب کا سیاسی اور مسلکی تعلق مولانا فضل الرحم کی جماعت سے ہے۔ جناب نیک محمد، جو نواز خان کے دوسرے بڑے بیٹے تھے، نے ا مدرسے سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔1997ء میں ''فاٹا'' سے مولانا نور محمد وزیر ایم این اے بھ بنے۔حالات کس قدر تیزی سے اور غیر متوقع طور پر تبدیلی کی زد میں آتے ہیں۔کیا مولانا نور مح صاحب کو معلوم تھا کہ اُن کے مدرسے میں داخل ہونے والا بانس کی طرح پتلا سایہ لڑکا مستقبل میں نیک محمد ایسی شکل اختیار کرے گا کہ اُنہیں یارگل خیل کے اس لڑکے اور پاک آرمی کے درمیان صل کے فرائض ادا کرنا پڑیں گے؟ (واضح رہے نیک محمد صاحب وانا میں بروئے کار قبیلے ''وزیرزئی کی ایک ذیلی شاخ ''یارگل خیل'' سے تعلق رکھتے ہیں)

نیک محمد جن کے بارے میں اب یہ بات زبان زدِ خاص و عام تھی کہ وہ وانا کے سب سے طاقتور آدمی تھے، پڑھائی لکھائی کی طرف کبھی سنجیدگی اور شائستگی کا مظاہرہ نہ کر سکے۔

مولانا نور محمد وزیر کے مدرسے (جامعہ دارالعلوم وزیرستان) میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی دی جاتی تھی، نیک محمد کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اسی مدرسے سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا لیکن وانا کے باخبر ذرائع اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے۔ایک باخبر ذریعے کا کہنا ہے کہ نیک محمد اس مدرسے سے بھاگ کر ڈیرہ اسماعیل خان آ گئے تھے جہاں انہوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی لیکن میٹرک کبھی نہ کر سکے لیکن حیرت ہے کہ نیک محمد نے بعد ازاں اپنے ایک قریبی دوست کو بتایا کہ وہ نہ صرف میٹرک کر چکے تھے بلکہ انہوں نے کوئٹہ کے ایک کالج میں داخلہ بھی لیا تھا۔اُن کے بیان کے مطابق: ''میں نے پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کے اثر و رسوخ سے کوئٹہ کے ایک کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا لیکن اس کے فوراً بعد میں جہاد (افغانستان) پر چلا گیا۔''

سکول اور جہاد کے درمیانی عرصے میں نیک محمد کی زندگی مختلف واقعات بلکہ تضادات سے

بھری نظر آتی ہے۔نوے کا عشرہ اُن پر بھاری گذرا کہ معاشی اعتبار سے وہ تنگ دستی کا شکار تھے۔ انہی دنوں اُن پر الزام لگا کہ وہ کاریں چوری کرنے کے دھندے میں ملوث ہیں۔ایک بار الزام کے مطابق وہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ڈیرہ اسماعیل خان سے ایک پک اپ گاڑی چوری کر کے پنجاب لا رہے تھے کہ دریائے سندھ کے پل پر پولیس سے اُن کا ٹاکرا ہو گیا۔وہ گاڑی وہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔گاڑی کا مالک جو محسود قبیلے کا ایک آدمی تھا، چوروں کا کھرا ناپتا نیک محمد کے گھر کالوشاہ پہنچ گیا جہاں نیک محمد کے خاندان والوں نے گاڑی کے مالک کا نقصان ادا کر دیا۔اس واقعہ کے بارے میں خود نیک محمد کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے پیسے کمانے کے لئے گاڑی چوری نہیں کی تھی بلکہ اُس شخص (محسود قبیلے کا آدمی) سے اُن کا ایک جھگڑا چل رہا تھا، اس لئے اسے پریشان کرنے کے لئے یہ ''حرکت'' کی گئی۔توجیح خواہ کچھ ہی کیوں نہ کی جائے، نیک محمد بہر حال اس واقعہ سے انکار نہ کر سکے۔

مدرسے اور تعلیم سے لاتعلق ہونے کے بعد نیک محمد نے زندگی کی گاڑی چلانے کیلئے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔انہوں نے وانا کے بڑے بازار میں دکان کھولی جسے جنرل سٹور کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن کاروبار اور دکانداری کرنے کیلئے جس مزاج اور لہجے کی ضرورت ہوتی ہے، نیک محمد اس سے تہی دست تھے، چنانچہ جلد ہی انہوں نے دکان کے دروازے بند کر دیئے اور یہ دن وہ تھے جب جنوبی وزیرستان کے ایک مشہور جہادی شخصیت محمد گل سے ان کا نیا نیا یارانہ شروع ہو رہا تھا۔ محمد گل ان دنوں بڑی تیزی سے نوجوان قبائلیوں کو ٹریننگ اور پیسہ دے کر طالبان کے ساتھ مل کر شمالی اتحاد والوں کے خلاف جنگ کیلئے بھیج رہا تھا۔اُس نے ایسا ہی پیغام نیک محمد کے کان میں بھی ڈال دیا۔ بے کاری اور بے یار و مددگاری کے دنوں میں یہ مہم جوئی نیک محمد کے دل کو بھا گئی۔ چنانچہ افغانستان جا کر طالبان کے کندھے سے کندھا ملا کر جہاد کرنے کا خیال اور پھر فوری طور پر سے فیصلہ کن شکل دینا نیک محمد کیلئے ایک نئی دنیا کے دروازے کھولنے کے مترادف ثابت ہوا۔

نیک محمد کے جہادی کردار میں ایک کڑی نہیں ملتی اور وہ یہ کہ انہوں نے جہاد اور جنگ کی تربیت کہاں سے حاصل کی؟ افغانستان میں طالبان کے زمانے میں ''القاعدہ'' کی زیر سرپرستی بہت سے ٹریننگ کیمپ کام کر رہے تھے، کیا نیک محمد نے ان میں سے کسی ایک میں جہاد اور جنگ کی تربیت حاصل کی؟ نیک محمد کے ایک قریبی دوست کا بیان ہے کہ نیک محمد نے ان میں سے کسی ایک کیمپ سے کبھی ٹریننگ حاصل نہیں کی'' کیونکہ ایسی تربیت حاصل کرنے کیلئے جس صبر اور تحمل کی

ضرورت پڑتی ہے، نیک محمد کی طبیعت میں ان عناصر کا کوئی دخل نہیں تھا'' لیکن یہ حقیقت ہے کہ نیک محمد خاصا عرصہ تک گل محمد گروپ کے ساتھ وابستہ رہا اور اُس نے جنوبی اور جنوب مغربی افغانستان میں طالبان کے مقاصد کے حصول کیلئے جنگ (شمالی اتحاد کے خلاف) میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں اور یہ وہ دن تھے جب نیک محمد کا رابطہ ملا سیف اللہ منصور سے ہوا۔ سیف اللہ منصور، طالبان کی حکومت میں ایک نمایاں کردار، ملا نصر اللہ منصور کے بڑے صاحبزادے تھے۔ نصر اللہ منصور اور بعدازاں اُن کے صاحبزادے سیف اللہ نے شاہی کوٹ میں اس وقت شدید مزاحمت کا کردار ادا کیا جب افغانستان پر امریکہ نے حملہ کر دیا۔ گویا یوں کہنا بجا ہوگا کہ سیف اللہ منصور کی معرفت نیک محمد نے طالبان کی ہائی کمان سے تعلقات کو استوار کرنے میں بھی کامیابی حاصل کر لی جو آگے چل کر اُن کے بہت معاون رہی۔ (یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ طالبان نے ملا نصر اللہ منصور کو شاہی کوٹ کا انچارج بنا رکھا تھا)

1996ء میں جب طالبان نے کابل پر اپنا پرچم لہرا دیا تو افغانستان کے اس دارالحکومت سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقعہ ''کارگاہ لیک'' کا علاقہ ملا سیف اللہ منصور کی نگرانی میں دے دیا۔ منصور صاحب ہی اس ''گیریژن'' کے کمانڈر قرار دیئے گئے، یہ علاقہ طالبان کے نزدیک بہت اہمیت کا حامل تھا۔ ملا سیف اللہ منصور نے اس علاقے کے انتظام و انصرام کیلئے جن ساتھیوں کو اہم ذمہ داریاں سونپیں، ان میں ایک محمد گل ایک معرکے میں کام آ گئے تو یہ ذمہ داریاں ملا سیف اللہ منصور نے نیک محمد کے سپرد کر دیں۔ یوں نیک محمد نے طالبان حکومت کے ایک اہم عنصر اور ستون کی شکل اختیار کر لی۔ جنوبی وزیرستان کے قبیلے یارگل خیل کا یہ نوجوان اب طالبان کا کمانڈر تھا۔ (اس واقعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ طالبان حکومت میں پاکستان کے کتنے لوگ بعض ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے۔) نوے کے عشرے میں طالبان کے احکامات کی تعمیل میں نیک محمد نے طالبان فوج میں شامل ''وزیرستان دستے'' کی قیادت کرتے ہوئے بامیان، مزار شریف، تخار اور بادغیس ایسے اہم افغانی علاقوں میں طالبانی جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بگرام ایئرپورٹ پر قبضہ کرنے اور وادیٔ پنج شیر میں احمد شاہ مسعود کو شکست دینے کیلئے طالبان اور شمالی اتحاد کے درمیان جو انتہائی خونریز جنگیں ہوئیں، نیک محمد ان دونوں معرکوں میں بنفسِ نفیس شریک رہے۔

جنوبی وزیرستان کے وزیر قبیلے کے ایک قبائلی، جس نے افغانستان میں بگرام کے علاقے میں نیک محمد کی زیرنگرانی جہاد میں حصہ لیا، کا کہنا ہے: ''نیک محمد نے طالبان دور میں جہاد افغانستان

میں حصہ لینے کا آغاز یوں کیا کہ ان کا شمار پیدل لڑنے والے مجاہدین میں ہوتا تھا مگر انہوں نے اپنی جنگ جویانہ طبیعت کے باعث طالبان حکام کے دلوں میں اتنا مقام حاصل کر لیا تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب اُنہیں تین ہزار طالبان کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا تھا۔'' نیک محمد نے طالبان حکومت میں یہ شہرت بھی حاصل کی کہ وہ ہٹ کے پکے اور اپنے ہدف سے پیچھے ہٹنے والے انسان نہیں ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ان کے ضدی اور سخت مزاج ہونے کی وجہ سے انہیں بعض غلط ناموں سے بھی موسوم کر رکھا تھا لیکن ایک بات واضح رہی کہ نیک محمد نے بعض اوقات بعض مورچوں سے اس وقت بھی ہٹنے سے انکار کر دیا جب طالبان کی ہائی کمان سے بھی احکامات آ گئے تھے۔ ایک وزیری قبائلی کا کہنا ہے: ''نیک محمد نے پہلی بار کسی جھگڑے اور سوال جواب کے بغیر اُس روز اپنا مورچہ چھوڑا تھا جب نومبر 2001ء میں شمالی اتحاد اور امریکی فوجوں نے ملکر بگرام پر حملہ کیا تھا، طالبان کی ساری قوت پانی کی طرح بہتی محسوس ہوئی تھی۔''

نیک محمد کی قائدانہ اور مجاہدانہ صلاحیتوں کا پوری طرح اظہار اس وقت ہوا جب انہیں افغانستان میں ''کارگاہ'' کا کمانڈر متعین کیا گیا۔ یہ علاقہ کابل کے نزدیک واقعہ ہے۔ اس عرصے کے دوران سوویت فوجوں کا سابقہ گیریژن ''رشکھور'' جو کابل کے جنوب میں واقع ہے، القاعدہ کے ٹریننگ کیمپ میں تبدیل ہوا تھا۔ کارگاہ اور رشکھور میں، بعض اطلاعات کے مطابق، اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کے ساتھ ساتھ جلال الدین حقانی، سیف اللہ منصور، ریاض بسرا، ازبکستان کی ''اسلامی تحریک'' کے جمعہ نمنگانی، طاہر یلدے سیٹف اور چینی مسلمان مجاہد رہنما حسن محسون ایسے اہم لوگ آیا کرتے تھے۔

نومبر 2001ء کو جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو جہاں طالبان کی ساری جمعیت بکھر گئی، وہاں نیک محمد اور مذکورہ بالا سبھی افراد بھی تتر بتر ہو گئے اور غالباً اسی بحران کے دنوں میں نیک محمد کو معاشی اعتبار سے خود کو مستحکم کرنے اور طالبان کے معروف رہنماؤں سے قریبی تعلقات استوار کرنے کے مواقع ملے۔ جونہی امریکہ نے افغانستان میں ''اینا کونڈا'' آپریشن شروع کیا، افغانستان میں بروئے کار وسط ایشیا، عالم عرب اور چیچنیا ایسے دور دراز علاقوں سے آنے والے مجاہدین کو بھاگنا پڑا۔ جس کا جدھر کو منہ اٹھا، اُدھر ہی بھاگ اٹھا لیکن زیادہ تر کا رخ پاکستان کے اُس خطے کی طرف تھا جسے ''فاٹا'' کہا جاتا ہے اور ''فاٹا'' میں بھی اس علاقے کو خصوصی درجہ حاصل ہو گیا جسے جنوبی وزیرستان کہا جاتا ہے۔ وزیرستان کے دارالحکومت ''وانا'' میں ان مفرور شخصیات کا

سب سے بڑا سہارا اور رابطہ نیک محمد ہی تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ نیک محمد نے طالبان کی خدمات انجام دیتے ہوئے کچھ رقم پس انداز کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب وہ 2001ء کے وسط میں کالوشاہ آئے تو اُن کے پاس چھ عدد جدید ترین ایئر کنڈیشنڈ بڑی پک اپ گاڑیاں تھیں اور جب اس علاقے میں عرب آئے تو بہت سارو پیہ بھی ان کے ساتھ آیا۔ کراچی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی جریدے کا کہنا ہے کہ دسمبر 2003ء میں نیک محمد اور ان کے ساتھیوں کے پاس 44 جدید ترین گاڑیاں تھیں۔ ان میں کچھ بلٹ پروف بھی تھیں جن میں سے چند ایک فروخت کر دی گئیں جبکہ باقی نیک محمد نے اپنے معزز مہمانوں کیلئے رکھ لیں تا کہ بوقت ضرورت کام آ سکیں۔

جنوبی وزیرستان میں تقریباً ہر شخص گواہی دیتا ہے کہ طاہر یلدے سیئف ایسے انتہا پسند لوگ یہاں موجود رہے ہیں اور اُن کی سرپرستی نیک محمد کر رہے تھے اور اگر ہم بلٹ پروف گاڑیوں کا قصہ درست مان لیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وانا میں اولین آپریشن کے دوران جب طاہر یلدے سیئف اور اُس کے ساتھی پاک فوج کے نرغے میں آ گئے تھے تو خبر آئی کہ گولیوں کی برسات کی پروا نہ کرتے ہوئے طاہر یلدے سیئف ایک فوجی چوکی کو چیرتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ طاہر یلدے سیئف، جو ازبکستان کی ایک شدت پسند اسلامی تحریک کے مرکزی رہنما بتائے جاتے ہیں، اسی بلٹ پروف گاڑی میں فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہوں گے جو نیک محمد کے پاس رہی ہیں۔ (طاہر یلدے سیئف کے فرار کو حکومت نے ہائی ویلیو ٹارگٹ کے فرار سے مشابہہ قرار دیا تھا) یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد جہاد کا دائرہ سکڑنے لگا تھا لیکن ساتھ مخصوص رقوم کی ترسیل کا رخ وانا کی طرف بڑھ گیا جس سے مقامی قبائل کے مختلف گروہ استفادہ کرنے کیلئے آگے بڑھے۔ چونکہ طالبان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور معروف طالبان رہنما زیرِ زمین چلے گئے تھے اور اُن کی فوجی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا تھا، اس وجہ سے جو خلاء پیدا ہوا، اُسے پُر کرنے اور موجودہ بھاری فنڈز سے فائدے اٹھانے کیلئے جنوبی وزیرستان کے مختلف گروہ سامنے آ گئے۔ ایک گروہ کی رہنمائی نیک محمد کر رہے تھے جبکہ دوسرے اور تیسرے گروہ کی سرپرستی نیک محمد کے دوسرے دونوں بھائی محمد شریف اور نورالاسلام کر رہے تھے اور ان تینوں کو دو مقامی مذہبی شخصیات مولوی نور عباس اور ملا نذیر کی روحانی چھتری میسر تھی۔ احمد زئی قبیلے کا ایک اور نوجوان مجاہد کمانڈر جاوید ایک الگ گروہ آگے بڑھا رہا تھا۔ قریب تھا کہ پیسے کی تقسیم اور حصول کیلئے یہ سب گروہ آپس میں متصادم ہو کر خونریز جنگ کی شکل اختیار کر

لیتے کہ پاک فوج نے یہ علاقہ ان لوگوں سے ''پاک صاف'' کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

OOOOO

16 اور 28 مارچ 2004ء کے درمیان وانا میں پناہ یافتہ غیر ملکیوں کو نکالنے کے لئے پاک آرمی نے جو آپریشن شروع کیا، اُس کا سب سے نمایاں پہلو اُس وقت سامنے آیا جب نیک محمد اپنے قبیلے اور پناہ یافتہ غیر ملکیوں کی ''فوج'' لے کر پاکستان فوج کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس تصادم میں نیک محمد کی بلٹ پروف گاڑیوں نے بڑا کام دکھایا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی تصادم کے دوران نیک محمد کی وساطت سے تمام نمایاں مطلوب افراد وانا سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سراسر نیک محمد کی سٹریٹجی اور ہمت پر منحصر تھا اور اُس نے اس صبر آزما اور مشکل وقت میں اپنے دوستوں اور وہ لوگ جنہیں وہ پناہ دے چکا تھا، کو بے یار و مددگار نہ چھوڑا۔ ممکن ہے اس کشمکش میں اور بھی ہاتھ کارفرما ہوں جو ان پناہ گزینوں کو گرفتار کرانے کے حق میں نہ تھے لیکن مرکزی کردار نیک محمد ہی کا تصور کیا گیا اور جب یہ گرد بیٹھی تو پاک آرمی اور جنوبی وزیرستان ایجنسی کے اس نوجوان کے درمیان صلح اور محبت کے رشتے جوڑنے کے مناظر سامنے آ گئے۔

ابتدا میں نازک دنوں میں نیک محمد کو شکست دی جا سکی اور نہ اُنہیں گرفتار کیا جا سکا۔ اُن لوگوں کو بھی گرفتار کرنے میں کامیابی نہ مل سکی جنہیں گرفتار کرنے کیلئے وانا میں آپریشن کے نام پر دو بار ''ڈرامہ'' رچایا گیا۔ آخر کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ تمام ذرائع اور وسائل رکھنے کے باوجود مقتدر قوتیں اپنا ہدف حاصل کیوں نہ کر سکیں؟ ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے وانا کے ایک باخبر ذرائع کا کہنا ہے: ''انٹیلی جنس میں شدید خامیوں کی وجہ سے مقتدر قوتیں ہدف کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔'' باخبر ذرائع کا مزید کہنا ہے کہ: ''جنوبی وزیرستان ایجنسی میں آنکھیں اور کان کھولنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اپریل 2004ء میں طالبان کے رہنما کمانڈر جلال الدین حقانی اور ملا دادا اللہ وانا میں نیک محمد اور دوسرے گروپوں سے مذاکرات کر رہے تھے اور یہ بھی بعض لوگوں کے علم میں ہے کہ طاہر یلدے سیئف جنوبی وزیرستان میں ایک ایسے شخص کو نامزد کرنے آئے تھے جو پناہ گزین مجاہدین کو آپس کے ممکنہ تصادم (رقوم کی تقسیم پر) سے بچا سکیں لیکن حیرانی کی بات ہے کہ ان اہم لوگوں کے ٹھکانوں سے ہمارے انٹیلی جنس ادارے بے خبر رہے۔ اس پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا''۔ ''یہ درست ہے نیک محمد ایک تجربہ کار جنگجو تھے مگر یہ ماننے والی بات بہرحال نہیں کہ اُن کا قد اسلام آباد اور جی ایچ کیو سے بڑا تھا اور اگر ان سب باتوں کی موجودگی میں نیک محمد پر

ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ اُن کی پشت پر ''القاعدہ'' کے علاوہ بھی کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔''

نیک محمد کو ابتدا میں ڈھیل دی گئی، معاہدۂ شکئی کر کے بظاہر حکومت نے ''شکست'' بھی تسلیم کر لی تھی۔ حکومت نیک محمد کو ڈھیل دے کر اصل ہاتھوں تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن نیک محمد نے اسے کمزور کر کے حکومت کو بلیک میل کرنے کے ہتھکنڈے آزمانے شروع کر دیئے۔ آخر کار تنگ آ کر حکومت نے ایک روز بڑی سنجیدگی سے آپریشن کیا اور رات کے اندھیرے میں ایک پُراسرار میزائل نے نیک محمد کا خاتمہ کر دیا۔

OOOOO

''فاٹا'' کی ایجنسیوں میں گذشتہ چند ماہ کے دوران جو کچھ ہوا اس حوالے سے پاکستان کے اس دور کے وزیر داخلہ جناب آفتاب احمد خان شیر پاؤ کے جوابات بہت سے رازوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے انگریزی جریدے ''ہیرالڈ'' (فروری 2006ء) کو انٹرویو دیا۔ اُن سے جب پوچھا گیا کہ ''13 جنوری 2006ء کو جب ڈمہ ڈولا (باجوڑ ایجنسی کا علاقہ) پر امریکی طیاروں نے حملہ کیا تھا تو آپ کے پاس اس طرح کی کوئی مصدقہ اطلاعات تھیں کہ وہاں عرب مسلح افراد موجود ہیں؟'' تو شیر پاؤ صاحب نے کہا: ''ہم ہنوز اِس کی تحقیق کر رہے ہیں لیکن انٹیلی جنس رپورٹوں سے محسوس ہوتا ہے کہ اِس علاقے میں کچھ غیر ملکی موجود تھے۔ اس امریکی حملے کے نتیجے میں 13 مقامی معصوم افراد، جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے، شہید ہو گئے۔ ہمیں اِس امر کا شدید افسوس اور دکھ ہے، ہم نے اعلیٰ سطح پر امریکہ سے اِس بارے میں احتجاج بھی کیا ہے اور (اِس کے نتیجے میں) اُنہوں نے ہمیں یقین دہانی کرائی ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ امریکی حکومت نے اعتراف اور اقرار کیا ہے کہ یہ ایک سنگین غلطی تھی۔ اُنہوں نے اِس امر کا بھی یقین دلایا ہے کہ مستقبل میں اس حوالے سے اگر اُن کے پاس کوئی حساس معلومات ہوں گی تو وہ ہمارے ساتھ شیئر کریں گے۔ اس پس منظر میں اگر وہاں کسی جگہ مسلح غیر ملکی افراد کی موجودگی کا پتہ چلا تو ایسی صورت میں صرف پاکستان کی سکیورٹی ایجنسیاں ہی آپریشن کریں گی کہ آخر کار یہ ہماری ذمہ داری ہے اور ہم ہی پاکستان کی حاکمیت قائم کریں گے۔''

س: ڈمہ ڈولا پر حملہ سے قبل کیا امریکیوں نے پاکستان کو اعتماد میں لیا تھا؟

ج: نہیں! یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ اگر انہوں نے پاکستان سے اجازت لی ہوتی اور اگر

لستان کو اعتماد میں لیا ہوتا تو پھر ہم اُن سے احتجاج کیوں کرتے؟ ہم احتجاج اسی لئے تو کر رہے ں کہ یہ ساری کارروائی اچانک کی گئی۔

س: اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کہ امریکیوں نے یہ حملہ اپنی مرضی سے کر ڈالا؟

ج: ممکن ہے کہ ان کے پاس کوئی خاص قسم کی اطلاعات ہوں، جب انفرمیشن ملتی ہے تو اسے پاتولا جاتا ہے، اِس کے بارے میں گیج کیا جاتا ہے، اس کی صحت کے بارے میں غور و فکر کیا جاتا ہے اور جب اطلاعات کی تصدیق ہوتی ہے تب ہی کوئی اس پر عمل کر گذرتا ہے کیونکہ یہ زندگی اور دت کا سوال ہے، خاص طور پر ایسے معاملے میں جبکہ گھروں کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔

س: صدر مشرف نے اشارہ کیا ہے کہ باجوڑ میں غیر ملکی مسلح افراد موجود تھے؟

ج: اس بات کے اشارے اور امکانات بہر حال موجود ہیں کہ غیر ملکی مسلح افراد، جن میں مسلح رب بھی شامل ہیں، اس علاقے میں موجود تھے۔ معروف القاعدہ رہنما ابو فراج اللبی، جسے مردان سے بعد ازاں گرفتار کیا گیا تھا، گرفتاری سے قبل باجوڑ میں بھی رہا تھا۔

س: 13 جنوری کو باجوڑ پر جو امریکی حملہ کیا گیا، کہا گیا تھا کہ یہ القاعدہ کے دوسرے بڑے ہنما ایمن الظواہری کے خاتمے کی ایک کوشش تھی۔ کیا حملے کے وقت وہ یہاں موجود تھا؟

ج: جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ممکن ہے امریکیوں کے پاس اس قسم کی کوئی اطلاع ہو لیکن اُنہوں نے ہمیں اس بارے میں مطلع نہیں کیا تھا۔

س: ''فاٹا'' کے علاقے میں اور افغان سرحد میں پاکستان آرمی کی ایک بھاری تعداد تعینات ونے کے باوجود رپورٹیں آ رہی ہیں کہ غیر ملکی مسلح افراد سرحد پار کر رہے ہیں.....؟

ج: اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہو رہا کیونکہ ہم نے افغان سرحد پر 70 سے 80 ہزار فوجی ستے متعین کر رکھے ہیں، حالانکہ یہ دشوار گذار راستہ ہے اور اس طرح کا کوئی ایسا تازہ واقعہ رونما ہیں ہوا ہے کہ غیر ملکی مسلح افراد سرحد عبور کر کے پاکستان آئے ہوں۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں وغیر ملکی موجود ہیں، یہ سب نائن الیون کے سانحہ کے بعد ادھر آئے تھے۔ ان علاقوں سے ان ناصر کو باہر نکالنے کے لئے ملٹری آپریشن سے قبل ہم نے مقامی بزرگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ان یر ملکیوں کی رجسٹریشن کروائیں، ہم نے انہیں (غیر ملکی) معافی دینے کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن ان یر ملکیوں نے ہمارے پلان سے اتفاق نہ کیا۔ جب انہوں نے ہماری بات ماننے سے انکار کر دیا ؛ ہم نے ان کے خلاف ملٹری آپریشن کا آغاز کر دیا، ہم نے انہی مقامات پر توجہ مرکوز کی جہاں

انہوں نے خود کو چھپا رکھا ہے۔

س: پاکستانی علاقوں پر امریکی حملے بڑھ گئے ہیں، ان کے پیچھے کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟

ج: اس طرح کے حملوں میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے، شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ہمیں جو اطلاعات اور انفرمیشن ملتی ہیں، ہم یہ سب امریکیوں سے شیئر کرتے ہیں اور پاکستان اسی وقت ان پر عمل کرتا ہے جب اطلاعات درست ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی لوگوں نے کہا کہ امریکی ''پری ڈیٹر'' نے حملہ کیا جبکہ یہ واقعہ کسی اور شکل میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

س: جنابِ عالی! 7 اور 13 جنوری 2006ء کے درمیان سات دنوں کے اندر اندر امریکہ نے فاٹا میں دو بار حملہ کیا، کیا اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ پاکستان ان علاقوں میں جو آپریشن کر رہا ہے امریکہ کو ان پر اعتبار نہیں رہا؟

ج: نہیں! میرا نہیں خیال کہ ایسی کوئی بات ہے، دونوں طرف تعاون اور اعتبار کی فضا قائم اور موجود ہے، فریقین انفرمیشن کا تبادلہ کر رہے ہیں، ہمارا اور امریکیوں کا مشترکہ مقصد دہشت گردی اور دہشت گردوں کے خلاف جنگ کرنا اور ان کی کمر توڑنا ہے، امریکہ قطعی طور پر ہماری حاکمیت اعلیٰ کو چیلنج نہیں کر رہا۔

س: یہ غیر ملکی مسلح افراد جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان تک پھیل گئے ہیں اور اب یہ باجوڑ میں آ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا حالانکہ 2002ء سے ان علاقوں میں پاکستان آرمی کے ہزاروں دستے تعینات ہیں؟

ج: یہ پھیل نہیں رہے بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے ہیں کیونکہ یہ فرار کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں کیونکہ پاکستان ان کے تعاقب میں ہے۔

س: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جنوبی وزیرستان غیر ملکی مسلح عناصر سے پاک کر دیا گیا ہے؟

ج: نہیں! میں نے یہ نہیں کہا۔

س: آج تک شمالی اور جنوبی وزیرستان میں جتنے بھی آرمی آپریشن کئے گئے ہیں یہ کتنے اور کہاں تک کامیاب رہے ہیں؟

ج: یہ ہر طرح سے اور ہر لحاظ سے کامیاب رہے ہیں، اسی کی وجہ سے یہ لوگ فرار ہو کر باجوڑ پہنچ رہے ہیں۔ قبائلی رہنما ہمارے ساتھ (On Board) ہیں۔ تقریباً 600 افراد گرفتار کئے جا چکے اور بہت سے مسلح غیر ملکی افراد ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔ اس دوران اس علاقے میں القاعدہ کا

نیٹ ورک توڑ دیا گیا ہے۔ ان کی سرگرمیاں محدود کرنے کے ساتھ ساتھ، اب حالات ہمارے قابو میں ہیں۔

س: آپ کہہ رہے ہیں کہ قبائلی سردار اور رہنما آپ سے تعاون کر رہے ہیں لیکن جنوبی وزیرستان میں 70 سے زائد سردار اور ملک قتل کئے جا چکے ہیں (جو حکومت سے تعاون کر رہے تھے) انہی کی وجہ سے حکومت کو مجبوراً مسلح گروہوں سے مذاکرات کرنا پڑے.....؟

ج: یہ اس لئے ہوا کیونکہ آپریشن کی نوعیت بہت حساس ہے، مجھے یقین ہے کہ ابھی ہمیں ان علاقوں میں بہت سا قابل ذکر سیاسی کام کرنا ہے، آپریشن کے دوران سرحد کے گورنر اور پولیٹیکل ایجنٹس کو ساتھ ساتھ کام کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

س: 7 دسمبر 2007ء کو مقامی طالبان نے میران شاہ پر قبضہ کر لیا تھا، اس دوران مقامی انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بالکل مفلوج اور ناکارہ ہو کر رہ گئے..... کیوں؟

ج: یہ واقعہ ایک مذہبی مدرسے کا ہے اور وہیں سے اُٹھا۔ مقامی لوگ جو خود کو طالبان بھی کہتے تھے، انہوں نے ان لوگوں کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تھے جو روپے پیسے کے ناجائز کاروبار سے وابستہ تھے۔ مقامی لوگوں نے اس واقعہ کو سراہا کیونکہ وہ ان گروہوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اصل میں ان لوگوں کے خلاف یہ کام وہاں کی سیاسی انتظامیہ کی طرف سے کیا جانا چاہئے تھا (لیکن بوجوہ اور بدقسمتی سے یہ کام ان سے نہ کیا جا سکا)

س: جناب! باجوڑ میں غیر ملکی مسلح افراد کو تحفظ کون فراہم کر رہا ہے؟

ج: میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

س: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مولوی فقیر محمد اور مولوی لیاقت ان لوگوں کو پناہ دے رہے ہیں؟

ج: یہ دونوں آدمی پابندی شدہ ''تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی'' (ٹی این ایس) سے تعلق رکھتے ہیں جس رات ڈمہ ڈولا میں امریکی حملہ ہوا، یہ وہاں موجود تھے۔ وہ باہر کھانا لینے کے لئے گئے ہوئے تھے جب واپس آئے تو حملہ ہو چکا تھا، میں تو ان کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں۔

س: مولوی فقیر محمد گذشتہ ایک سال سے باجوڑ کی انتظامیہ کو مطلوب تھا، ابھی تک اسے گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔ کیا یہ مقامی انتظامیہ کی ناکامی اور نااہلی نہیں ہے؟

ج: ہاں، ہمیں اس بات پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کہ باجوڑ کی سیاسی انتظامیہ کو

اسے حراست میں لینا چاہئے۔

س: جب صورتحال کو آرمی ہینڈل کر رہی ہو تو کیا ایجنسی کی سیاسی انتظامیہ کوئی اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے؟

ج: جی ہاں، آرمی اور سیاسی انتظامیہ کو ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کرتے رہنا چاہئے، اگر سیاسی انتظامیہ بھرپور کردار ادا کرتی رہے اور لوگوں کو "آن دی بورڈ" لانے میں کامیاب ہوتی رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں ہر جگہ کامیابیاں نہ ملیں۔ مثلاً ماضی میں ان لوگوں نے بیت اللہ محسود سے ایک معاہدہ کیا جس کے خاصے اثرات سامنے آئے۔

س: افغان صدر حامد کرزئی نے ایک بار پھر الزام عائد کیا ہے کہ پاکستان مسلح افراد کے "کراس بارڈر" کو روکنے میں ناکام رہا ہے؟

ج: یہ الزامات بے بنیاد ہیں، نہ تو افغان حکومت اور نہ ہی افغانستان میں امن قائم کرنے پر مامور بین الاقوامی قوتیں افغانستان کے جنوبی اور جنوب مشرقی صوبوں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہو سکی ہیں۔ اس ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے جب بھی افغانستان میں کوئی واردات ہوتی ہے، افغانستان کا حکمران طبقہ پاکستان کی طرف انگلی اُٹھا دیتا ہے، اس علاقے میں ہم اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں، فاٹا میں دہشت گردی اور دہشت گردوں پر قابو پانے کے لئے ہم نے جو فوجی آپریشن کئے ہیں ان میں آرمی کے 350 سے 400 جوان شہید ہوئے ہیں۔

س: افغان حکمرانوں نے ہرات اور قندھار ایسے صوبوں میں عوام کی ریلیاں کروائی ہیں جس میں الزام لگایا گیا ہے کہ پاکستان کی طرف سے خودکش بمبار افغانستان بھیجے جا رہے ہیں؟

ج: قندھار میں خودکش بمباروں کے حملوں سے قبل ہی وہاں عوام میں بے پناہ بے چینی اور خلفشار تھا چونکہ افغان حکام ملزموں کو گرفتار نہیں کر سکے ہیں، اس لئے وہ کھسیانے ہو کر پاکستان پر الزام عائد کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بھی افغانستان میں دہشت گردی کا نشانہ بنے ہیں۔ د پاکستانی جو سرحد پار کام کر رہے تھے، گذشتہ دنوں ان پر حملہ ہوا اور کئی ایک شدید زخمی ہو گئے۔

س: کیا آپ واضح طور پر افغانستان کے اس الزام پر کوئی تبصرہ کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی طرف سے خودکش بمبار افغان بھیجے جا رہے ہیں؟

ج: یہ الزام بالکل ہی بے بنیاد ہے، اس کی بجائے ہم افغانستان کی وجہ سے بہت سے سنگین مسائل کا شکار ہو رہے ہیں۔ افغانستان کی طرف سے بہت سا اسلحہ پاکستان آ رہا ہے، یہ اسلحہ

بلوچستان میں فراری کیمپوں کو فروخت کیا جا رہا ہے، فراری کیمپ بلوچستان کے قوم پرست چلا رہے ہیں۔

س: کیا یہ اسلحہ بلوچستان سے یا فاٹا سے برآمد بھی کیا گیا ہے؟

ج: ہمارے پاس مستند معلومات ہیں کہ یہ اسلحہ افغانستان ہی سے پاکستان آ رہا ہے۔

(HERALED، فروری 2006ء)

فروری 2006ء کے آخری ہفتے پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے افغان صدر حامد کرزئی نے نیشنل ڈیفنس کالج میں جاری کورسز میں حصہ لینے والے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سفر کیلئے پاسپورٹ کی شرط ختم ہونی چاہئے کیونکہ اب بھی تاجر دونوں ملکوں میں بغیر پاسپورٹ کے آ جا رہے ہیں۔ دونوں ملکوں میں یورپی طرز پر ویزا جاری ہونا چاہئے، انہوں نے افغان سرحد پر باڑ لگانے کی پاکستانی تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ اس سے دونوں ملکوں میں دوریاں پیدا ہوں گی۔ صدر کرزئی نے افغان سرحد پر باڑ لگانے کی پاکستانی تجویز کی مخالفت کی۔ اب پاک افغان بارڈر پر سکیورٹی کا معاملہ سنجیدہ صورت اختیار کر گیا تھا کیونکہ امریکہ اور خود افغانستان کی حکومت تب سے اب تک پاکستان پر اس الزام تراشی میں مصروف تھے کہ پاکستان میں القاعدہ اور طالبان کے لوگ افغانستان میں اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو بھی پاکستانی حکومت کو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس عمل کو رکوانا اس لئے بھی مشکل ہے کہ پاک افغان طویل بارڈر کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اسے مکمل طور پر طویل عرصے کیلئے سربمہر نہیں کیا جا سکتا جبکہ امریکہ روس کے درمیان جنگ کے موقعہ پر سوویت یونین نے مداخلت کاری کا یہی الزام پاکستان پر دھرا تھا تو پاکستان نے پیش کش کی تھی کہ ہمارے تو وسائل اس قدر نہیں آپ ایک سپر پاور ہیں، آپ یہ بارڈر ہی سیل کر دیں۔ بہرحال کرزئی حکومت کے بعض کارپردازوں کی طرف سے پاکستان پر الزام تراشی کا سلسلہ جاری رہا جبکہ پاکستان بھی اس امر پر شاکی تھا کہ افغانستان کی طرف سے افغان اور غیر ملکی تخریب کار پاکستان کے سرحدی اور قبائلی علاقوں میں داخل ہو کر پاکستان کیلئے امن عامہ کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں، یہیں سے پاکستان کی طرف پاک افغان سرحد پر باڑ لگانے کی تجویز سامنے آئی جس کے بارے میں صدر کرزئی نے کہا کہ اس سے دونوں ملکوں میں دوریاں پیدا ہوں گی۔ یہ بات بڑی پریشان کن تھی کہ صدر کرزئی ایک طرف تو امریکہ کے ڈھولچی بن کر پاکستان کے خلاف الزامات

کی بو چھاڑ جاری رکھتے ہیں جبکہ 2006ء سے آج تک وہ باڑ لگانے کے خلاف رہے ہیں جس سے ایک بات تو سیدھی سمجھ آ جاتی ہے کہ یہ ان کا ذاتی نہیں بلکہ ان کے مالکان امریکہ اور بھارت کی ضد تھی کہ ایسا نہ ہونے دیں اس طرح تو بھارتی قونصلیٹس کی آڑ میں موجود تخریب کاری کیمپوں میں موجود ''را'' کے تربیت یافتہ تخریب کار جن میں ازبک، چیچن، تاجک اور مصدقہ اطلاعات کے مطابق بھارتی اور افغان شامل ہیں سرحد پار نہیں جا سکیں گے اور پاکستان سے اگر طالبان کی آمد بند ہو گئی تو ممکن ہے دنیا افغانستان میں غیر ملکی فوجوں کی موجودگی کا جواز طلب کرتی جو امریکہ کے لئے یقیناً گھاٹے کا سودا تھا۔

امریکی مداخلت اور ایف بی آئی

سابقہ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں وانا نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس سے ملحقہ فغان سرحد میں سوویت یونین کے خلاف ابتدائی جنگ لڑی گئی تھی جو بعد ازاں کابل تک پھیل گئی۔ نوبی وزیرستان، شمالی وزیرستان اور ان دوسرے قبائلی علاقوں میں اکوڑہ خٹک کے معروف بزرگ ولانا عبدالحق کے مذہبی اثرات نمایاں ہیں۔ اس حوالے سے مولانا سمیع الحق بھی کافی اہمیت کھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں طالبان کو شمالی اور جنوبی وزیرستان میں آنے کے لئے ض طاقتوں اور ملکی اکابرین نے جہاں مولانا فضل الرحمٰن اور سرحد حکومت سے رابطہ کیا، وہاں ہوں نے مولانا سمیع الحق کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مذہبی حوالے سے وہ اپنا مؤثر کردار ادا کر رہے ں۔

امریکہ نے پاکستان کے قبائلی علاقوں پر دباؤ میں بے حد اضافہ کر دیا۔ پاکستان نے رحدوں کے ساتھ ساتھ اپنی فوجیں تو پہلے ہی تعینات کی ہوئی تھیں۔ امریکہ کے دباؤ میں وانا کی رحد کے ساتھ ساتھ بھی پاکستان نے اپنی فوجی نقل و حرکت میں اضافہ کر دیا۔ امریکہ کا کہنا تھا کہ ں افغان سرحد پر کم و بیش 18 مقامات کے ذریعے طالبان واپس افغانستان میں داخل ہو رہے ں جو امریکی فوجیوں پر حملے کر رہے ہیں۔ امریکہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ''افغانستان میں ں سینئر امریکی فوجی کمانڈر نے کہا کہ القاعدہ اور طالبان کے فائٹرز پاکستان میں داخل ہو جاتے

ہیں۔ان فوجی افسروں نے طالبان کے رہنماؤں اور حملہ آوروں کی گرفتاری میں سُستی پر بھی مایوسی کا اظہار کیا اور کہا کہ پاکستان اپنی مغربی سرحد کے تحفظ کے لئے مناسب اقدام نہیں کرتا۔سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینٹ، افغانستان کے لئے امریکی نمائندے خلیل زاد، سینیٹر لوگار، سینیٹر بائیڈن اور سینیٹر میکن بھی اس ضمن میں اپنی تشویش کا اظہار کر چکے ہیں۔صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی کامیابی کے بعد شریعت بل کے نفاذ کا معاملہ سامنے آیا، جس کے ذریعے طالبان کی طرز پر سخت شرعی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا۔ایک امریکی سینیٹر نے بتایا کہ صوبہ سرحد میں امریکہ کے خلاف شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔45 فیصد افراد نے اسامہ بن لادن پر کسی نہ کسی طرح کے اعتماد کا اظہار کیا۔انہوں نے وہ نعرے بھی بتائے جو امریکہ کے خلاف لگائے گئے۔"

(سینٹ کی خارجہ کمیٹی رپورٹ 2003ء صفحہ 14، 15، 16)

امریکہ کی اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ "شاہ کوٹ نامی افغان علاقے کے مغربی حصے میں آپریشن کے بعد پانچ ہزار کے قریب افغان طالبان وانا اور دوسرے علاقوں میں داخل ہو گئے۔ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ القاعدہ فائٹرز کو نکالنے میں بعض پاکستانی ملازمین نے بھی مدد دی تھی" امریکہ کی ایک رپورٹ کے مطابق "امریکہ نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں سڑکوں کا نظام بہتر بنانے کے لئے 2 کروڑ ڈالر (تقریباً ایک ارب 15 کروڑ روپے) بھی مہیا کئے تاکہ یہاں پٹرولنگ آسان ہو سکے، جبکہ اہم آلات بھی مہیا کر دیئے گئے۔پہلے مرحلے میں پانچ استعمال شدہ ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹر، 750 لانگ رینج اور شارٹ رینج خصوصی ریڈیو سیٹ، 434 ٹرک اور ٹریکٹرز مہیا کئے گئے۔سرحد پار کرنے والے افراد کا پتہ چلانے کے لئے مواصلات اور جاسوسی کے 8 ہزار کے قریب دیگر آلات بھی دیئے گئے، اس کے علاوہ کمپیوٹر سافٹ ویئر بھی دیا جا رہا ہے جو کراچی، لاہور، کوئٹہ، پشاور اور بعض دوسرے شہروں سے اُڑنے والی پروازوں کا ڈیٹا محفوظ رکھے گا۔یہ جدید ترین ریکارڈ اسی طرز پر رکھا جائے گا جس طرز پر ایف بی آئی امریکہ میں مرتب کر رہی ہے۔ایف بی آئی نے دہشت گردوں کے نیٹ ورک کا پتہ چلانے اور طالبان کا ریکارڈ مرتب کرنے کے لئے سابق افسروں کو بھی تربیت دی ہے، جسے Spider Group کا نام دیا گیا ہے۔امریکہ نے پاکستان میں سفارت خانوں کے تحفظ کے لئے بھی ایک خصوصی گروپ قائم کیا ہے، جس کے 650 ارکان کو تربیت بھی امریکی ماہرین کی نگرانی میں دی گئی ہے۔"

ایک اور امریکی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ستمبر 2001ء کے بعد سے 2003ء کے وسط

تک تقریباً 442 گرفتاریاں کی گئیں، جن میں سے 50 افراد کو رہا کر دیا گیا، 346 کے خلاف مقدمات قائم کئے گئے جبکہ دو درجن کے قریب افراد کو دوسرے ممالک میں منتقل کر دیا گیا۔اس امریکی رپورٹ کے مطابق امریکہ نے پاکستان کے تین ہوائی اڈوں پر ریڈار کا جدید ترین سسٹم نصب کیا، جس کے ذریعے پورے پاکستان کی فضا کی مانیٹرنگ کی جا سکتی تھی، جب بھارتی وزیراعظم فوجیں پاکستان کی سرحد پر لے آئے تو امریکہ نے بھارتی وزیراعظم کو کسی بھی مہم جوئی سے روک دیا تھا، کیونکہ اس سے امریکی حکمتِ عملی متاثر ہوتی تھی۔اب اگرچہ امریکہ نے یہ سسٹم واپس لے لیا ہے اور اڈے خالی کر دیئے ہیں لیکن پاک افغان سرحد پر متعدد چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں۔پٹرولنگ کے نتیجے میں چمن، لنڈی کوتل اور درہ خیبر کے راستے افغانستان میں آمد و رفت تقریباً بہتر ہو گئی ہے، تاہم وانا کے پہاڑی راستے اب بھی کھلے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب امریکہ کا دباؤ اس بات پر ہے کہ قبائلی علاقے غیر ملکیوں کو پناہ نہ دیں۔امریکی رپورٹ کے مطابق ساڑھے تین ہزار سے پانچ ہزار کے قریب فائٹرز مزید موجود ہیں، جنہیں ان کی سرگرمیوں سے روکنا ضروری ہے۔

(ایضاً صفحہ 32 تا 34)

ایم ایم اے کے ساتھ حکومت کے مذاکرات میں وانا آپریشن بھی زیر بحث آیا تھا، وزیراعلیٰ سرحد اکرم درانی نے صدر مملکت جنرل پرویز مشرف سے کہا تھا کہ قبائلی آپس میں بھائی بھائی ہیں، ہ کسی دہشت گردی میں ملوث نہیں ہیں نہ ہی وہ کسی غلط آدمی کو پناہ دینا چاہتے ہیں۔اگر کوئی ایسا ہے بھی تو وہ اسے حکومت پاکستان کے حوالے کر سکتے ہیں۔یہ ان کی اپنی حکومت ہے مگر وہ نہیں پاہتے کہ حکومت پاکستان انہیں کسی دوسرے ملک کے حوالے کرے۔وزیراعلیٰ درانی نے بتایا کہ ن دنوں یہ خبریں آ رہی ہیں کہ شاید انہیں امریکہ کے حوالے کیا جا رہا ہے۔صدر مملکت جنرل پرویز شرف نے کہا کسی شخص کو کسی دوسرے ملک کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔اس یقین دہانی کے بعد پریشن کی شدت میں بھی کمی آئی ہے اور قبائلیوں نے بعض مطلوبہ افراد حکومتِ پاکستان کے والے کر دیئے ہیں، چنانچہ یہ کام قبائلی عمائدین کی مدد سے پرامن طریقے سے ہو رہا ہے۔وزیر لی سرحد نے صدر مملکت سے کہا تھا کہ اگر قبائلیوں سے بات چیت کی جائے تو آپریشن کی رورت ہی نہیں پڑے گی۔حکومت پاکستان اپنے وعدے پر پوری اتری ہے، اس نے کوئی شہری ریکہ کے حوالے نہیں کیا ہے، ان سب سے تفتیش پاکستان میں ہی کی جا رہی ہے۔یہ الگ بات

ہے کہ ایک امریکی رپورٹ کے مطابق اس تفتیش میں ایف بی آئی کے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔
امریکی رپورٹ کے مطابق ایف بی آئی والے پاکستان سے جانے والی ای میلز اور انٹرنیٹ کو بھی مانیٹر کر رہے ہیں اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات پاکستان سے شیئر کر رہے ہیں۔
گرفتاریاں جدید مواصلاتی جاسوسی نظام اور ای میلز کی مانیٹرنگ کے ذریعے بھی ہو رہی ہیں۔ صدر مشرف کے دورہ امریکہ سے قبل پینٹاگان نے امریکی کانگریس کو بتایا تھا کہ پاکستان کے ساتھ تقریباً 30 کروڑ ڈالر کے دو تین اہم معاہدے زیر التوا ہیں۔ تاہم رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کانگریس نے کہا ہے کہ یہ فوجی ساز و سامان مغربی سرحد کے دفاع کے لئے استعمال ہوگا۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ امریکہ لائن آف کنٹرول کو بھی محفوظ بنانا چاہتا ہے۔
(ایشین کرائسس سیل رپورٹ صفحہ 7،8)

دہشت گرد ایجنسیوں کی مداخلت

افغانستان پر امریکی جارحیت کے بعد طالبان حکومت ختم ہوئی تو امریکہ اور اس کی حلیف فوج نے القاعدہ اور طالبان کی باقیات کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ تلاش کا یہ سلسلہ افغانستان سے شروع ہو کر دنیا کے کونے کونے تک پھیل گیا لیکن اس کا مرکز افغانستان سے متصلہ پاکستانی قبائلی علاقہ جات بنے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف سمیت بیشتر حکومتی عہدیدار تسلسل سے یہ بات کرتے چلے آ رہے تھے کہ قبائلی علاقہ جات میں غیر ملکی جنگجو جن کا تعلق القاعدہ اور طالبان سے ہے جو موجود ہیں۔ اس موجودگی کے باوجود کبھی بھی قبائلی علاقہ جات سے کوئی القاعدہ یا طالبان کا اہم لیڈر گرفتار نہیں ہوا بلکہ خالد شیخ ابوفراج اور دیگر اہم افراد بڑے شہروں سے گرفتار ہوئے۔ ان حالات میں قبائلی علاقہ جات سے عدم گرفتاریوں کی جو صورتحال چل رہی ہے اُس پر افغانستان کے حکومتی اہلکار کچھ زیادہ مطمئن نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ اس صورتحال پر سیخ پا ہیں کہ قبائلی علاقہ جات میں موجود القاعدہ کے رہنماؤں کو پاکستان کیوں گرفتار نہیں کر رہا۔ اس مسئلے پر افغانستان کی طرف سے گاہے بگاہے انٹیلی جنس رپورٹس بھی بھجوائی جاتی رہی ہیں جن کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا کیونکہ یہ رپورٹس غلط معلومات اور محض امریکہ کے سامنے اپنے نمبر بڑھانے کے لئے بھیجی جاتی تھیں۔
اس صورتحال پر افغان حکومت کا ردعمل بدستور یہ تھا اور ہے کہ پاکستان غیر ملکی جنگجوؤں کو

ڈھیل دے رہا ہے، تاہم پاکستانی حکام کے مطابق افغانستان سے جب بھی معلومات ملیں تو وہ پرانی تھیں، جس کی وجہ سے اس کے ثمرات حاصل نہیں ہو سکے۔ اس ضمن میں پاکستان نے ایک بار تو افغان حکومت کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر پاکستان، افغانستان اور ایف بی آئی کی مشترکہ ٹیم تشکیل دی اور ہر ''مقام'' پر جس کی اطلاع تھی اس کو چیک کیا گیا تو نتیجہ صفر نکلا۔

(ڈان.....یکم جولائی 2007ء)

القاعدہ کے اہم لیڈروں کی بابت اس غلط اطلاع کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکیوں کو کچھ عرصہ کیلئے ''قرار'' آ گیا اور انہوں نے افغان حکومت کی فراہم کردہ اطلاعات پر کچھ زیادہ کان نہیں دھرے۔ دوسری طرف پاکستان کی طرف سے یہ معلومات دی جاتی رہیں کہ القاعدہ اور طالبان کے سرکردہ لوگ افغانستان میں موجود ہیں، ان اطلاعات پر جب امریکی ادر نیٹو فوج نے کارروائیاں شروع کیں تو اب افغان حکومت کیلئے مشکلات کھڑی ہو گئیں، کیونکہ امریکی اور نیٹو فوج تو علاقے میں کارروائی کرنے کیلئے بالکل آزاد ہے، ان دنوں شادی کی ایک تقریب کو لہو رنگ کر دیا گیا۔ یہ قتل عام محض القاعدہ کے شبہے میں کیا گیا اور بعدازاں معصوم لوگوں کو قتل کرنے والی نیٹو فوج نے Sorry کہہ کر اپنی ''اخلاقی برتری'' کا مظاہرہ کر دیا۔ اس طرح کی کارروائیاں معمول بن چکی ہیں جن کی وجہ سے حامد کرزئی انتہائی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ وہ تو اب کھلے بندوں امریکہ اور نیٹو فوج سے کہہ رہے ہیں کہ بمباری کی واراتیں بند کر دیں، لیکن امریکی فوج کے کندھوں پر بیٹھ کر تخت کابل کے حکمران کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی بات منوا سکے۔

حامد کرزئی کی اس بے بسی میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب طالبان نے یکے بعد دیگرے قندھار میں دو اضلاع پر کچھ دنوں کیلئے قبضہ کیا اور پھر یہ علاقے خالی بھی کر دیئے۔ ان اضلاع پر قبضے کا مقصد یہ تھا کہ طالبان نے دنیا کو باور کرا دیا کہ وہ کوئی سراب نہ تھے بلکہ ایک ایسی زندہ تحریک ہیں جو افغانستان کے منظرنامے میں موجود ہیں، جبکہ طالبان اپنے قبضہ کردہ اضلاع اس بنا پر خالی کر دیتے ہیں کہ اس پر وہ زیادہ دیر تک اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے لیکن امریکہ اور نیٹو فوج کے اتنے لاؤلشکر کی موجودگی میں بھی طالبان نے یہ فتوحات حاصل کی ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ طالبان کے پاس عسکری قوت موجود ہے اور اتنی تعداد میں موجود ہے کہ وہ سپر پاور اور اس کے اُن اتحادیوں کو للکار سکتے ہیں جو جدید ترین عسکری سہولیات سے لیس ہیں۔ طالبان کی ان حالیہ فتوحات سے ایک بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ افغانستان بھی امریکہ کیلئے اگر ویت نام نہیں تو کم

از کم دوسرا عراق بن رہا ہے، جہاں امریکہ جنگ ہار رہا ہے۔ عراق میں امریکی مظالم اور قتل عام کی خبریں تو منظر عام پر بھی آ جاتی ہیں جبکہ افغانستان کو امریکہ اور نیٹو کی فوج نے افغانیوں کیلئے قبرستان بنا ڈالا ہے۔ جبکہ دوسری طرف حامد کرزئی اب اتحادی افواج کی بلا اشتعال بمباری کو روکنے کے مطالبات کر کے تھک چکے ہیں۔

افغانستان میں ان حالات کا ذمہ دار امریکہ ہے جو صرف کابل تک حکومتی عملداری رکھے ہوئے ہے، کابل کے باہر جنگل کا قانون رائج ہے، ہر جگہ جنگی سردار موجود ہیں جن کی اپنی افواج اور اپنی حکومتیں ہیں۔ ان لوگوں کو صرف اور صرف اپنی لوٹ مار سے غرض ہے لیکن اگر ان کے لوگ قتل ہوئے تو یہ لوگ اپنی لوٹ مار ترک کر کے امریکیوں اور اتحادیوں کے درپے ہو جائیں گے، جن میں سے بعض یہ راستہ اختیار کر چکے ہیں اور امریکہ و نیٹو فوج افغانستان میں جس قدر زیادہ افغانوں کا قتل عام کرے گی اُس کیلئے حالات اسی قدر خراب ہو جائیں گے۔ اس وقت بھی نیٹو فوج پر دباؤ بڑھ گیا ہے کہ وہ جو بھی ایکشن کریں تو اس کی قیادت افغان فوج سے کروائی جائے تا کہ افغانوں کا قتل عام روکا جا سکے۔ اس مطالبے کو امریکہ اور اس کے اتحادی ماننے کو تیار نہیں، بہرحال دوسری طرف یہ بات بھی تسلسل کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہے کہ نیٹو فوج بمباری کا سلسلہ بند کر دے اور یہ بات اب صرف حکمران ہی نہیں کر رہے بلکہ غیر ملکی این جی اوز جو کابل یا افغانستان کے دوسرے علاقوں میں کام کر رہی ہیں اُنہوں نے بھی کہنا شروع کر دیا ہے۔ افغان ذرائع یہ پیش بینی کر رہے ہیں کہ غیر ملکی فوج کی بمباری جو اس وقت افغانستان میں بہت زیادہ ہو رہی ہے، کی زد میں اگر جنگی سردار آ گئے تو حالات بہت زیادہ خراب ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں افغانستان بدترین خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا جس کی ذمہ داری امریکہ پر ہو گی۔ افغان ذرائع کا کہنا ہے کہ ایسی صورتحال میں امریکہ یہاں سے بھاگ بھی سکتا ہے۔ افغان ذرائع کے اِس دعوے میں شاید کہیں مبالغہ بھی شامل ہو کیونکہ امریکہ افغانستان میں تیزی سے اپنی عسکری تنصیبات مستحکم کر رہا ہے، لمبے عرصے کیلئے فوجی اڈے لیز پر حاصل کر لئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ یہاں اپنا قیام طویل تر کرنا چاہ رہا ہے لیکن افغان حکومت کیلئے امریکہ کا یہ طویل قیام کچھ زیادہ خوش آئند نہیں۔ اِن حالات میں اس نے افغانستان کے اندر امریکی کارروائیوں کو کم سے کم رکھنے کیلئے اسے پاکستان میں ٹارگٹ دینا شروع کر دیئے ہیں۔

امریکہ کو پاکستان کی طرف لگانے کیلئے افغان حکومت نے جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں ان

میں اسے کوئی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ امریکہ کی توجہ حاصل کرنے کیلئے القاعدہ اور طالبان کے بارے میں اطلاعات دینا اس وقت سب سے آسان راستہ ہے جسے افغان حکومت نے اپنا رکھا ہے۔ اس عمل میں انہیں بعض مقامات پر سبکی بھی اٹھانی پڑی لیکن حال ہی میں افغان حکومت نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ امریکی پھر سے افغان انٹیلی جنس کو اہمیت دینے لگے ہیں۔ افغان ذرائع کے مطابق یہ ان ہی کا مشورہ تھا کہ امریکہ پاکستان سے اس کے علاقے میں براہ راست ایکشن کرنے کی ''اجازت'' لے لے۔ یاد رہے کہ ماضی میں امریکہ نے کبھی بھی ایسی اجازت نہیں لی بلکہ ایکشن کر کے اطلاع دی گئی۔ تاہم حالیہ دنوں میں ایک ہی وقت میں تین امریکی اہلکار اسلام باد میں جس طرح ''خوف و ہراس'' پھیلاتے رہے اس کا نتیجہ سامنے آ گیا ہے۔ ان اہلکاروں نے بظاہر ایکشن کے عمل کو دیکھنے کا ڈرامہ رچایا لیکن واقفانِ حال کے مطابق دورے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ قبائلی علاقہ جات میں پاکستان امریکہ کی خواہش کے مطابق خاطر خواہ نتائج نہیں دے سکا لہٰذا آئندہ امریکی یا نیٹو فوج براہ راست پاکستانی حدود میں کارروائی کرے گی۔ ذرائع کے مطابق رچرڈ باؤچر سمیت ان تینوں امریکی اہلکاروں کی بیک وقت اسلام آباد آمد تو ایک اتفاق ہو سکتی ہے لیکن ان کا مطالبہ یکساں تھا کہ ''اگر حمایت درکار ہے تو امریکیوں کی کارروائی کا حق تسلیم کرلو''۔

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور 10 جون 2007ء)

امریکیوں کو یہ حق ملا کہ نہیں؟ بہرحال انہوں نے اسے شمالی وزیرستان میں استعمال ضرور کر لیا، جہاں امریکی طیاروں نے پہلے سرحدی علاقے دتہ خیل کے گاؤں مامی روگا پر انتہائی نیچی پروازیں کیں۔ مقامی ذرائع کے مطابق چونکہ مامی روگا شمالی وزیرستان سے دور ہے، اس وجہ سے انہوں نے امریکی طیاروں کو محض چکر لگاتے ہوئے دیکھا، تاہم مقامی طالبان کمانڈر محمد عمر نے ذرائع ابلاغ کو جو تفصیل بتائی ہے اُس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ امریکی فوج نے کارروائی سے قبل اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر طیاروں کے جانے کے بعد افغانستان سے تین راکٹ داغے گئے تو وہاں موجود 34 افراد لقمہ اجل بن گئے۔ محمد عمر کے مطابق مرنے والے دہشت گرد نہ تھے بلکہ مامی روگا جو ایک پُرفضا مقام ہے میں عارضی طور پر تفریح طبع کیلئے گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ علاقے میں کسی بھی قسم کا کوئی مدرسہ نہ تھا بلکہ مرنے والے مامی روگا میں چھپروں کے نیچے مقیم تھے۔ یہ لوگ وہاں کسی بھی دہشت گردی میں ملوث نہ تھے، بہرحال دن دیہاڑے

ساڑھے دس بجے نیٹو افواج نے حملہ کیا اور اپنی بہادری کی ایک اور داستان رقم کر دی، جس پر ذرائع ابلاغ میں یہ خبر چلائی گئی کہ دتہ خیل کے مدرسے میں شرپسند بم کی تیاری میں مصروف تھے کہ بم پھٹ گیا، جس سے اموات واقع ہوئیں۔ یہ خبر بڑی مضحکہ خیز اس بنا پر تھی کہ بم بنانے والے اتنے غیر تربیت یافتہ بھی نہیں ہوتے کہ وہ بھری محفل میں بیٹھ کر بم بنائیں گے۔ اگر ایسا کرنا مقصود ہو تو منطق کا تقاضا یہ ہوگا کہ یہ خطرناک ہتھیار علیحدہ بیٹھ کر بنایا جائے۔ بہرحال اس خبر کو 24 گھنٹوں کے اندر اندر گورنر فاٹا سیکرٹریٹ کی پریس ریلیز نے غلط ثابت کر دیا جس میں کہا گیا تھا کہ مامی روگا میں کوئی مدرسہ نہ تھا اور ان پر حملہ سرحد پار سے ہوا۔ اس تین سطری پریس ریلیز نے سابقہ خبر کو تو جھوٹا ثابت کر دیا لیکن اس میں بھی ایک جھوٹ پنہاں تھا، وہ جھوٹ یہ تھا کہ واقعے میں کوئی بھی شمالی وزیرستان کا باشندہ ہلاک نہیں ہوا۔

(ندائے ملت.....28 جون 2007ء)

مامی روگا میں 34 افراد میں سے کتنے مرنے والے شمالی وزیرستان کے تھے، اس بارے میں صحیح اعداد و شمار وصول نہیں ہو سکے۔ البتہ ایک زخمی سمیت آٹھ زندہ بچ جانے والے شمالی وزیرستان کے مقامی لوگ تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قبائلی علاقوں میں ایک بار امریکہ صدر کرزئی کے کہنے پر براہِ راست ایکشن لینا شروع کر چکا جبکہ ان حملوں کی ذمہ داری کسی نہ کسی کو تو جواباً اٹھانی پڑتی۔ خواہ اس کی قیمت کسی امن معاہدے کی صورت میں ہی کیوں نہ چکانی پڑے اور ہماری حکومتیں یہ قیمت چکا رہی ہیں، ڈرون حملے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

ڈرون حملے

اس حقیقت سے دنیا کا کوئی باشعور شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ''فاٹا'' کی بگڑتی صورتحال کو بدترین حالت تک پہنچانے میں بنیادی کردار امریکہ کے ڈرون جہازوں نے ادا کیا۔ اب تو اس حقیقت سے ساری دنیا خصوصاً امریکی دانشور بھی بخوبی آگاہ ہیں اور اپنی حکومت کو سمجھاتے بھی ہیں ان میں رونالڈ پال بھی شامل ہیں۔ رونالڈ ارنسٹ پال 20 اگست 1935ء کو امریکی ریاست پنسلوانیا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم Dormont High School سے حاصل کی۔ 1957ء میں بیالوجی میں پی ایس گیٹیز برگ کالج سے اور ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری ڈیوک یونیورسٹی سکول آف میڈیسن سے حاصل کی۔ 1960ء میں امریکی ایئرفورس میں فلائٹ سرجن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1965ء سے 1968ء یونائیٹڈ اسٹیٹ ایئرفورس میں فلائٹ سرجن کی حیثیت سے ملٹری سروس کی۔ سروس کے بعد ری پبلکن پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ انہی کی پارٹی کے دور حکومت میں افغانوں کا قتل عام ہوا، عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، پاکستان میں ڈرون حملوں کا آغاز ہوا، بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا۔ اب یہ اپوزیشن پارٹی ریپبلکن کی طرف سے امریکی کانگریس کے ممبر ہیں۔

7 مئی 2009ء کو انہوں نے امریکی کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''امریکی انتظامیہ کو خودمختار پاکستان پر ڈرون حملوں کا حق کس نے دیا ہے؟ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو

وسعت دینے سے امریکہ کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ دنیا بھر میں امریکہ کے خلاف نفرت میں اضافہ ہورہا ہے لہٰذا خارجہ پالیسی تبدیل کی جائے۔ صدر اوباما کے برسراقتدار آنے کے بعد امریکہ کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کی توقع تھی لیکن بدقسمتی سے یہ پوری نہیں ہوئی، ہم نے افغانستان میں سوویت یونین والا طرز عمل اختیار کیا ہوا ہے۔'' انہوں نے رچرڈ ہالبروک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''افغانستان کو ایک جدید جمہوری ملک بنانے کا ہدف صرف خوابوں میں ہی پورا ہوسکتا ہے کیونکہ ہم اپنی مخالفت کرنے والے ہر شخص کو طالبان قرار دے دیتے ہیں۔ امریکی لڑاکا طیاروں کی بمباری سے فوجی کارروائی میں سینکڑوں بے گناہ عوام کی ہلاکت کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ ہماری پالیسیوں پر کیوں اعتراض کرتے ہیں؟''

یہ گھر کی سچی گواہی ہے جو رونالڈ پال نے دی کہ امریکی انتظامیہ کو یہ حق کس نے دیا وہ خودمختار ممالک پر شب خون مارتا رہے؟ انہوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ہر غیر جانبدار شخص کی آواز ہے۔

امریکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک 64 سالوں میں 23 آزاد ملکوں پر جارحیت کا ارتکاب کرچکا ہے۔ تاریخ میں دیکھا جاسکتا ہے کہ امریکہ کے ذمہ اب تک 171.7 ملین افراد کا قتل بلاشک وشبہ ثابت ہے۔ ریڈ انڈینز 100 ملین، افریقی 60 ملین، ویت نامی 10 ملین، عراقی 1.2 ملین، افغان نصف ملین، کل فرد جرم 171.7 ملین ہے۔ اب آپ ہی بتایئے 171 ملین سے زیادہ کی رگ جان سے خوف پینے والے امریکہ کو ''انسانیت کا قاتل'' کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ جبکہ تاحال اس کی خون آشامی نہ صرف جاری بلکہ عروج پر ہے۔

2001ء میں نائن الیون کا ڈرامہ رچا کر افغانستان پر آتش وآہن کی بارش برسائی گئی۔ 2003ء میں اقوام متحدہ سے منظوری نہ ملنے کے باوجود عراق کو کھنڈر بنادیا گیا۔ روس مسلسل دس سالوں سے چیچنیا کی آزادی کو پامال کررہا ہے، کشمیر 6 دہائیوں سے سلگ رہا ہے لیکن مشرقی تیمور کو دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک انڈونیشیا سے الگ کرکے عیسائی ریاست بننے میں کوئی دیر نہ لگی۔ سوال یہ ہے کہ اگر اقوام متحدہ ایک آزاد ادارہ ہے، یہ کسی کے گھر کی لونڈی نہیں ہے تو پھر یہ امریکہ کو نکیل کیوں نہیں ڈالتا کہ وہ خودمختار اور آزاد ممالک پر حملے کرکے ان کی آزادی کو سلب نہ کرے؟ وہ کیوں اپنے منشور کی خلاف ورزی کرنے والے بڑے ممالک کے خلاف کارروائی نہیں کرتا؟ اس نے کیوں دوہرا معیار اختیار کیا ہوا ہے؟ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے انصاف

کے پیمانے الگ الگ کیوں ہیں؟ انہی ناانصافی پر مبنی پالیسیوں کی وجہ سے دنیا تباہی کے دھانے پر کھڑی ہے۔

امریکی جوائنٹ چیف آف سٹاف کے چیئرمین ایڈمرل مائیکل مولن نے کہا ہے کہ چین اپنی بحری اور فضائی قوت میں اضافہ کر رہا ہے جس کا فوکس امریکہ پر لگتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکہ پر نائن الیون جیسے حملوں کی تیاری ہو رہی ہے۔ چنانچہ صدر زرداری کے دورہ امریکہ کے بعد بڑے پیمانے پر کارروائی کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کے بعد شاید چین کی باری آئے گی۔ ہماری چھٹی حس بتا رہی ہے اصل مسئلہ چین ہی ہے۔ قبائلی علاقوں میں طالبان کے ذریعے ڈبل گیم کھیل کر شاہراہ ریشم بند کروانا مقصد ہے۔ شمالی علاقہ جات میں شورش کو ہوا دے کر یہاں علیحدگی کی تحریک چلوائی جائے گی تا کہ اس میں قدرے کامیابی کے بعد چین کو سبق سکھانے کی راہ ہموار ہو سکے۔

اگر اس جنگ کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ الائی اور بشام کے علاقوں تک تو پہنچ چکی ہے۔ سیاچن کی لائن میں بھی گڑبڑ کے اشارے مل رہے ہیں۔ امریکہ وسطی ایشیائی ریاستوں اور ایران سے مذاکرات کا ڈھونگ بھی اسی لئے رچا رہا ہے۔ امریکی حکام اس خطے میں بھارت کی بالادستی کا عندیہ پہلے ہی دے چکے ہیں۔ حالات و واقعات چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ امریکہ اس خطے میں کوئی بڑا گیم کھیلنے والا ہے۔ اس خطے کے مظلوم لوگوں کے ساتھ ایک بار پھر ہاتھ ہونے والا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ شاید امریکہ یہ سب کچھ آخری مرتبہ کر رہا ہے اس کے بعد یہ مہلت ہی ختم نہ ہو جائے۔